بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

حیاتِ رشید

یعنی

ایک نیک نہاد سعادتمند ہونہار نوجوان
مولوی عبدالرشید چشتی بی اے مرحوم کی
زندگی کے حالات اور انکی اُردو تحریرات

مؤلفہ

جناب میرزا اعجاز حسین صاحب بی اے دہلوی
(وکیل چیف کورٹ پنجاب)

[illegible]

۱۹۰۹ء



ABDUR RASHID CHISHTI, B A

تقریظ

ہم تان کہیں سیاہم کا نئی ہیں اُلٹے ہم کا مناؤن پڑے

یہ مینے کرامت علی خان مرحوم سے عنوانِ بالا کا پوُرب کا مقولہ سُنا تھا کرامت علی - **نوازش علی خان** مغفور کا (جن کا اس تذکرہ میں میرے عزیز دوست میرزا اعجاز حُسین صاحب نے کہیں ذکر کیا ہے) ماموں تھے - دو بہن اور ایک بھائی تھے جن میں سے ایک بہن کے یہاں ایک بیٹا (نوازش علی) تھا۔ خدا نے وُہ بھی لے لیا۔ نوازش علی کا ناگہاں ایک دو روز کی بیماری کے بعد اتوار کے دن ۲۵ ستمبر ۱۸۹۸ء مطابق ۸ جمادی الاولے ۱۳۱۶ھ و ۱۱- اسوج - کنوار سمت ۱۹۵۵ امرت سر میں انتقال ہوگیا اور وہیں صمدو کا تالاب دروازہ سُلطان ونڈ دفن گاہِ حکمت اللہ خان تحصیلدار جنگی میں مدفون ہوئے اللہ اکبر - اُس وجیہ و سعید جوان کو مرے بارہواں برس جاتا ہے **عبدالرشید** مرحوم کو ان سے - جیسے کہ اُنہیں اپنے سب دوستوں سے - نہایت دلبستگی تھی - کئی روز تک اُس کے غم میں اُن کی آنکھیں نہ سوکھیں - مجھے یاد ہے کہ مجھے اُن کو صبر و حوصلہ دلانے کے لئے بہت جدّ و جہد کرنی پڑی - کرامت علی اپنے بھانجے کی وفات کے بعد برسوں لاہور کی گلیوں کی خاک چھانتے اور دو بیوہ و بیکس بہنوں کے گذارہ کے لئے محنت کرتے رہے - پانچواں برس ہے (فروری ۱۹۰۵ء) اُن کا بھی انتقال ہوگیا غریب

بڑا غیور اور باہمت انسان تھا۔ نوازش علی خان خان بہادر برکت علی خان مرحوم کےچچیرے بھائی محبوب علی خان کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اگر نوازش علی کو دُنیا میں کسی کی فکر تھی تو اپنی ماں کی۔ نہایت فرمانبردار اور کشادہ دلی سے خدمت گذار بیٹا تھا۔ ماں باپ کو اپنے بعد اولاد کے زندہ رہنے اور اُن کی دُعا اور یاد کی حرص اور آرزو ہوتی ہے۔ نوازش علی کی والدہ بھی شاہجہانپور کی رہنے والی اور وہیں مقیم ہیں عُنوان کا جُملہ اُنہیں معلوم ہوگا اور اُنہیں بھی اکثر اُسکا وِرد ہو گا۔

عبدالرشید کے انتقال کے بعد جب میرے شفیق عزیز میرزا اعجاز حسین لاہور آئے تو اُنہوں نے اپنے مرحوم دوست کے حالات اور تحریرات شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مینے فرزند مرحوم کے انگریزی اور اُردو تحریرات اور خطوط وغیرہ اُن کے حوالہ کئے۔ پھر اُنہوں نے مجھے مطبوعہ سرکولر لیٹر بھیجیں کہ اپنے نام سے مرحوم کے احباب کو بھیجوں کہ جو حالات اُنکی زندگی کے اُنہیں معلوم ہوں لکھیں یا اُن کے خطوط اُنکے پاس ہوں بھیجیں۔ مرحوم کے بہت سے دوستوں نے جواب میں حالات تحریر کئے جن میں سے بعض میرزا صاحب نے اس کتاب میں شائع کئے ہیں۔ جس خلوص ارادت اور محبت سے اُنہوں نے یہ کام کیا ہے اور جس دلبستگی کی یاد ہنوز اُن کے دل میں تازہ ہے ناظرین اِن اوراق سے اُسکا اندازہ کر سکتے ہیں میرزا صاحب نے کہیں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ مینے عبدالرشید مرحوم کی تحریرات کا ایک ایک پُرزہ حفاظت سے رکھا ہے۔ ناظرین کو معلوم نہیں کہ میرزا صاحب نے

بھی اپنے مرحوم دوست کے خطوط کا ایک فائل جس میں ایام طالبعلمی سے لیکر اُن کی وفات سے چند روز پہلے تک کے لکھے ہوئے پچاسی خطوط سے کم نہ تھے نہایت حفاظت سے رکھا تھا۔ اس فائل کی اطلاع مجھے فرزند مغفور کی وفات کے بعد ہوئی اور جب ہی مینے اُسے دیکھا۔ مذاق اور عادت کی بات ہے۔ رات میں رسالۂ عصمت بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۹ء دیکھ رہا تھا۔ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ جزیرۂ جنجیرہ اُس رسالہ میں اپنے سیر یورپ کا حال طبع کراتی ہیں وہ اُس میں مسٹر ڈٹ صاحب کے یہاں اپنی دعوت کا تذکرہ فرماتی ہیں حضور ممدوحہ کی تحریر میں سے ذیل کی سطریں جو غالباً خالی از دلچسپی نہ ہونگی نقل کرتا ہوں۔

"لنچ کے لئے مسٹر ڈٹ صاحب نے ہم چاروں کو بُلایا تھا۔ بہت ہی چھوٹا سا مکان ہے لیکن بہت ہی آسائش بھرا۔ لذیذ لنچ دیا جس کو سب نے شوق سے کھایا۔ لنچ کے بعد اُنھوں نے اپنی کتابیں دکھائیں۔ اپنے دوستوں کے خطوط کیسے ڈھب سے چپکائے ہیں۔ چالیس سال کا ذخیرہ اُنکے پاس موجود ہے حیرت تو مجھے یہ معلوم ہوئی کہ اُنہیں فرصت کیسے بہم پہنچتی ہے۔ کہ اپنے ضروری اور لازمی کام کاج کے بعد شوقیہ اتنا وقت اس قسم کے کام کرنے کیلئے نکال لیتے ہیں اور اُنکو جاری رکھنے کے لئے طبیعت میں کتنی چستی و چالاکی ہونی چاہیئے ورنہ ایسی چیزوں کا بناہ مشکل ہے۔ عمر دیکھو تو ساٹھ برس کی۔ اور یہ استقامت۔ ہم کو تو ہمیشہ کم فرصتی کی فریاد کرنا ہی آتا ہے۔ ذرا غیر معمولی کام ہوا اور ہم نے شکوے کرنے شروع کر دیئے۔ مگر ایسی حضرات

کے نزدیک ہر کام کے لئے وقت ہے - اِس قسم کی مختلف کتابیں جاری ہیں ایک میں اخبار سے کٹے ہوئے ٹکڑے چپکا دیئے ہیں بہت ہی کم سنی سے یہ شوق اُنہیں لاحق ہوا اور زیادہ آفرین یہ ہے کہ تمام زندگی بھر اِسے جاری رکھا کبھی زیادہ طُومار جمع ہونے نہیں دیتے - یہ سب سے بڑا بھید ہے کیسے شوقین طبع آدمی ہیں - کہیں سے خوبصورت تصویر ہاتھ آگئی تو وہ بھی اپنے ذخیرے میں چپکالی ؟

مسلمانوں میں تعلیم کی نہایت ضرورت ہے جوں جوں تعلیم اُن میں ترقی کریگی لازم ہے کہ اِس قسم کے علمی مذاق بھی ترقی کریں - اِنسان کو تو چھوٹا ہو یا بڑا - شاہ ہو یا گدا - امیر ہو یا غریب - کالا یا سفید ضرور معدوم ہونا ہے تحریر ہی باقی رہ جاسکتی ہے ۔

اِس کتاب کے شائع ہونے میں قریباً سات برس کا عرصہ گذر گیا - مگر جب موجودہ زمانہ کے مصروفیات اور ایک بڑے گھرانے والے اور قومی اُمور میں حصہ لینے والے شریف آدمی کے ذاتی اور قومی کثرت اشغال کا خیال کیا جائے تو اِس دیر سے کچھ تعجب نہیں ہوتا - کوئی نہ کوئی امر باعث توقف ہوتا رہا اِس توقف میں میرا کچھ کم حصہ نہیں ہے - میرزا صاحب نے بعض کاغذات طلب کئے یا حالات دریافت کئے اُن کے بھیجنے میں مجھ سے حد سے زیادہ تاخیر ہوتی رہی - لیکن اِس توقف سے اُنہیں وہ محبت کا کام جو اُنہوں نے محض اپنی دلی خواہش سے لیا تھا فراموش نہیں ہوا - اِس قدر مدت گذرنے کے بعد اِس کتاب کا شائع ہونا اگر کوئی امر ثابت کرتا ہے تو یہ کہ اپنے مرحوم دوست

کی یاد میرزا صاحب کے دل سے محو نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی یہ تحریر علی الخصوص فصلِ آخر گو وہ دونوں ملکر بھی کیسے مختصر ہوں)۔ اُردو کے علم ادب میں ایک اضافہ ہے فلسفیانہ تحریر ہے اور مبالغہ سے مبرا ہے میرزا صاحب کی پہلی تجویز یہ تھی۔ کہ عبدالرشید مغفور کے تمام انگریزی اور اُردو تحریرات یکجا چھاپے جائیں مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اُن کی تجویز اس کتاب کو سٹیم پریس ساڈھورہ میں چھپوانے کی تھی۔ بلکہ اُنہوں نے آٹھ صفحوں کی ۱۲ کاپیاں یعنی ۹۶ صفحات غالباً اُسی مطبع کے کاتب سے لکھائے۔ مگر چونکہ لاہور میں چھپائی کے سامان بہ کثرت ہیں وہ کاپیاں اُنہوں نے مجھے بمع دیگر تحریرات کی بھیجدیں اور مطبع رفاہ عام میں اُن کو طبع کرایا گیا ہ

ناظرین۔ نوجوان طلبہ کا جو کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے ایک چیدہ اور بینظیر مجمع تھا مجھے برسوں اُن کے حالات۔ حرکات عادات و اطوار۔ پاکیزہ چلن۔ نیک خیالی۔ سعادت۔ علم دوستی۔ سیریں۔ علمی بحثیں اور آپس میں سچی اور خالص دوستی اور محبت کے دیکھنے کی مسرت۔ عزت اور فخر حاصل رہا۔ میں اُن دنوں بھی اس مجمع کو ایک عمدہ باغ کی طرح سمجھتا تھا جس میں مختلف خوشبو اور رنگ کے پھول ہوں مگر اُن میں سے ہر ایک باعث فرحت ہو ہ

میرزا ایوب بیگ مرحوم کے اخلاق۔ تربیت۔ ادب اور غیر معمولی محبت جب یاد آتے ہیں تو دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ سوائے جبلی شرافت اور خاندانی تربیت کے ویسے عادات و سعادت ناممکن ہیں۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ مطابق ۲۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء و ۷ اجیاکھ سمت ۱۹۵۷ بروز شنبہ بمقام فاضلکا جہاں اُنکے

بڑے بھائی تعینات تھے اُنکا انتقال ہوا - دسواں برس جاتا ہے - جب تک جسم میں جان باقی ہے اُس جوانِ صالح کی یاد بھول نہیں سکتی - اُن کے والدِ بزرگوار جناب **میرزا نیاز بیگ صاحب** ضلعدار محکمۂ نہر پنشنر و رئیس کلانور سلمہُ اللہ تعالےٰ کو ضعیفی میں یہ سخت داغ نصیب ہوا مگر ہمتِ مردانہ سے راضی بہ قضا ہیں - کیا بن سکتا ہے - اُن کے برادرِ کلاں **میرزا ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب** ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن و پروفیسر میڈیکل کالج لاہور کے اخلاق اور اپنے فن میں مہارتِ کامل شہرۂ آفاق ہیں - اپنے مرحوم بھائی کے دوستوں اور اُن کے متعلقین کو اُسی آنکھ سے دیکھتے ہیں - اور اُسی شفقت اور مروّت سے پیش آتے ہیں - خدا اُنکے عمر و اقبال میں برکت دے اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے ؎

ہم نہیں بھولے تہجد خوانیاں ایّوب کی | اُسکی طبعی کا بھی سچ مچ تھا وہ شایانِ زمن
استقلال صبر و استقلال وہ زہد و ورع | تھا جوانوں کیلئے ضرب المثل اُسکا چلن

شیخ عبدالرحمٰن بی اے مرحوم - پرانی ہمسائگت تھی اور اُنکے بزرگوں اور ہمارے بزرگوں کے کئی پشت سے تعلقاتِ یگانگت و برادرانہ تھے - عبدالرشید بہشتی مرحوم اور وہ مدرسہ کی چھوٹی جماعتوں سے کالج تک مل کر پڑھتے رہے اور آپس میں دونوں کی وابستگی و اُلفت روز بروز بڑھتی گئی - شیخ مرحوم کو اعلےٰ تعلیم و ترقی کا شوق تھا - باوجود شادی ہوجانے اور اُنکے یہاں بیٹا بھی پیدا ہونے کے علیگڈھ کالج میں داخل ہوئے - وہاں کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور اُن کی طبیعت خوب منجھ گئی - نماز و روزہ کے پورے پابند تھے اور اِس لئے

کالج میں نماز کے مانیٹر رہے ۔ مسٹر بیک مرحوم اور دیگر پروفیسروں کی خوشنودی حاصل کی اور بی اے کی ڈگری لی ۔ آغاز ۱۵ مئی سنہ ۱۹۰۰ء میں وہیں سے تحصیلدار مقرر ہو کر بمقام دیوگڈھ ڈاک خانہ موکھیڑ تحصیل و ضلع چھندواڑہ ممالک متوسط ۔ کالرا کیمپ کی نگرانی پر بھیجے گئے ۔ وہاں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ اپنی ذات کی مطلق پروا نہ کی ۔ ایک دو ہفتہ کے بعد خود ہیضہ میں مبتلا ہو گئے ۔ ڈاکٹر کوئی پاس نہ تھا ۔ دن بھر بیمار رہ کر منگل کو شام کے وقت ۲۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۱۹ ہجری مطابق ۲۹ مئی سنہ ۱۹۰۰ء و ۱۵ جیٹھ سمت ۱۹۵۷ غربت میں ۔ عزیزوں اور دوستوں سے ہزاروں کوس دور ۔ ملک عدم کو سدھارے ۔ اور دوسرے روز ۳۰ مئی کو وہیں متصل عیدگاہ درخت بڑ کے نیچے مدفون ہوئے ۔

یاد ہے وہ شیخ صادق بندۂ رحمٰن پاک ۔ جس کے قرآن کی صدا سے ہوتا تھا کوہ و بن
کی یہ ہمت خدمت خلق خدا میں جان دی ۔ گو نکما ہے تیرا اوصاف حمیدہ سے وطن

شیخ خدا بخش صاحب مرحوم ڈسٹرکٹ جج پنشنر اور **شیخ اصغر علی** صاحب سلمہ بی اے سی ایس ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ ۔ مرحوم کے ماموں زاد بھائی ہیں ۔ مرحوم نے برخوردار عبدالرشید اپنی یادگار چھوڑا ہے ۔ شنبہ کے دن صبح کے پانچ بجے ۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۹۷ء و ۱۸ اسوج سمت ۱۹۵۴ پیدا ہوا ۔ خدا کے فضل سے اسے تیرہواں سال شروع ہے دعا ہے کہ خدا اسے نیک کرے اور عمر دراز نصیب ہو ۔ بدقسمت ماں اور سخت غم زدہ دادی کا سہارا ہے ۔ شیخ عبدالرحمٰن مرحوم کی والدہ نے سوائے

اُنکے اور جوان بیٹوں کا بھی رنج دیکھا ہے - شیخ عبدالرحمٰن - عبدالرشید چشتی سے عمر میں ایک سال بڑے تھے ؀

مسٹر شنکر ناتھ ایم اے بیرسٹرایٹ لا مرحوم - عبدالرشید مرحوم سے اُنکے عادات و اطوار بہت ملتے جلتے تھے - اعلےٰ دیانت سچّی دوستی اور حُب الوطنی میں خاص امتیاز رکھتے تھے - ایسے فاضل اور بے نظیر انسان کی حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے - میرے فرزندِ مرحوم سے اُنھیں دلی اُنس تھا اور اُن کی وفات کے بعد اُنہیں اُن کے عزیزوں پر نہائیت شفقت و رحم رہا - منگل کے دن ۲۰ - اگست ۱۹۰۷ء مطابق ۵ بھادوں سمت ۱۹۶۴ - ۱۰ رجب المرجب ۱۳۲۵ ہجری مگھیانہ جھنگ اپنے وطن میں دُنیا سے سدھارے - ہندوستان کی مائیں ایسے بچّے ہر روز نہیں جنتیں ؀

وہی جیتے ہیں ای نادان ریں مرتے جو پہلے — انانیت حیاتِ جاودانی کیلئے سم ہے
بقائے فرد ناممکن - بقائے نوع حاصل کر — تسلی کو دلِ بیتاب کی یہ نکتہ کیا کم ہے
جئے جو دوسروں کیواسطے مرتا نہیں ہرگز — مرا کب حاتمِ طائی کہ زندہ نامِ حاتم ہے
جو عظمت چاہتا ہے خدمتِ انسان وطیرہ کر — کہ ہے جو قوم کا خادم وہ فخرِ نسلِ آدم ہے
یہ شیوہ زندگی کا کوئی شنکر ناتھ سے سیکھے — رشید لئے وطن دیوانہ ویسا یارِ ہمدم ہے
نڈر تھا - مہانی تھا صاف دل تھا - پاک طینت تھا — جوان مرگی پہ اُسکی اہلِ دل مشغولِ ماتم ہے
گئی دل سے نہ حسرت ہند کو گلشن بنانے کی — بدن گو سوکھ کر کانٹا ہوا آنکھوں میں گو دم ہے
یہ دارِ کشمکش ہے فرحت و راحت کہاں اس میں — یقین ہے بعد مُردن رُوح اُسکی شاد و خرّم ہے

مرحوم نے دو بیٹے برخوردار منہا لچند اور ایک اور چھوٹا اور شاید ایک بیٹی

یادگار چھوڑے ہیں۔ خدا انہیں آفاتِ زمانہ سے اپنی حفاظت میں رکھے اور نیک باپ کی بھلی اولاد ہوں۔

سید غلام بھیک بی اے بیرسٹر وکیل انبالہ۔ خدا نے انہیں نہایت عالی طبیعت۔ دماغ و اخلاق عطا کئے ہیں۔ عبد الرشید مرحوم سے جو شفقت اور وابستگی انہیں تھی اُن کے مرثیہ سے ظاہر ہے۔ فرزند مرحوم بھی ان کے شیدا تھے۔ میر صاحب کا خلوص قومی خدمت۔ علم دوستی اور قانونی لیاقت کچھ پوشیدہ نہیں۔ ایامِ طالبعلمی سے طبیعت موزون اور دقیقہ رس ہے۔ ہم سب اُن کی عنایات کے ممنون ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ صراطِ مستقیم پر رکھے۔ عترتِ رسولِ مقبول صلعم میں سے ہیں اور اُن کی ذمہ واری بہت بڑی ہے اُنکا چلن اُنکے نانا کی اُمت کیلئے قابلِ مثال ہونا چاہیئے۔

حافظ عبد العزیز ایم اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و پرسنل اسسٹنٹ ریوینیو کمشنر فرانٹیئر پراونس۔ عبد الرشید مرحوم کے دلی دوستوں میں سے ہیں۔ انکی فضیلتِ علمی اور پاکیزہ چلنی پر سب مسلمانوں کو بجا فخر و ناز ہے۔ آئین خانہ تمام آفتاب است۔ ہمارے صدمہ میں اُن کی اور اُن کے بزرگ بھائیوں۔ اُن کی والدہ محترمہ مرحومہ اور والد بزرگوار کی دلی ہمدردی اور عنایت ہم سب کو فراموش نہیں ہوسکتی۔ گورنمنٹ نے اُن کی ملازمت کا سود بہت ارزان کیا ہے۔ خدا اُن کے اقبال میں روز افزوں ترقی کرے۔ آئین دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

لالہ امرناتھ چوپڑہ ایم اے پلیڈر لاہور۔ الہ بینئارام صاحب

سپرنٹنڈنٹ سول سیکریٹریٹ پریس کے صاحبزادے ہیں۔ سچے دوست و بہمہ صفت موصوف۔ عبدالرشید مرحوم اور انہیں آپس میں نہایت اُنس تھا۔ اُن کے باعث انہیں ہمارے حال پر بھی ہمیشہ عنایت ہے ؛

مولوی نجم الدین بی اے ہیڈ ماسٹر سینڈیمن ہائی سکول کوئٹہ۔

فضیلت کے علاوہ شعائرِ اسلامی کے پورے پابند ہیں۔ ایام طفولیت سے عبدالرشید مرحوم کے ساتھ کھیلے اور پڑھے۔ انہوں نے اپنے مرحوم دوست کی کہانی محبت سے لکھی اور تفصیل سے بیان کی ہے۔ خدا نے حافظہ نہایت مضبوط عطا کیا ہے۔ اُن کے بڑے بھائی منشی فرزند الدین مرحوم جو نہایت صالح تھے جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ انہوں نے دو بیٹے برخورداران عبدالعزیز (تاریخ ولادت۔ شام شنبہ ۲ صفر ۱۳۱۱ھ ہجری مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء و ۱۹ بھادوں سمت ۱۹۵۰) و عبدالمجید اور ایک بیٹی یادگار چھوڑے ہیں جنکی نگرانی اور تربیت میں اُن کے شفیق چچا مصروف ہیں۔ خدا اُن کی سعی کامیاب کرے۔ نجم الدین باوجود سخت پابندی شریعت کے نہایت وسیع خیال اور کشادہ سینہ رکھتے ہیں جوانِ دنوں خاص قابل امتیاز ہے۔ خدا اُن کی حفاظت کرے اور اُنکے فرزند برخوردار عبدالحمید اور بیٹیوں کی عمر دراز کرے ؛

منشی صادق علی خان ہیڈ ماسٹر اسلامیہ سکول سری نگر کشمیر۔

خانصاحب پنجاب سے ایسے رُوٹھے ہیں کہ برسوں سے اِس طرف رُخ نہیں کرتے۔ یادم نمی کنی و زیادم نمی روی۔ عمرت دراز باد فراموش کار من۔ خواہ وہ ہم سے کس قدر دُور ہوں۔ اُن کی یاد ہمارے دلوں سے

بہت قریب ہے فرزند مرحوم اور جماعت احباب سے انہیں جو خاص اُنس و محبت تھی محتاج بیان نہیں۔ اُنکے جو نوحے مرثیئے اور قطعات تاریخ میرزا صاحب نے شائع کئے ہیں ناظرین اُن سے اُن کی دلی محبت شفقت اور الفت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم نہایت صدق دل سے اُنکی سرفرازی صحت اور خورسندی درگاہ الٰہی سے چاہتے ہیں۔ خدا اُن کے فرزند دلبند برخوردار محمد علی خان (تاریخ ولادت روز اتوار ۷ شعبان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۸۹۷ء و ۲۰ ماگھ سمت ۱۹۵۳) و احمد علی خان کی عمر میں برکت کرے۔ خانصاحب کی قلم سے جو کچھ نکلا ہے دل کی بھڑاس ہے اور دلوں پر ہی اُسکا بے حد اثر ہوتا ہے۔

شیخ عبد العزیز بی اے ایڈیٹر اخبار آبزرور و فیلو پنجاب یونیورسٹی۔

عبد الرشید مغفور شیخ صاحب کی چھوٹی عمر میں ہی معاملہ فہمی اور ہوشمندی کے قائل و مداح تھے اور اُنہیں اُن سے نہایت محبت تھی۔ خدا انہیں ہمیشہ سرسبز رکھے۔ خانہ آباد و دولت زیاد۔

مولوی ضیاء الدین احمد ایم اے۔ ریزیڈنٹ مجسٹریٹ میرپور خاص سندھ۔

نہایت پارسا اور پابند شرع ہیں اور عمدہ خاندان سے ہیں۔ اُن کے والد بزرگوار مولوی احمد بخش صاحب مرحوم کو عبد الرشید مرحوم اور میرے حال پر شفقت تھی۔ اُن کے برادر بزرگ حافظ فیروز الدین صاحب بی اے انسپکٹر پولیس اور دیگر برادران میرے باخلاص اور پیدا سے مہربانوں میں سے ہیں۔

لالہ ہر بھگوانداس - عبدالرشید مرحوم کو اُن سے بڑا اُنس تھا - وہ سابق
چیف کورٹ میں مُلازم تھے اور اب انبالہ میں کلرک آف دی ڈسٹرکٹ کورٹ
ہیں - لالہ گوبندرام صاحب ہیڈ ماسٹر پنشنر کے صاحبزادے ہیں - وُہ مجھے
بہت عزیز ہیں -

منشی عبدالعزیز منہاس وکیل گوجرانوالہ - عبدالرشید مغفور سے
اُنہیں بے انتہا محبّت تھی - اُن کے پس ماندگان و متعلقین سے بھی وُہی
تعلّق نباہے جاتے ہیں - خدا اُنہیں معہ اولاد ہمیشہ خوش و خُرم رکھے -
پچھلے سال وُہ فضلِ الٰہی سے پنجاب بھر میں امتحان وکالت میں اوّل نمبر پر رہے
اور طلائی تمغہ حاصل کیا - اللّٰہم زد فزد ثمّ زد

میرزا مہدی حسن منیجر ریاست شیخوپورہ - عبدالرشید مرحوم اور میرزا
مہدی حسن انٹرنس تک اکٹھے پڑھے مگر اُن کی محبّت اور دوستی کا تعلق ایسا مستحکم
اور مضبوط تھا کہ مدرسہ سے علیحدگی پر علیحدہ نہیں ہوا - اور فرزند مرحوم کی وفات
کے بعد بھی اُن کے پس ماندگان سے اُن کی توجہ اور عنایت ویسی رہی ہے -
مہدی حسن میرے واجب التعظیم دوست میرزا اسد اللہ صاحب مغفور کے
بھتیجے ہیں جنہوں نے میری طرح اپنی ساری عُمر ریلوے کی مُلازمت میں صرف
کی - بُدھ کے دن ۲۶ محرم الحرام ۱۳۱۴ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۹۶ء و ۲۸ اساڑھ سمبت ۱۹۵۳
کو اُن کا انتقال ہوا - عزیز میرزا مہدی حسن نے اپنی دیانت محنت قابلیت اور
حُسنِ اخلاق سے حال کے معزز عہدے تک ترقی پائی ہے - اور حکام کو
اُن کے تدیّن پر بھروسہ ہے - اُن کے اعلےٰ خصائل و استعداد سے لکھے

بہت زیادہ مدارجِ عالی حاصل کرنے کی قوی اُمید اور درگاہ الٰہی سے اِستدعا ہے۔ لکھنؤ کے وُزرا کے خاندان میں سے ہیں اور اُن کی اور اُن کے برادرِ بزرگ میرزا عبدُ اللہ صاحب کی شرافتِ طبعی اور سعادت ظاہر ہے۔ خُدا انہیں اور اُن کی اولاد کو آفاتِ ارضی و سماوی سے اپنی حفاظت میں رکھے اور ہمیشہ خوش و خُرّم رہیں۔

میرے عزیز میرزا اعجاز حسین طال اللہ عمرہٗ و زاد اللہ اقبالہٗ و اجلالہٗ

علاوہ زبردست ناثر ہونے کے گویا شاعر پیدا ہی ہوئے تھے۔ اُن کے زمانۂ طالبعلمی۔ گویا طفولیت کی ایک طویل نظم ہے۔ اِسے لکھتے ایک قرن سے زیادہ ہوگیا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو:۔

یہ ہنگامہ کیا اے خُدا ہو رہا ہے ۔۔۔ تو ہی کچھ بتا دے کہ کیا ہو رہا ہے
کہیں تو سراسر جفا ہو رہا ہے ۔۔۔ کہیں تو سراسر عطا ہو رہا ہے
نہیں فرق مشہود و شاہد میں جب کچھ ۔۔۔ تماشا یہ کیوں جا بجا ہو رہا ہے
پسند آیا کیوں تجھکو دُنیا کا پسنا ۔۔۔ یہ کیوں آسمان آسیا ہو رہا ہے

پھر آگے چل کے فرماتے ہیں:۔

تجھی سے ہی نور او تجھی سے ہے سایہ ۔۔۔ ثبوت اسکا صبح و مسا ہو رہا ہے
اگر چشمِ بینا سے انسان دیکھے ۔۔۔ تو جلوہ تیرا جابجا ہو رہا ہے
تیرے زور پر شیر کرتا ہے شیری ۔۔۔ ہُما تیرے پر سے ہُما ہو رہا ہے
ہر اِک سو شگوفہ ہے تو نے کھلایا ۔۔۔ ہر اِک سُو تماشا نیا ہو رہا ہے
تیری بادِ قُدرت کا آیا تھا جھونکا ۔۔۔ چمن جب سے ارض و سما ہو رہا ہے

فلک پر جو ہے ننھا ننھا ستارا — زمانہ اک اس پر فدا ہو رہا ہے
ہے بچّوں کا کھیل اور منجّم کا پیشہ — جہازوں کا یہ رہنما ہو رہا ہے
ہے سب نظمِ عالم اسی سے تو قائم — اثر اس کا ہم پر بڑا ہو رہا ہے
جو ظاہر ہوا انساں پہ ہر شے کی حکمت — تو مانے کہ جو ہے بجا ہو رہا ہے
یہ برگِ گیاہ اور یہ پتّھر کا ریزہ — ہر اک درد و غم کی دوا ہو رہا ہے
صبا کو کیا تو نے جاروب کش ہے — ہر اک صبح گلشن صفا ہو رہا ہے
چمن پر ہوئی تیری نظرِ عنایت — اُسے سبز خلعت عطا ہو رہا ہے
ہے سرگرم خیّاطِ بادِ بہاری — مُرتّب عبا و قبا ہو رہا ہے

پھر آگے چل کر یوں کہتے ہیں :-

بھلا کیونکہ مانوں بھلا ہو رہا ہے — کہ سارا جہان مبتلا ہو رہا ہے
یہ فعلُ الحکیم اور حکمت ہے واعظ — یہاں غور تو کر کہ کیا ہو رہا ہے
نہ آنکھوں پہ باندھ اپنے پٹّی خدارا — ذرا دیکھ جو بر ملا ہو رہا ہے
بڑی آرزو سے چلا تھا جو بیڑا — وُہی غرقِ بحرِ فنا ہو رہا ہے
کہیں قافلہ ہے غریبوں کا لُٹتا — کہیں قصّۂ کربلا ہو رہا ہے
ابھی جس زباں کا اثر تھا دلوں پر — اثر اُس پہ اب زہر کا ہو رہا ہے
وُہ عورت کہ تھی لاکھ مردوں سے افضل — جلا کر اُسے فیصلہ ہو رہا ہے

ذرا اور آگے جا کر یوں رقمطراز ہیں :-

خوشی سے جو گھر کل چمن بن رہا تھا — وُہی آج ماتم سرا ہو رہا ہے
کسی کا ضعیفی میں چھٹتا ہے بیٹا — کسی کا پیارا جُدا ہو رہا ہے

کوئی جل رہا ہے تپِ غم کی باعث　　کوئی درد میں مبتلا ہو رہا ہے
غرض تنگ دُنیا سے ہیں اہلِ دُنیا　　ہر اک کو یہ جینا بلا ہو رہا ہے

وغیرہ وغیرہ

فرزند مرحوم نے یہ نظم اپنے روزنامچہ کی کتاب میں ایسی جگہ تحریر کی تھی کہ اُن کے انتقال پر میری آنکھ پر بہت نظر پڑتی رہی اُنہیں کیا معلوم تھا کہ ایسے وقت میرا باپ اسے دیکھیگا اور اِسے پڑھ کر اُسکی طبیعت کی کیا کیفیت ہوگی۔ میرزا صاحب کی اُس عمر اور فکر کا خیال فرمائیے۔ سالے کہ نکو است از بہارش پیداست۔ وُہ مڈل سے لیکر امتحان وکالت تک اور ازاں بعد بھی لاہور میں مقیم رہے اور مجھے اُنکی سعادت۔ سادگیِ اطوار۔ فراست منکسر المزاجی۔ خودداری۔ بےنظیر جودتِ طبع اور دلی خلوص و محبت دیکھ کر ہمیشہ مسرت رہی۔ اُنکی کالج بلکہ کالجوں کی کیریر بےنظیر رہی اور ہر میدان میں اُنہیں کامل نصرت و فتح نصیب رہی۔ اُنہیں اور اُنکے والد بزرگوار جناب میرزا سرفراز حسین صاحب گورنمنٹ پنشنر اور عزیز بھائیوں اور متعلقین کو ہمارے حال پر ہمیشہ کرم اور خاص التفات رہا ہے۔ خدا اُنہیں مدام اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے اور سرسبز و شاداب کرے ؛

عبدالرشید مرحوم کی نسبت میں کیا کہوں۔ اپنی اولاد بدصورت ہو یا خوش شکل۔ بھلی ہو یا بُری۔ والدین کو اچھی لگتی ہے اور اُسکی ہر طرح کی بہتری چاہتے ہیں۔ رشیدِ مغفور کی نسبت مجھے یہی کہنا ہے کہ وہ جوانِ خوش صورت و خوب سیرت مجھے بباعث اپنے حیا۔ سعادت علم کے شیدائی۔ صاف دماغی

اور والدین اور بھائی بہنوں سے غیر معمولی محبت اور رحم اور علی الخصوص دوستوں سے سچے اخلاص کے صرف عزیز ہی نہیں تھا بلکہ میں دل سے اُسکی تکریم کرتا تھا۔ اُس جوان میں تصنع ہرگز نہ تھا اور سچائی کا عاشق تھا۔ مرضیِ الٰہی سے چارہ نہیں۔ رضینا برضاء اللہ زندگی درگردن اُفتادہست باندزیستن۔

جانہائے ما بسوخت زہجران ہمدمے
مجروح سینہ ایم و نہ داریم مرہمے
چون شمع سوخت رشتۂ جانم زتابِ دل
وز سوزِ سینہ می نخوانم زدن دمے

دردا کہ بیخ گلبنِ شادی بریدہ گشت
وحسرتا کہ شاخِ طرب بار در نماند
اے دل فغان برآر کہ آرامِ جان برفت
وے دیدہ خون ببار کہ نورِ بصر نماند

میرے عزیز میرزا اعجاز حسین نے تو اُن کی یادگار قائم کرنے کے لئے یہ تذکرہ لکھا ہے:-

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

نیز میرے فرزند مرحوم کو بچپن سے تجارت کا بہت خیال تھا۔ چنانچہ جب وہ اور میرزا صاحب ابھی مڈل ہی میں پڑھتے تھے تو انہوں نے میرزا صاحب کی طرف اپنے خطوط میں تجارت اور مسلمانوں کا اس میں بہت کم حصہ

ہونے کی نسبت عجیب خیالات ظاہر کئے ہیں اور دیگر احباب سے بھی اُن کی ہمیشہ اِس کے متعلق گفتگو رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے مرض الموت میں اپنے چھوٹے بھائی برخوردار **عبدالحمید** کو اِس کے لئے آمادہ کیا اور ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء کو انارکلی میں عام اشیائے تجارت کی دوکان کھولی گئی۔ عبدالحمید نے اپنے عزیز بھائی کے انتقال پر اُن کی یادگار میں بجائے اپنے نام کے دوکان کا نام **عبدالرشید زبرور** تبدیل کیا۔ دوکان کا آغاز مختصر تھا مگر برخوردار عبدالحمید نے یہ سات سال اُس میں شبانہ روز سخت محنت کی ہے اور اُسے روز بروز ترقی ہوئی ہے۔ اور اب خدا کے فضل سے اُس میں پوری کامیابی نظر آنے لگی ہے۔ اِس دوکان کے متعلق مرحوم کے جو خیالات اور آرزوئیں تھیں۔ وہ اپنے ساتھ لے گئے مگر مجھے یقین ہے۔ کہ مرحوم کے سب احباب کو اِس اُنکے یادگار سے بھی دلچسپی ہے ٭

ناظرین۔ اُس چمن میں یہ سب اور دیگر خوشنما پھول تھے مشیتِ ایزدی سے اُن میں سے بعض قبل از وقت مرجھا گئے اور معدوم ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی روحیں بعد مُردن شاد و خرم ہیں اور دعا ہے کہ جو باقی ہیں پھلیں پھولیں اور عمرِ طبعی کو پہنچیں اور بادِ سموم سے محفوظ رہیں ٭

اپنے واجب التعظیم احباب کی عنایت کا شکر ادا کرنا بھی میرا فرض ہے۔ میرے مخدوم و مکرم **جناب آنریبل مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے جج چیف کورٹ پنجاب** کو عبدالرشید مرحوم کے حال پر عنایت تھی اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میرے جدِ بزرگوار **جناب**

مولوی احمد بخش صاحب چشتی اور آنریبل ممدوح کے جدِ امجد جناب **مولوی حکیم قادر بخش صاحب** رحمہم اللہ تعالےٰ کی آپس میں گاڑہی دوستی تھی۔ دونوں بزرگ اپنے وقت کی لاہور کی شریف مسلمان سوسائٹی کے رکن تھے۔ سو اُن سے کوئی نیا تعلق نہیں ہے آنریبل موصوف کی تحریر میرے فرزند مرحوم کی نسبت اِن اوراق میں درج ہے۔ اُن کے انتقال پر بھی جو دلی ہمدردی سے بھرا ہوا تعزیت نامہ اُنھوں نے مجھے بھیجا اُس کی مشکوری میرے دل پر نقش رہیگی۔ اُنہیں اور اُن کے برادرانِ بزرگ **مولوی ظہور الدین صاحب** مرحوم مغفور اور میاں تاج الدین صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور اُنکے عم زاد عزیز **آنریبل میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لاو ممبر مجلس قانونی پنجاب** و دیگر متعلقین اور خاندان کے ممبروں کو ہمیشہ میرے حال پر شفقت رہی ہے۔ سارے ہندوستان کے مسلمان آنریبل مولوی صاحب کی فضیلت۔ پختہ دماغی۔ اِتقا۔ سلامت روی اور رتبۂ عالی پر جس قدر فخر کریں تھوڑا ہے۔ خدا اُنکی اولاد کو با اقبال اور اُنکے قابلِ مثال گھرانے کی عزت کو یوماً فیوماً زیادہ کرے۔

میرے مکرم و شفیق **شیخ عبد القادر صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا** اور **مولوی محبوب عالم صاحب** مالک خادم التعلیم پریس و پیسہ اخبار کی عبد الرشید مرحوم پر ہمیشہ دلی شفقت رہی۔ میرے سخت صدمہ میں جو ہمدردی اُنھوں نے ظاہر فرمائی اُس کی یاد مجھے کبھی فراموش نہیں ہوسکتی۔

میرے واجب التکریم مخدوم جناب مولوی سیّد احمد کبیر صاحب۔

چالیس سال سے زیادہ سے مجھے اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ اُن کا حقیقی اِتقا اور صبر و حوصلہ بے نظیر ہیں۔ اُن کی تحریر سے جو اِس کتاب میں شائع ہوتی ہے ناظرین کو عبدالرشید مرحوم کی نسبت اُن کی رائے معلوم ہوگی۔ یہ رائے ایسے دل کے خیالات ہیں۔ جس پر خود لائق بیٹے کی موت کا صدمہ گذر چکا تھا۔ گو اُنھوں نے اپنی تحریر میں اُس اپنی مصیبت کا اشارہ تک نہیں کیا۔ اُن کے بڑے صاحبزادے سیّد شریف حسین بی اے نے بروز جمعہ ۲ ذیقعد ۱۳۲۱ھ ہجری مطابق ۲ جنوری ۱۹۰۴ء و ۱۱ اگہن سمت ۱۹۶۰ عین شباب میں عرصہ دراز کی بیماری کے بعد انتقال کیا۔ میر صاحب کی اس تحریر کے بعد اُن کے دوسرے فرزند سیّد محمدؐ کا بھی بروز جمعہ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۳۲۶ھ ہجری مطابق اوّل مئی ۱۹۰۸ء و ۲۰ بیساکھ سمت ۱۹۶۵ ناگہان دو تین روز کی بیماریِ ہیضہ سے کوچ ہوگیا۔ سیّد شریف حُسین مرحوم کی دو بیٹیاں اور سیّد محمد مغفور کے دو بیٹے۔ سیّد علی (تاریخ ولادت روز جمعہ غرّہ جمادی الاولے ۱۳۲۲ھ ہجری مطابق ۱۵ جولائی ۱۹۰۴ء و اوّل ساون سمت ۱۹۶۱) و سیّد مرتضےٰ (تاریخ ولادت روز جمعرات ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ ہجری مطابق اوّل اکتوبر ۱۹۰۸ء و ۱۵ اکتوار سمت ۱۹۶۵) جو اپنے باپ کی وفات کے پانچ ماہ بعد پیدا ہوا۔ یادگار باقی ہیں۔ خدا اِن سیّد زادوں اور سیّد زادیوں کو عمر دراز عطا کرے اور ہمارے مکرّم و ہمدرد مولوی صاحب کو اُن کا کوئی رنج نہ دکھلائے۔

میرے مخدوم میرزا جلال الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا و میرزا اسعد بیگ صاحب (رئیس اعظم و آنربری مجسٹریٹ لاہور) کو عبدالرشید مرحوم پر کمال شفقت تھی اور اُن کی وفات پر صاحب اوّل الذکر نے لنڈن یا قسطنطنیہ سے نہایت ہمدردی کا بھرا ہوا تعزیت نامہ بھیجا۔

حکیم شہباز الدین صاحب رئیس لاہور گورنمنٹ پنشنر۔ لاہور کے شاہی حکیموں کی یادگار ہیں۔ اُن کے جدّ بزرگوار حکیم گل محمد صاحب مرحوم فریدِ زمانہ تھے اور اُن کے گھرانے کے نام سے لاہور میں بازار حکیماں مشہور ہے اُن کے عم بزرگوار حکیم حسام الدین صاحب مغفور پنجاب کے گویا حکیم محمود خان تھے۔ اُن کے عم زاد بھائی حکیم ضیاءُ الدین صاحب مرحوم اور دُوسرے چچا حکیم شجاع الدین اپنے فن میں شہرۂ آفاق تھے۔ حکیم شہباز الدین محکمۂ پبلک ورکس پنجاب میں ایکاؤنٹنٹ رہے اور پچپن سالہ ہونے کے بعد اُنھیں پانچ برس کی غیر معمولی وسعت ملی تھی۔ اب دو تین سال سے پنشن یاب ہوئے ہیں۔ اُن کے خاندان کا فیض پنجاب بھر میں زبان زدِ خاص و عام ہے ان اوراق میں کہیں اَور بھی اُن کا ذکر خیر ہے۔ میرے حال پر اُنہیں دلی شفقت ہے اور عبدالرشید مرحوم سے خاص عنایت تھی۔

مولوی محمد حسن صاحب جالندہری پنشنر محکمہ تعلیم سلمہ اللہ تعالے مولوی صاحب کا وجودِ متبرک مغتنمات سے ہے۔ عبدالرّشید مغفور سے دلی لگاؤ اور میرے حال پر اُن کے تفقدات اور رحم و شفقت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔

شیخ غلام محی الدین صاحب ہیڈ کلرک محکمہ جنگلات۔ گورنمنٹ پنشنر میرے دیرینہ ہمدرد دوست ہیں۔ درگاہ الٰہی سے التجا ہے کہ اُن کے فرزندوں برخورداران عزیز محمد حسین و عبدالعزیز (جو ہر دو محکمۂ پولیس میں معزز عہدوں پر ہیں) اور عبدالمجید (دفتر چیف کمشنر فرانٹیئر پراونس) کی عمروں میں برکت دے اور اُنکا حافظ و ناصر ہو اور اُنکے دیگر جملہ متعلقین کو خوش رکھے ۔

فرداً فرداً دیگر مکرم شفیقوں کی عنایت و ہمدردی کی تفصیل ناممکن ہے۔ خدا اُن سب پر اپنی برکتیں نازل کرے ۔

عبدالرشید مغفور کی تحریرات زیادہ تر انگریزی میں ہیں۔ تا حال اُن کی اشاعت کی کوئی صورت نہیں ہوئی۔ عزیز میرزا اعجاز حسین اُنہیں بطور ضمیمہ اِس کتاب کے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں نیز بعض احباب بھی مرحوم کی نسبت کچھ اَور لکھنا چاہتے ہیں۔ میرے شفیق عزیز حاجی شمس الدین شائق نے کچھ لکھا ہے۔ میرے مکرم دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لا نے مرحوم کی وفات پر ایک دو شعر لکھے تھے۔ اور وُہ کچھ اَور کہنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے ہیں۔ یہ سب شائد پھر چھپ جاویں ۔

زشرحِ قصۂ ما رفتہ خواب از چشمِ خاصاں را
شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

خاکسار حامد علی چشتی عُفی عنہ

لاہور۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

تقریظ دیگر

گاہے گاہے باز خوان این دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

عبدالرشید چشتی مرحوم کو فوت ہوئے اب سات برس ہونے کو آئے ہیں۔ اُس کی یاد ہر دم دلوں میں تازہ ہے۔ دوست رشید پیارا رشید ایسا دوست نہ تھا جس کو ہم جیتے جی بھول جاویں۔ اُس کی دوستی۔ اُس کی اُلفت ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔ اور دمِ آخرین تک قائم رہیگی۔ میرا تو خیال ہے۔ کہ اُس کو بھُلانا ہمارے اِمکان سے باہر ہے۔ اُس کی محبت کی جڑ ہمارے دلوں میں اِس قدر گہری چلی گئی ہے۔ کہ بغیر کسی آب یزی کے نشو و نما پائیگی اور پھولتی پھلتی رہے گی۔ مرزا اعجاز حسین صاحب بی اے وکیل انبالہ نے جو ہمارے حلقۂ احباب کے ارکانِ اعلےٰ میں سے ہیں حقِ دوستی ادا کیا اور خوب ادا کیا۔ رشیدِ مرحوم کی یاد اور داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے لئے دفترِ پارینہ کو اکٹھا کر دیا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے اور اجرِ عظیم ؛

رشید مرحوم کے انتقال پر ہی مرزا صاحب نے حیاتِ رشید لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اتفاقاتِ زمانہ ہیں۔ کہ اِس قدر دیر ہو گئی۔ مگر دیر آئید درست آئید کا مضمون ہے۔ میری تجویز ہے کہ ایک کلب موسوم بہ رشید کلب بھی قائم کیا جاوے

اور احبابِ رشید سال میں ایک دفعہ مرقدِ رشید پر جمع ہو کر داغہ سے
سینہ کو تازہ کیا کریں اور ایک رشید میڈل ہر سال ایک ایسے طالب علم
اسلامیہ کالج کو دیا جاوے جو علاوہ اعزاز کے ساتھ ڈگری حاصل کرنے
کے رشید مرحوم کی طرح دردِ قومی بھی رکھتا ہو اور پہلا میڈل اس خاکسار کی
طرف سے ہو ع "تازہ رکھنی ہے عزیزوں کو گُلِ رعنا کی یاد"

عبدالعزیز منہاس۔ وکیل۔ گوجرانوالہ

لاہور۔ ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

فہرست مضامین

* تصحیحات ملاحظہ ہوں

تمہید و تہدیہ

مسٹر بروکس ایک قابل انگریز مصنّف اپنی گرانمایہ کتاب مشاہیر من الصبیان (ہسٹارک بوئز) میں لکھتے ہیں کہ

"جب اور جہاں کہیں تمہیں ایک عالی ہمّت لڑکا نظر آئے جو کلمۃ الحق بیدریغ کہتا ہے اور عدل و انصاف کی حمائیت میں اپنی آواز بلند کرتا ہے اپنے سادہ فرائض سادگی اور راستبازی کے ساتھ بلا لحاظ نتائج ادا کرتا ہے اور اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ دنیا کیا کہے گی۔ نہ اہل دنیا کی تعریف یا مضحکہ کی پروا کرتا ہے (کیونکہ عام طور سے لوگ تو بے سوچے سمجھے مضحکہ اُڑانے یا تعریف کرنے کیلئے گویا ہر وقت تیار ہی بیٹھے رہتے ہیں) تو سمجھ لو کہ اس لڑکے میں ناموری کے آثار موجود ہیں خواہ اُس کی حالت کیسی ہی ادنی ہو۔ خواہ اُس کا دائرہ اثر کیسا ہی تنگ ہو ایسے لڑکے میں وہ جوہر اور قابلیتیں موجود ہوتی ہیں جو اُس کو دنیا کے تاریخی لڑکوں کے تذکرہ میں جگہ پانے کیلئے مستحق دعویدار بنا سکیں۔ گو یہ ممکن ہو کہ خود

اُس لڑکے کو اپنی آئندہ عظمت کا وہم و گمان بھی نہو۔"

افسوس! کتنی کلیاں بن کھلے مُرجھا جاتی ہیں۔ اور کتنی زندگیاں بیوقت موت خاک میں ملا دیتی ہے۔ بہت سے نوجوان عمرِ طبیعی تک پہنچنے سے پیشتر صیّادِ اجل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان نونہالوں کو اگر موت فرصت دیتی تو یہ ضرور امتیاز اور ناموری کی بہار دکھاتے +

عبدالرشید مرحوم ایسے نوجوان تھے جن میں وہ تمام اوصاف اور خوبیاں پائی جاتی تھیں جنکا مسٹر بروکس نے ذکر کیا ہے اور یقین ہے کہ اگر وہ عمرِ طبیعی تک پہنچتے تو اُن خداداد قابلیتوں کی بدولت جو اُن کی طبیعت میں ودیعت تھیں ایک دن ضرور بلند مرتبے پر پہنچتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لازمی طور سے وہ ایسی عظمت اور وقعت حاصل کرتے کہ مارکس آریلیس جیسے مشاہیر کے ساتھ تذکرہ ہائے تاریخ میں اُن کا ذکر کیا جاتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ فی زمانا ہمارے فلاکت زدہ ملک میں جہاں نامور اور مشاہیر اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں کسی نوجوان کا غیر معمولی طور پر ہونہار ہوشمند۔ باہمت۔ راستی پسند۔ دردمند ہونا ایسے آثار ہیں جن سے اسقدر اندازہ تو ضرور کیا جا سکتا ہے کہ یہ نوجوان بڑا ہو کر اپنی قوم یا ملک کے معاصرین میں اسی طرح امتیاز اور اعزاز حاصل کریگا۔ جیسا اپنے مدرسہ یا کالج کے معاصرین میں حاصل کیا ہی۔ بہرحال جنھوں نے عبدالرشید مرحوم کو دیکھا ہے وہ یہ کہنے سے ہرگز باز نہیں رہ سکتے کہ

بالائے سرش ز ہوشمندی ... می تافت ستارۂ بلندی

مسٹر بروکس نے جن تاریخی لڑکوں کے تذکرے لکھے ہیں۔ وہ سب کے سب ایسے ہیں جو بڑے ہوئے۔ پروان چڑھے۔ کام کیا۔ نام پایا۔ عبدالرشید ابھی طالب علمی سے پورے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ موت نے آدبایا۔ کام کیا کرتے۔ نام کیا پاتے۔ وہ گوہر آبدار جو پہلے مرحوم کی طبیعت میں ودیعت تھے اب تہ خاک ہیں آنکھیں اُن کے نور سے اور جانیں اُن کے فیض راحت سے محروم رہگئیں۔ انگریزی شاعر گرے کا مقبول عام بند ایسے ہی گوہروں پر صادق آتا ہے

جوت جن موتیوں کی مہر درخشاں سے لٹے
دُور قعروں میں سمندر کے ہیں مخفی وہ پڑے
پھُول اَن دیکھے بہت کھلتے ہیں ایسے ناشاد
باد ویرانہ پہ بُو ہوتی ہے جن کی برباد
کوئی رُستم ساجری یہاں بھی گڑا ہوئیگا
کھیت پر حاکم دہ سے جو لڑا ہوئیگا
دفن ہوگا کوئی سودا سا پرانا مشہور
کوئی تیمور مگر ملک کی تہذیب سے دور

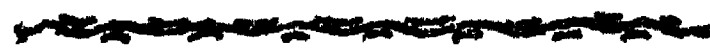
(مترجمہ مولوی سید احمد کبیر)

عبدالرشید نے اپنے ہمعصر طالبعلموں میں ضرور نام پیدا کیا اور بہت سے دلوں میں ابتک اُسکی یاد عزت کے ساتھ باقی ہے اور آخری دم تک باقی رہیگی۔ میرے خیال میں طالب علموں کے لیئے اُس نیک زندگی کا مطالعہ دلچسپی اور زبیت سے خالی نہو گا۔ مجھے اُمید ہے کہ عام طور سے طالب علم اِن اوراق کو شوق سے پڑھیں گے۔ اس مختصر سی نیک زندگی سے چند نصیحتیں حاصل کرینگے۔ اور اُس کے بیوقت ختم ہو جانے پر ہمدردانہ متاسّف ہوں گے۔ البتہ غلغلہ پسند پبلک کیلیئے ایک حلیم الطبع۔ شریف مزاج۔ مرنج ومرنجان طالب علم کی زندگی شاید دلچسپ مضمون نہو۔

اگر میں کسی شورش انگیز زندگی کے حالات لکھتا۔ کسی بیرحم جنگجو کے کارنامے رقم کرتا۔ کسی بڑے متموّل اور نامور شخص کے سوانح عمری بیان کرتا جس کا تموّل اور ناموری ہزارہا بندگان خدا کے خون سے رنگ آمیز ہے تو غالباً پبلک بھی اِن اوراق کو نہایت شوق اور سرگرمی سے پڑھتی بصورت موجودہ اُمید نہیں کہ بہ خیال خود مصروف پبلک اس مختصر سے تذکرہ کو مطالعہ کی عزّت بخشے۔ ایک معمولی بندر کے حالات پڑھنے کیلیئے جو کوٹ پتلون پہن لیتا ہے۔ اور ریفرشمنٹ روم میں میز کرسی پر کھانا کھا سکتا ہے لوگ وقت نکال سکتے ہیں۔ مخرّب اخلاق سیر و تماشے کیلیئے لوگ وقت نکال سکتے ہیں۔ مگر وہ کسی انسان کے حالات پڑھنے کیلیئے وقت نہیں نکال سکتے تاوقتیکہ وہ بڑا نامور تاجدار یا نامور مدبّر سلطنت یا نامور

سیتاح نہو۔ ان لوگوں کی نظر میں چھوٹی چھوٹی زندگیاں قابل توجہ نہیں۔ نہ وہ دلچسپی رکھتی ہیں نہ تربیت بخش ہوسکتی ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہی کہ ایک چھوٹی سی چیونٹی۔ ذلیل سے پروانے ادنی سے کیڑے کی زندگی پر غور و خوض کرنے میں عمریں گذار دیجاویں۔ اُن کے حالات کی توضیح میں ہزار ہا ورق سیاہ کیئے جاویں۔ مگر اشرف المخلوقات سے لاکھوں کروڑوں بندے۔ نیک خصایل تعلیم یافتہ تربیت یافتہ اشخاص اپنا معین دور زندگی اس جہان فانی میں ختم کرکے بے نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ جائیں اور کوئی کوشش اُن زندگیوں سے سبق لینے کی نہ کی جائے۔ اور اُن زندگیوں کو جو برسوں تک انسانی خواہشات۔ انسانی محسوسات۔ انسانی جذبات۔ انسانی تاثرات کا مظہر رہی ہیں۔ اور جنھوں نے بنی نوع انسان کی بہت سے افراد کے درد و راحت پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالا ہی حرف غلط سے زیادہ وقعت نہ دیجائے۔ اور اُن کے حالات سے نتائج نکالنے کی تکلیف گوارا نہ کی جائے۔ ایسی کوشش ہرگز بے سود اور رائیگان نہیں جاسکتی۔ مگر محض مفید کاموں کے کرنے والے اس شہرت طلب دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ مفید کاموں میں سے اکثر وہی کام کیئے جاتے ہیں۔ جنکے کرنے میں کوئی ذاتی شہرت یا عزت کا شائبہ بھی شامل ہو۔ لوگ دولت اور نام پر مرتے ہیں۔ اس لیئے صرف دولتمند یا ناموروں کے سوانح شوق سے لکھے اور ذوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ عبدالرشید مرحوم نہ دولتمند تھا نہ نامور ایسے شخص کی زندگی کا تذکرہ پبلک کی نگاہ میں کیا وقعت رکھیگا۔ ہاں مرحوم کے دوستوں اور

عزیزوں کا ایک گروہ کثیر باقی ہے جو اس پیاری اور نیک زندگی کی چند روزہ جھلک کو محبّت اور اُلفت کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ ان دوستوں اور عزیزوں سے اُمید ہی کہ اِن اوراق کو دل اور آنکھوں سے لگائیں گے اور قلب مضطرب و مہجور کو اِن کے مطالعہ سے تسلّی دینگے۔ اُن کے زخم جگر کیلیئے یہ اوراق مرہم کا کام دیں گے۔ اُن ہی کیلیئے بالخصوص یہ تذکرہ لکھا گیا ہے اور اُن ہی کو تہدیہ کیا جاتا ہی +



فصل اوّل

خاندانی حالات

شہر لاہور کے متوسط الحال مسلمان خاندانوں میں چشتیہ خاندان نہایت مقتدر اور معزز خاندان ہی۔ اس خاندان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام سے ملتا ہی۔ جب ہمایوں بادشاہ کو انقلاب زمانہ کیوجہ سے ہندوستان سے ایران میں جاکر پناہ گزین ہونا پڑا تھا تو اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی محمد عاقل صاحب ایران ہی میں تھے۔ ہندوستان کے آب و دانہ نے زور کیا اور غریب الوطن بادشاہ کے ساتھ قاضی صاحب کو بھی ہندوستان میں کھینچ بلایا۔ یہاں آکر جب ہمایوں بادشاہ کی قسمت کا ستارہ چمکا اور مخالفین پر فتح نصیب ہوئی تو غریب الوطنی میں رفاقت کے صلہ میں محمد عاقل صاحب کو عہدۂ قضا دکن پر مامور کیا گیا قاضی صاحب موصوف کے صاحب زادہ قاضی واسع کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہ آئی یا وطن کی کشش نے مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور قضائے دکن کو خیرباد کہکر ایران کو مراجعت فرمائی۔ عرصۂ دراز کے بعد

اُن کی اولاد میں سے قاضی ضیاء الحق اور بہاء الحق معہ اپنے عم بزرگوار
مولوی نظام الدین صاحب کے دوبارہ ہندوستان میں آئے اور ایسے
آئے کہ وہ اور اُن کی نسل پھر یہیں کی ہو رہی۔ مولوی نظام الدین صاحب
کی خدمت میں ہزارہا لوگوں نے بسلسلۂ چشتیہ بیعت کی اور اُن کے ہردو
برادر زادگان دہلی۔ آگرہ اور دیگر مقامات میں سلطنت مغلیہ کے زیر سایہ عہدۂ
قضا اور اتالیقی شاہزادگان چغتائی پر مامور رہے۔ ان تینوں بزرگوں کو شاہانِ
مغلیہ کی طرف سے پنجاب میں جاگیریں عطا ہوئیں۔ قاضی بہاء الحق صاحب نے
اورنگ آباد علاقہ نارووال میں سکونت اختیار کی اور قاضی ضیاء الحق صاحب نے
لاہور میں متصل گڑھی شاہو۔ چنانچہ جو خاندان اب لاہور میں چشتیہ لقب سے
نامزد خاص و عام ہے وہ اُنہی بزرگ کی اولاد ہے۔ اس خاندان کے چشتیہ مشہور
ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ مولوی نظام الدین
صاحب اور بعض دیگر بزرگ خاندان چشتیہ سے بیعت رکھتے تھے اور صاحب
علم و فضل ہونیکی وجہ سے اس سلسلہ میں اسقدر ممتاز ہوئے کہ مُریدی سے
مرشدی کے رتبہ تک پہنچ گئے۔ بہر حال اسمیں شک نہیں کہ اس شریف
خاندان نے شہر لاہور میں روحانی دماغی اور علمی روشنی پھیلانے میں بہت
بالشّان حصّہ لیا ہے۔ قاضی ضیاء الحق اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے
پوتے اور پڑپوتے نے درس و تدریس کا چشمۂ فیض جاری رکھا اور واقعی
طور سے ضیائے حق پھیلا کر اپنے شہر اور اُس کے گرد و نواح کو منوّر کرنے
اور اپنے علم دوست خاندان کا نام روشن کرنے میں سرگرمی اور مستعدی سے

کام لیا۔ اُس زمانہ میں کہ جب سکول اور مدرسے اسقدر عام نہ تھے جیسے کہ اب ہیں تعلیم کا کام عموماً ایسے ہی بافیض خاندانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایسے خاندانوں کا وجود عامۂ خلائق کی بہبودی اور عام سطح ذہانت کو اونچا کرنے کیلئے کمال درجہ موجب برکت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ لاہور کے بہت سے گھرانے۔ نواب زادے۔ رئیس زادے۔ ہندو مسلمان اس خاندان کے زیربار منتِ احسان ہیں۔

جب پنجاب کا صوبہ سلطنت مغلیہ کے ہاتھ سے نکلگیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور دورہ ہوا تو شاہان مغلیہ کی عطا کردہ جاگیریں اور معافیات بھی اس خاندان کے ہاتھ سے نکل گئیں البتہ بعد میں اُن کا ایک قلیل حصہ ملک سکندر خان صاحب خاکوانی مغفور وکیل منکیرہ کی سفارش وسعی سے جو اس خاندان سے ارادت رکھتے تھے مولوی احمد بخش صاحب کو جو قاضی ضیاء الحق کے پڑپوتے تھے رنجیت سنگھ کی طرف سے نسلاً بعد نسلٍ عطا ہو گیا تھا اور کچھ نقد پنشن بھی مقرر ہو گئی تھی۔ مگر سلطنت انگلشیہ کے استحکام پر یہ جزوی معافی اور پنشن بجائے نسلاً بعد نسلٍ قایم رہنے کے صرف مولوی احمد بخش صاحب۔ اور اُنکے بڑے بیٹے کی حین حیات تک محدود کر دی گئی۔ اور ۱۸۹۶ء میں اُن کے انتقال پر ضبط سرکار انگلشیہ ہو گئی۔ اگرچہ پنجاب مدت سے دولت مغلیہ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور شاہان مغلیہ کے اقبال کا ستارہ زوال وپستی میں ڈوب چکا تھا مگر اس خاندان نے بلحاظ نمکخوار قدیم ہونے کے دامان دولت شاہی سے وابستہ ہونا ہمیشہ اپنا فرض اور فخر سمجھا۔ چنانچہ ۱۸۴۷ء میں مولوی احمد بخش صاحب مع اپنے

عــہ نوٹ: مولوی نور احمد صاحب ۱۱ اگست ۱۸۸۸ء کو فوت ہوئے اور اسی سال میں اُنکے والد بزرگوار کا ۲ نومبر کو

فرزند اکبر مولوی نور احمد کے دہلی تشریف لیگئے اور بہادر شاہ کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل کیا۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی بادشاہ کی طرف سے مولوی احمد بخش صاحب کو تیرہ پارچہ کا خلعت مع دو رقم جواہر اور اُن کے فرزند کو سات پارچہ کا خلعت عطا ہوا۔ مولوی احمد بخش مرحوم کو شاعری میں بھی دخل تھا۔ یکدل تخلص کرتے تھے۔ بہادر شاہ بھی کہنہ مشق شاعر تھا۔ اور شاعروں کا قدردان تھا۔ مولوی صاحب مبرور کو فخر الشعرا کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اور ایک مُہر دہلی کے باکمال مُہرکن بدرالدین سے کندہ کرا کر از راہِ الطاف خسروانہ مولوی صاحب موصوف کو عطا فرمائی۔ مُہر حسب ذیل عبارت کندہ تھی :۔

فضیلت پناہ یکدلی آگاہ فخر الشعرا مولوی احمد بخش یکدلؔ

فدوی محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی

مُلک اور مُلکداری تو کبھی کی ہاتھ سے جا چکی تھی۔ جاگیریں اور معافیاں اب کہاں رکھی تھیں جو عطا کرتے۔ خطاب اور مُہر اور خلعت دینا البتہ قبضہ قدرت میں تھا۔ شاہانہ فیاضی نے اس میں دریغ نہ کی اور جتنی قدر کہ ایک فاضل باکمال کی ہو سکتی تھی مولوی احمد بخش صاحب کی گئی اور عنایات خسروانہ کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ مولوی احمد بخش صاحب کے فرزند مولوی نور احمد صاحب نے آغاز سلطنت انگریزی میں انگریزوں کو فارسی اور اُردو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایسے اشخاص کی جو اُردو فارسی اور عربی میں

کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور انگریزوں کو یہ علوم سکھاتے تھے ابتدائے زمانہ انگریزی میں بڑی قدر تھی۔ یہ پیشہ عموماً شریف لوگوں کے ہاتھ میں تھا اور شریف طبیعت عالی خاندان انگریز اُستادوں کا بڑا ادب کرتے اور احسان مانتے تھے۔ مختلف طریقوں سے اپنے اُستادوں اور اُن کے متعلقین کی پرورش کر کے اور اعزاز بڑھا کر حقِ شاگردی ادا کرتے تھے۔ مولوی نور احمد صاحب اور اُن کے برادر خُرد مولوی محمد علی صاحب نے اسی کام میں اپنی عمر صرف کی۔ مولوی محمد علی صاحب نے محکمہ تعلیم سرکاری میں بھی ملازمت کی۔ اور رئیس زادوں کی تدریس و تعلیم بھی جاری رکھی۔ دونو بھائی علم و فضل میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ مولوی نور احمد صاحب نے بہت کتابیں مثلاً تحفہ چشتی مشعر بہ صرف و نحو اردو و فارسی و عربی یادگار چشتی[1] مشعر بہ رسوم اہل اسلام پنجاب۔ عجائبات چشتی خیالات دانش اور تحقیقات چشتی جس میں عمارات و مقابر قدیمہ شہر و مضافات لاہور شرح و بسیط سے درج ہیں تصنیف و تالیف کیں۔ جن کی بہت قدر ہوئی۔ تحقیقات چشتی[2] اب تک عدالتوں میں بیسیوں مقدمات میں سنداً پیش ہوتی ہے۔ مولوی محمد علی صاحب کے فرزند مولوی حامد علی صاحب چشتی بفضل خدا اس وقت حیات ہیں اور مسلمانان لاہور میں اِن کی ذات بابرکات نہایت غنیمت ہے۔ آپ نے چھوٹی عمر سے محکمہ تار سندھ و پنجاب و دہلی ریلوے میں قلیل تنخواہ پر ملازمت اختیار کی اور خداداد قابلیت ذہانت نیک خصلتی اور محنت کشی کی وجہ سے برابر ترقی حاصل کرتے رہے اور اب

[1] مسٹر چارلس ایچیسن نے جو بعد ازاں سر چارلس اور لفٹنٹ گورنر پنجاب ہوئے نہایت [illegible]

[2] تحقیقات چشتی کی نسبت مسٹر ڈبلیو کولڈسٹریم صاحب سابق ڈپٹی کمشنر و کمشنر نے اپنی رائے ایک سند میں جو انھوں نے مولوی حامد علی صاحب چشتی کو [illegible] میں عطا کی [illegible]

محکمۂ آڈٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے میں اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہیں۔ اور آپ کا شمار چند منتخب معززین شہر میں ہوتا ہے۔ آپ تمام قومی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ آپ اُن نیک نہاد اور مبارک بزرگوں میں سے ہیں جو پنجاب میں سب سے پہلے سر سید کے رنگ میں رنگے گئے۔ پنجاب میں غالباً تہذیب الاخلاق کے پرچے سب سے پہلے اُن کے زیر نظر رہے اور تُرکی ٹوپی اس خاندان کے زیب سر ہوئی۔ نوجوان طلبہ پر خاص طور سے عنایت فرماتے ہیں۔ اپنی نیک صلاح اور مشورہ سے ہر ایک کی مدد کرنیکے لیئے ہر وقت مستعد ہیں۔ وہ نہایت ہی مبارک وقت ہوگا۔ کہ جب ایسے نیک روشن خیال۔ دردمند لوگ ہمارے ملک میں زیادہ کثرت سے ہو نگے عبدالرشید جس کی یادگار میں یہ تذکرہ لکھا گیا ہے مولوی حامد علی صاحب کا منجھلا فرزند تھا۔ لایق باپ کا لایق بیٹا۔ اسجگہ ہم عبدالرشید کا شجرۂ نسب مختصراً درج کردینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔

قاضی محمد عاقل

قاضی واسع

قاضی انوار اللہ

قاضی عنایت اللہ

مولوی ضیاء الحق — بہاء الحق (یہ شاخ اورنگ آباد وغیرہ میں سکونت پذیر ہے)

مولوی محمد ابراہیم

مولوی غلام حسین

مولوی احمد بخش یکدل

مولوی نور احمد — مولوی محمد علی — محرم علی

مولوی حامد علی

عبدالرشید

مفصل شجرہ بطور ضمیمہ نمبر ۲ اس کتاب کے ساتھ لگایا گیا ہے۔

فصل دوم

عبدالرشید کے ابتدائی حالات

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اور اعلان امن یکم نومبر ۱۸۵۸ء سے پیشتر ہندوستان میں عجب بے امنی اور بے اطمینانی کا زمانہ تھا۔ تمدنی زندگی کی کشتی طوفان خوف ورجا میں ڈگمگا رہی تھی۔ مصائب۔ بے سروسامانی۔ خانہ بربادی غریب الوطنی نے زندگیاں بالکل بے مزہ اور تلخ کر دی تھیں۔ تجارت صنعت۔ دستکاری کے دروازے مسدود ہو گئے تھے۔ اعتبار مفقود ہو گیا تھا۔ حکام کے انتقام کا خوف۔ عفو و مراحم خسروانہ کی امید دلوں میں ہر وقت اک کشمکش رکھتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ ہلچل پنجاب میں نہ تھی۔ اس طوفان بدامنی و خونریزی کا سیلاب دریائے ستلج سے پار نہیں ہوا تھا ✦

اسی زمانہ میں شہر لاہور کے ایک مکان میں جو موچی دروازہ اور اکبری دروازہ کے مابین واقع ہے نماز عصر کے بعد ایک فرشتہ سیرت ضعیف العمر بزرگ جن کا سن ساٹھ سال سے تجاوز کر چکا تھا۔ اپنے پروردگار کے آگے بصد عجز و نیاز ہاتھ پھیلا کر

اپنی اولاد کے حق میں دعائے خیر طلب کر رہے ہیں۔ بڑے ادب اور حرمت کا محل ہے۔ عاجز مخلوق قادر مطلق خالق کے سامنے اپنے دل کی آرزوئیں پیش کر رہا ہے۔ دعا سے فراغت ہونے کے بعد یہ بزرگوار قلم ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اور اپنے روزنامچہ[ے] ۲۹ر ستمبر ۱۸۵۵ء میں حسب ذیل اندراج کرتے ہیں۔

"اکنوں بعد نماز دعا درحق برخورداراں نور احمد چشتی و محمد علی چشتی و حامد علی چشتی وغیرہ کردم۔ اللہ تعالیٰ ایشاں را محتاج نہ کند و مقضی المرام دارد۔ اولاد بسیار بخشاد۔ وہمہ با خدا باشند۔ وطریق اہل چشت را از دست نہ دہند۔ و پرہیزگاری کنند۔ و حرام نخورند۔ دوستدار اہل بیت رسول باشند و تعظیم اصحاب کنند و راست گو باشند"

یہ بزرگوار عمدۃ الکاملین زبدۃ العارفین فخر الشعراجناب مولوی احمد بخش صاحب چشتی نور اللہ مرقدہٗ ہیں۔ جو اپنے لاڈلے پوتے حامد علی کیواسطے جن کی عمر ابھی دو سال کی بھی نہیں ہے دست بدعا ہیں بارگاہ ایزدی میں دعا مستجاب ہوئی۔ مولوی حامد علی صاحب خدا اُن کی عمر میں برکت دے بڑے ہوئے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ پرہیزگاری اور تقویٰ اور اخلاق حسنہ جیسا کہ جد امجد کا جی چاہتا تھا حاصل ہوئے۔ اولاد سے بھی خدا نے مالا مال کیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے عبد الرشید مرحوم مولوی حامد علی صاحب کے منجھلے فرزند تھے۔ ۷ر اپریل ۱۸۵۶ء کو پیدا ہوئے مولوی احمد بخش صاحب اس وقت حیات نہ تھے۔ البتہ مولوی محمد علی

ے جناب ممدوح نے علاوہ دیگر کثیر تحریرات کے فارسی میں ایک روزنامچہ قریباً مسلسل پچاس سال تک لکھا ہے۔ جو جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے۔ اُس زمانہ میں جبکہ وہ لکھا گیا

صاحب پُردل موجود تھے اُنھوں نے اپنے سعادتمند بیٹے مولوی حامد علی صاحب کو دفتر میں یہ مژدہ تولد فرزند پہنچایا۔ اکلوتے بیٹے کی اولاد جسقدر بھی پیاری ہو کم ہے۔ چنانچہ مولوی حامد علی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "اُس وقت جو مسرّت میرے والد ماجد کے بشرہ سے ظاہر تھی وہ میری نظر کے سامنے پھر رہی ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس خوشی کے موقعہ پر گھر میں خوب گھما گھمی رہی ہوگی۔ گھر والوں کو کیا معلوم تھا کہ اس بچّہ کی پیدایش پر جو یہ مکان آج خوشی کے نعروں سے گونج رہا ہے جس میں آج مسرّت کے نغمے اور گیت گائے جارہے ہیں صرف ۲۹ برس بعد اسی مکان میں اس کی جوان مرگی پر نالہ و فغاں کا کہرام مچیگا اور غم کے دردانگیز نوحے در و دیوار سے بلند ہوں گے +

اس لاعلمی میں بھی ایک بڑی مصلحت پوشیدہ ہے۔ خوشی اور غم کا پلڑا انسانی زندگی میں زیادہ تر اس لاعلمی کیوجہ سے برابر رہتا ہے اُمید کے سہارے سفر ہستی کا کٹھن راستہ بآسانی طے ہو جاتا ہے۔ مستقبل کی لاعلمی حال کی خوشیوں کا لطف قایم رکھتی ہے۔ ورنہ شاید اس دارالمحن میں جس میں زندگی اکثر اک بڑا پُر آلام فسانہ ہوتی ہے۔ مایوسی کا سنگ سخت ابتدا ہی میں دل نازک کو پاش پاش کردے اور وہ بڑا مقصد جو مشیّت ایزدی میں ہے تکمیل کو نہ پہنچے۔ یعنی انسان اُس مفید تربیت اور سبق سے محروم رہجائے جو اس زندگی میں عیش و مصیبت خوشی اور غم سے حاصل ہوتا ہی۔

ایک ایسے خاندان میں پیدا ہونا جو شریف علم دوست ذی فہم اور نیک وضع ہو بڑی بھاری نعمت ہے اور یہ نعمت عبد الرشید کو بھی نصیب ہوئی اور اُسکی تربیت و پرورش بوجہ احسن کیگئی - پڑھنے کے وقت پڑھنا - کام کے وقت کام - کھیل کے وقت کھیل - سیر کے وقت سیر - غرض جو اصول عمدہ تربیت اور پرورش کے ہیں - لایق باپ اور شفیق دادا نے عبد الرشید کی پرورش میں مدنظر رکھے بعض زائد از ضرورت محتاط خاندانوں میں بچوں پر حد سے زیادہ تنبیہ اور تاکید و نگہداشت اور روک تھام رکھی جاتی ہے - اُن کو پوری آزادی باہر آنے جانے اور کھیل کود سیر تماشے کی نہیں دی جاتی - اس طرز عمل سے اکثر اوقات نہایت مضر نتائج مرتب ہو جاتے ہیں جو والدین کی خواہش کے بالکل خلاف ہوتے ہیں - اوّل تو وہ بچّے جو اس طرح پرورش کیئے جائیں کوئیں کے مینڈک کی طرح اس دنیا سے ناواقف رہتے ہیں جسمیں آخر کار داخل ہو کر اُن کو عمر گزارنی ہی ایسے بچّوں میں سے ہمّت بلند - جودت طبع - خود اعتمادی مفقود ہو جاتی ہے - اور ایک قسم کی تنگ نظری بے معنی تمکنت اور نازیبا خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے - دوسرے یہ کہ ایسے بچوں کو جب اتفاقات زمانہ سے آزادی نصیب ہو جاتی ہے تو چونکہ وہ اس دولت کے عادی نہیں ہوتے تو دو لتوں کی طرح عموماً آزادی کی دولت کا بُرا استعمال کرتے ہیں اُنکی خیرہ آنکھیں آزادی کے آفتاب کی پرزور شعاعوں کی تاب نہیں لاسکتیں اور آخر کار وہ ایسی افسوسناک غلطیاں کرتے ہیں کہ جنکی ابتداء عمر میں

اُن سے توقع نہ کیجاتی تھی اور ایسے لہو ولعب میں سرتاپا غرق ہو جاتے ہیں جن سے روکنے کیلئے اُن کے والدین ایّام طفولیت میں بڑی احتیاط اور کوشش کرتے تھے۔ انگلستان میں مشہور ہے کہ پادریوں کے بیٹے لامذہب ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ہزار ہا نظیریں ملیں گی جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ زیادہ محتاط ثقاۃ اور مولویوں کے بیٹے عموماً فاسق اور بدوضع ہوتے ہیں۔ جن بچوّں پر تحصیل علم کی بڑی مار دھاڑ رہتی ہے۔ وہ عموماً جاہل رہجاتے ہیں۔ اور جو باپ سوڈا واٹر کی بوتل پینا گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں اُنکی اولاد شراب کے خُم کے خُم خالی کردیتی ہے۔ اِسکے برعکس بعض بے پروا خاندانوں میں بچوّں کو حد سے زیادہ آزادی دیجاتی ہے۔ اور لاڈ کی وجہ سے کبھی بھی بُری باتوں سے روکا نہیں جاتا خواہ وہ کیسی ہی ناشایستہ و نا ملائم حرکات کریں۔ بلکہ کسی غیر کا منع کرنا بھی ناگوار گذرتا ہے۔ ایسے حالات میں بچے عموماً سرکش واہی اور ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ اور وہ ماں باپ جو لاڈ پیار کیوجہ سے پہلے لڑکے کے خصائل کی بُنیاد خراب کرچکے ہیں۔ بعد میں اُس کی تباہ شدہ زندگی دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ غرضیکہ اس بارہ میں افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو میانہ روی اور اعتدال کیساتھ اپنے بچوّں کو تربیت دیتے ہیں۔ نیکی کے اُصول قول اور فعل سے روزانہ زندگی میں اپنے بچوّں کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں اور پھر اپنی تربیت پر بھروسہ اور اعتماد رکھکر بچے کو جائز آزادی بھی دیتے ہیں۔ تاکہ

اُس کو بلا مدد غیرے اُن اُصولوں پر عمل کرنے اور کام میں لانے کا
ابتدائے عمر ہی سے موقعہ ملتا رہے اور اِس طرح وہ نیکی کے اُصول جو
اُس نے سیکھے ہیں اور بھی مضبوطی کے ساتھ اس کے دل پر نقش
ہو جاویں ۔ تاکہ آئندہ زندگی کی آزمایش کا طوفان اُن نشانات
کو محو نہ کر سکے ۔ خوش قسمتی سے عبدالرّشید کی تربیت خاندان کے
لائق سرپرستوں نے ایسے احسن طریق پر کی کہ نکوکاری ادب ۔ محنت
خوف خدا ۔ خود ضبطی اور خودداری کی عادتیں ۔ ابتدائے عمر ہی سے اُسکی
طبیعت میں اچھّی طرح مستحکم ہوگئی تھیں ۔ فطرۃً بھی عبدالرّشید کی طبیعت
ملائم ۔ متحمّل ۔ نیک ۔ ایثار پسند واقع ہوئی تھی ۔ اچھّی تربیت سونے کو
سُہاگہ ہوگئی ۔ اور رفتہ رفتہ بلند نظری ۔ فیاضی ۔ راستبازی ۔ جفاکشی
وفاداری ۔ استقلال ۔ محبّت ۔ تواضع ۔ بُردباری ۔ رحم ۔ علم دوستی
ادب ۔ انکسار اور دیگر خوبیاں ۔ جو انسان کو شریف ۔ قابل قدر ۔
باعزّت و باعظمت بناتی ہیں اُس کی خصلت میں نشو و نما پا گئیں ؛
بعض خاندانوں میں بچّے پڑھنے سے بھاگتے ہیں ۔ غالباً اِسکی
وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ پڑھنے کا شوق بچّوں کے دلوں میں ابتدا سے
رفتہ رفتہ پیدا نہیں کیا جاتا ۔ جب بچّہ پانچ چھ سال کا ہو تو یکایک
اُستاد کے سپرد ۔ اب پڑھائی پر بچّہ کی طبیعت لگنی مشکل ۔ اگر بدقسمتی سے
تُند مزاج ۔ ناقص اُستاد ملا تو اُس نے اپنے طریق تعلیم سے بچّہ کا دل اور
بھی اوچاٹ کر دیا ۔ کتاب اور تختی اُسکے لیے گویا کوئی سخت ڈراؤنی

چیز بجاتی ہی۔جس سے بچّہ بھاگتا ہی۔ ناقص اور بے سمجھ اُستادوں کی مار دھاڑ کی وجہ سے ہزار ہا بچّے پڑھائی سے مُتنفّر ہو کر ایسے بھاگتے ہیں کہ پھر تمام عمر پڑھنے کا نام نہیں لیتے۔جن خاندانوں میں پڑھنے لکھنے کا چرچا ہمیشہ رہتا ہی وہاں بچّے عموماً خود ہی پڑھنے کے شوقین ہو جاتے ہیں اور تحصیل علم کو کوئی آزار دہ اور پُر تکلیف کام نہیں سمجھتے۔ اگر شفیق ماں یا شفیق بھائی بہن یا شفیق باپ بچّہ کو اُستاد کے پاس بٹھانے سے پیشتر خود حروف شناس بنا دیں تو پھر بچّہ کی طبعیت پڑھنے پر بآسانی لگ جاتی ہے جس خاندان میں علم کی قدر کیجاتی ہی وہاں بچّے قُدرۃً تحصیل علم کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مٹّی کے کھلونوں کے بجائے کتاب اور قلم دوات سے کھیلتے ہیں۔عبدالرّشید کو حروف شناسی تین چار برس کی عمر ہی میں شفیق والدین اور جدّ بزرگوار کی توجہ سے ہو گئی تھی۔ ۱۱ر نومبر ۱۸۸۱ء کو جب قریباً ساڑھے چار برس کے تھے تو محلّہ کی مسجد میں حافظ عبدالعزیز مرحوم کے پاس پڑھنے بٹھائے گئے۔اور ساڑھے دس برس کی عمر تک قریباً چھ سال وہ پڑھائی پڑھتے رہے جو مکتبوں میں عموماً پڑھائی جاتی تھی۔اور اب تک پڑھائی جاتی ہی اور جسمیں باوجود انقلابات زمانہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔خواہ اپنی جگہ اور اپنے زمانہ میں مکتب کیسے ہی مفید ثابت ہوئے ہوں۔اس میں شک نہیں کہ ان میں بعض نہایت ظاہر اور ناگوار نقص ہیں۔مکتبوں میں وقت کی پُوری قدر نہیں ہوتی۔جماعت بندی نہ ہونے کیوجہ سے ہر ایک بچّہ کا

سبق جُدا جُدا ہوتا ہی۔ اور جب ایک بچّہ کو پڑھایا جاتا ہی تو باقیوں کا وقت ضائع ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں مکتب عام طور سے ایسے اشخاص کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو خود طریق تعلیم اور اُصول تربیت سے ناواقف ہوتے ہیں ❋ قرآن شریف کا ابتدا میں پڑھانا ایک دیرینہ دستور ہے اور نہایت مبارک سمجھا جاتا ہے مگر بچّہ کو ابتدا سے یہ عادت ہو جاتی ہے کہ وہ عبارت دیکھکر پڑھتا رہے اور اسکا مطلب نہ سمجھے۔ یہ عادت شاید کچھ غیر مفید ہی ہوتی ہی طوطے کی طرح کسی کتاب کو رَٹ لینا اور مطلب نہ سمجھنا نہ سمجھنے کی کوشش کرنا ایسا عمل ہی جس سے شائید وہ تحقیق کا مادّہ جو بچّوں میں فطرتاً پایا جاتا ہی کسی قدر کُند ہو جاتا ہی۔ تاہم مکتب اگر لایق اُستاد کے ہاتھ میں ہو تو بہت سے نقائص جو قابل علاج ہیں رفع ہو سکتے ہیں۔ مولوی عبدالعزیز مرحوم ایک قابل اُستاد تھے۔ اور اُن کی شفقت اور توجّہ سے عبدُالرّشید نے اُس مکتب سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ قرآن شریف ختم اور معمولی اُردو لکھنا پڑھنا کسی قدر آگیا۔ مگر اِس علم پر فریفتہ بچّہ کو تحصیل علم کا شوق ہمیشہ بےچین رکھتا تھا۔ گھر پر بیکار وقت ضائع کرنا اِسے شاق تھا۔ چنانچہ ایک دن رُقعہ لکھکر اپنے جدِّامجد کے تکیئے کے نیچے رکھ آئے اور والدہ سے آکر کہنے لگے کہ بابا میاں جی کے تکیہ کے نیچے ایک رُقعہ رکھ آیا ہوں والدہ نے مضمون پوچھا تو جواب دیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائیگا اِسی اثناء میں جب مولوی محمد علی صاحب باہر سے واپس آئے تو سرہانے رُقعہ رکھّا ہوا دیکھا۔ ہنستے ہنستے اوپر آئے اور کہا کہ عبدُالرّشید لکھتا ہی کہ

جب میں آپ کے پاس نیچے آتا ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ اوپر اپنی والدہ کے پاس جاؤ۔ جب اوپر اپنی والدہ کے پاس آتا ہوں تو وہ فرماتی ہیں کہ نیچے اپنے دادا صاحب کے پاس جاؤ اور کچھ پڑھو۔ یہ کبڈی گھر بیٹھ کر کب تک کھیلتا رہوں گا۔ کیا مجھے کچھ پڑھنا نہیں ہے؟

اس رُقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالرّشید ۳ ستمبر سنہ ۱۸۸۴ء کو گورنمنٹ برانچ سکول میں داخل کر دئیے گئے اور رفتہ رفتہ جنوری سنہ ۱۸۹۱ء میں اُنھوں نے مڈل پاس کر لیا۔ عبدالرّشید کے طفلی کے حالات کی بابت اُن کے والد بزرگوار رقمطراز ہیں کہ "اُن کی طبیعت بہت ذکی اور حافظہ نہایت ہی تیز تھا۔ ابھی اُنھیں انگریزی شروع نہیں کرائی گئی تھی اور عبدالرحمن (فرزند اکبر) انگریزی کی پہلی کتاب پڑھتے تھے۔ جاڑوں کی راتوں میں دونوں کو کچھ پڑھایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے بارہا کئی الفاظ پڑھانے کے چار روز بعد عبدالرحمن سے پوچھے گئے تو اُنھیں یاد نہیں ہوتے تھے مگر وہ حضرت جو صرف سُنتے ہی رہتے تھے جھٹ بتا دیتے تھے۔ مجھے اس سے نہایت حیرت ہوتی تھی۔ عبدالرّشید کوئی سات آٹھ سال کے تھے کہ سیڑھیوں سے گر پڑے۔ ڈیوڑھی میں کوئی لوہے کی چیز رکھی تھی جس سے اُن کا سر بالکل پھٹ گیا۔ اور بھیجا دکھائی دینے لگا۔ بہت خون ضائع ہوا۔ سر میں ٹانکے لگائے گئے اِس حادثہ سے وہ کچھ نحیف ہو گئے۔ مگر طبیعت بھدّی نہیں ہوئی"۔ اِس دماغی صدمہ کو جو اوائل عمر میں عبدالرّشید کو پہنچا تھا۔ بعد میں وہ ہمیشہ

نہائیت افسوس کے ساتھ یاد کیا کرتے اور اِس کو اپنی بڑی بدقسمتی سمجھتے تھے ۔

مڈل پاس کرنیکے بعد طبعی رجحان اور قومی خیال کیوجہ سے عبدالرّشید اپنی خواہش سے اسلامیہ ہائی سکول میں جو حال ہی میں کھلا تھا داخل ہوگئے۔ اور وہاں نہایت محنت سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور آخرکار مارچ ۱۸۹۲ء میں امتحان انٹرنس میں کامیاب ہوئے اِس زمانہ میں جب راقم الحروف بھی ۱۸۹۱ء میں اسی اسکول میں داخل ہوا تھا تو مرحوم سے تعارف پیدا ہوا تھا۔ جو رفتہ رفتہ دوستی اور برادرانہ یک دلی تک پہنچ گیا۔ اس تعلّق پر مجھکو ہمیشہ فخر و ناز رہیگا۔ موت عبدالرّشید کو ہم سے جُدا کر سکتی ہے۔ مگر اُسکے خیال کو اُس کی محبّت اور دوستی کی یاد کو میرے دل سے اور اُس کے دیگر احباب کے دل سے کبھی نہیں مٹا سکے گی۔ اور ایسی پاک دوستی جو ابتدائے عمر میں دُنیوی لوث اور خود غرضی کی لاگ کے بغیر فطرتی رجحان کیوجہ سے قائم ہوئی تھی مٹا دینے والے زمانہ کی دستبرد سے ہمیشہ کیلئے محفوظ رہیگی اِس زمانہ کی دوستی نہایت مبارک اور خالص دوستی تھی جسمیں پیمانِ وفا عمر بھر کیلیے باندھا گیا تھا۔ مگر افسوس کہ عبدالرّشید کی زندگی ہی نے وفا نہ کی۔ اُستاد غالب کے چند اشعار جو حسب حال ہیں بے اختیار زبان قلم پر آتے ہیں۔

ے

عُمر بھر کو تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا	عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آبِ ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسا گاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تسپر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

ہزاروں منصوبے آئندہ زندگی کے متعلق باندھے تھے جو عبدالرشید کی بیوقت موت سے خاک میں مل گئے۔ ایک سچے انیس اور رفیق سفر کی موت نے اِس راہ ہستی کو نہایت دشوار اور کٹھن بنا دیا۔ سفر تو ضرور پُورا ہوگا۔ مگر بے لطفی کے ساتھ۔ عرصہ تک ایک دل تھا جو کئی سینوں میں حرکت کرتا تھا۔ چند پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو ایک ہی بندھن سے محبت اور ہمخیالی کے بندھن سے بندھا ہوا تھا۔ حادثاتِ زمانہ سے کئی پھول پیش از وقت کملا کر جھڑ گئے عبدالرشید بھی اُنہیں پھولوں میں سے تھا کچھ پھول پتیاں باقی رہگئی ہیں۔ خدا اُن کو بادِ گرم سے بچائے مگر سچ تو یہ ہے کہ اب گلدستہ کی وہ رونق اور وہ بہار وہ خوشبو اور وہ تازگی ہی نہ رہی جو پہلے تھی۔

اے پیارے طالب علمو! تم جو اب مدرسوں اور کالجوں میں پڑھتے ہو اپنے دوستوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کو کام میں لاؤ۔ تمھارے دوست تمھاری آئندہ زندگی کو بہت اچھا یا بُرا بنا سکتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے تمھیں نیک اور خالص دوست ملجاویں تو اُنکی

دوستی کو سرسری چند روزہ اور عارضی مت سمجھو جو مدرسہ یا کالج چھوڑنے پر ختم ہو جائیگی۔ بلکہ اُن کی دل سے قدر کرو۔ کیونکہ ایسے دوست اِس دنیا میں بڑی نعمت ہیں۔ تمھارے دُکھ درد کے شریک۔ تمھاری خوشیوں کو دوبالا کرنے والے۔ تمھارے غم کو بٹانے والے۔ کبھی قول یا فعل سے اُن کی دلشکنی اور دل آزاری مت کرو۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے شائد تمہیں تلافیِ مافات کا موقعہ نہ ملے اور تمام عمر پشیمانی اُٹھانی پڑے ؛

غنیمت شمر صحبت دوستاں
کہ گُل پنج روز ہست در بوستان

دلداری دراصل کچھ مشکّل کام نہیں ہے۔ ذراسی توجّہ۔ ذراسی ہمدردی سے تم دلوں کو تسخیر کر سکتے ہو اور ہمیشہ کیلیئے اپنا گردیدہ بنا سکتے ہو۔ ذراسی بے توجہی ذراسی خود غرضی سے دو دل پھٹ جاتے ہیں۔ اور ایسے پھٹتے ہیں کہ پھر ملنا مشکل ہے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

فصل سوم

کالج کی تعلیم

اے علم وفضل کے معبد۔ اے تعلیم وتربیت کے مندر۔ اے کالج تیرے پجاری تیرے مجاور۔ تیرے فیض نشان آستان کے آگے ہمیشہ سر عجز جھکائے ہوئے ہیں۔ تیرے درو دیوار ملک کے منتخب نوجوانوں کی بہترین اُمیدوں۔ اُمنگوں۔ آرزوؤں اور تمنّاؤں کی خوشبو سے بسے ہوئے ہیں۔ تیری ہر اینٹ کاخِ ذہانت وذکاوت کا پایہ ہے تیرا ہر گوشہ ہنر وکمال کا مرکز۔ تیرا ہر ذرّہ ایک آفتاب ہی جو دل و دماغ کو منوّر کرنے والا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کو تیری درگاہ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ جن کو تیری پرستاری کا افتخار نصیب ہوا۔ تیرے ہر شجر وحجر تیرے ہر گوشے ہر کونے سے۔ تیرے ذرّے ذرّے سے کیسے کیسے نیک اور پاک خیال علمی اور ادبی مباحثے۔ دلپذیر اور دلچسپ صحبتیں وابستہ ہیں۔ اہلِ بینش اور اہلِ دل کیلئے یہ ہمیشہ کیواسطے جیتی جاگتی تصویریں رہیں گی۔ اور انقلاب روزگار کا ظالم ہاتھ اُس

بیش قیمت ورثہ کو جو دل اور دماغ کو تیری بارگاہ سے حاصل ہوا ہے کبھی
چھین نہ سکے گا۔ عبدالرّشید بھی تیری درگاہ کا ایک ادنیٰ خادم تھا۔ فنا
کے ازلی قانون نے اپنا جزیہ اُس سے وصول کیا۔ مگر جو ورثہ تیری
درگاہ سے مرحوم کو ملا تھا فنا کے ہاتھ سے محفوظ ہے۔ وہ دل وہ
دماغ خاک میں ملگیا۔ مگر اُن کی روشنی جو تیری منبعِ انوار سے عطا
ہوئی تھی اب تک قایم ہے اور ہمیشہ قایم رہیگی۔

عبدالرّشید امتحان انٹرنس سے فارغ ہونے کے بعد مشن
کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ممکن ہے کہ لیاقت اور قابلیّت اور
باقاعدہ محنت میں بہت سے طالب علم اُن سے بہتر ہوں مگر مجھے
یقین ہے کہ تحصیل علم کا سچّا شوق جو عبدالرّشید کے دل میں موجزن
تھا ایسا شوق بہت کم طالب علموں کو ہوتا ہے۔ رضابی کتابوں کے
علاوہ دیگر کتب علم وادب کے مطالعہ کا مرحوم کو چسکا تھا۔ یہی وجہ
تھی کہ رضابی کتابیں اور رضابی مضامینِ امتحان پر مرحوم کو پوری
طرح حاوی ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔ صحّت بھی کچھ اچھّی نہ تھی کہ زیادہ
محنت کی برداشت کرسکتی۔ سارا زور خارجی کتب کے مطالعہ پر صرف
ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک لحاظ سے بڑی غلطی تھی۔ اور مرحوم کو اِس
غلطی کیوجہ سے ناکامیاں بھی نصیب ہوئیں۔ مگر اب میں یہ سمجھتا
ہوں کہ اُس قلیل فرصت کے لحاظ سے جو مرحوم کو اِس دنیا میں ملی
اچھّا ہوا کہ اُنھوں نے اپنے دل کا شوق پورا کرلیا اور گو بعض دفعہ امتحانات میں

کامیابی نہوئی نظر تو وسیع ہوگئی جو خارجی مطالعہ بغیر نہ ہوسکتی۔
عبد الرّشید ۱۸۹۲ء میں امتحان انٹرنس میں شریک ہوئے اور کامیاب ہو گئے۔ اِس سال کارکنان انجمن حمایت اسلام نے باوجود سخت مخالفت کے جو تعلیم یافتہ پارٹی کیطرف سے کیگئی ایف۔اے کی جماعت کھول کر موجودہ اسلامیّہ کالج کی بنیاد ڈال دی۔ قومی خیال سے شائد مرحوم کا ارادہ بھی پہلے اسلامیّہ کالج ہی میں داخل ہونے کا تھا۔ چنانچہ اپنے دوست مولوی نجم الدین کو جو اُن کے پرانے رفیق اور ہم جماعت تھے اسلامیّہ کالج میں داخل ہونے کی ترغیب دی مگر بعد میں خود شائد اپنے والد ماجد کے زور دینے کی وجہ سے اسلامیہ کالج میں داخل نہو سکے۔ اور مشن کالج میں ایف اے کی تعلیم شروع کی۔ دو برس مشن کالج میں تعلیم پانے کے بعد ۱۸۹۴ء میں امتحان ایف۔ اے میں شریک ہوئے۔ مگر چونکہ صحت اچھّی نہیں رہتی تھی۔ اور باقاعدہ محنت نہیں کر سکتے تھے امتحان میں کامیابی نہوئی۔ چونکہ طبیعت نہایت متاثّر اور خود دار واقع ہوئی تھی گوارا نہ ہوا کہ دوبارہ مشن کالج میں داخل ہوں۔ اس لئے ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں ۱۸۹۵ء میں امتحان ایف۔ اے میں شریک ہوئے۔ مگر ریاضی سے قدرتی طور پر لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے امسال بھی کامیاب نہ ہوئے۔ اِس مرتبہ فیل ہونے کا مرحوم کو نہایت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اپنی ڈائری میں جو ۵

جو وہ کبھی کبھی لکھا کرتے تھے اِس مرتبہ اپنے فیل ہونے کے اسباب پر غور کیا ہے۔ ڈائری انگریزی میں ہے۔ اس میں سے کسی قدر ترجمہ کر کے درج ذیل ہے۔

"۲۸ر اپریل ۱۸۹۵ء

"نتیجہ امتحان ایف اے پنجاب یونیورسٹی آج نکلا اور میں دوسری مرتبہ فیل ہوا۔"

"۲۹ر اپریل ۱۸۹۵ء

"میں کیوں فیل ہوا؟ ایک ہی بڑی وجہ ہے۔ ریاضی کا قُدرتی طور سے مذاق نہونا میں یوں کہتا ہوں کہ اوّل روز سے کہ جب میں مدرسہ میں داخل ہوا جب سے مجھے ریاضی سے کچھ تنفّر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تنفّر قدرتی نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہو کہ ابتدا میں مناسب طریق پر راستہ پر نہیں لگایا گیا۔ حساب کے ابتدائی قواعد اور گُر کسی نے مجھے اچھّی طرح نہیں سکھائے۔ اور پُختہ بنیاد قایم نہ کی بعد میں جو کچھ سیکھتا ہوں وہ ایک ایسے قلعہ کی مثال ہے جو مضبوط چٹان پر نہیں۔ بلکہ ریت پر بنایا جاوے۔

اَور بھی کئی وجوہات فیل ہونے کے خیال میں آتے ہیں۔ مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ گذشتہ سرما میں میں نے بہ لسنبت پہلے سالوں کے زیادہ محنت کی تھی تو یہ سب خیال کافور ہو جاتے ہیں۔"

اِسی روزنامچہ میں اپنی کم استقلالی اور ارادہ کی کمزوری کی بھی شکائیت کرتے ہیں۔ مگر اِس مرتبہ عبدُالرّشید کے فیل ہونے کی اصلی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ اُن کو ریاضی سے مذاق نہ تھا ورنہ محنت کرنے میں اُنھوں نے کوئی فروگذاشت نہیں کی تھی۔ جو شخص محنت کرنیکے بعد فیل ہوا اور دوسری مرتبہ فیل ہو۔ اور فیل ہونیکے دن یا دوسرے دن ہی ایسے اطمینان کے ساتھ فلسفیانہ طریق پر اپنے فیل ہونیکے اسباب کے متعلق غور کرے جیساکہ عبدُالرّشید کی ڈائری سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو ایسے شخص کی نسبت یہ کہنا بیجا نہو گا کہ وہ بلحاظ حوصلہ مندی خود ضبطی اور عقل سلیم کے خاص امتیاز رکھتا تھا۔

امتحان ایف اے میں ریاضی کا لازمی مضمون قرار دینا یونیورسیٹیوں کی ایک قابل افسوس غلطی تھی۔ جن لوگوں کو قدرتی مذاق اور مناسبت ریاضی سے نہو اُن کو اعلیٰ ریاضی سیکھنے پر مجبور کرنا نہایت ظلم تھا۔ اِس نقصان کا اندازہ کرنا کہ جو اِس تعلیمی غلطی کیوجہ سے ہوا ہے شائد نا ممکن ہے۔ ہزارہا طالب علموں کی زندگیاں اِس غلطی کی وجہ سے تلخ ہو گئی ہیں۔ عمریں ضائع اور برباد ہو گئیں۔ ہزارہا منصوبے ایک امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سے خاک میں مل گئے۔ بہت سے طالب علموں نے مایوسی کیوجہ سے تعلیم کو خیرباد کہا۔ بعض منچلے کم ہمّت طالب علموں نے شرمِ ناکامیابی سے بچنے کیلیے خودکشی میں پناہ لی۔ بہت سی صحتیں ہمیشہ کے واسطے ناکارہ ہو گئیں۔ یہ سب محض ایک ادنیٰ تعلیمی غلطی کا

نتیجہ ہوا۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے طریقۂ امتحان میں کئی قابل افسوس غلطیاں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہو کہ بہت سے طالب علم چند مضامین میں امتحان دیتے ہیں مگر صرف ایک مضمون میں فیل ہوجانیکی وجہ سے اُن کو تمام مضامین میں اگلے سال دوبارہ امتحان دینا پڑتا ہے اِس قاعدہ کی تائید اور حمایت بالکل ناممکن ہے۔ یہ قاعدہ سراسر ظالمانہ اور فضول ہے۔ ایک طالب علم کا ذکر ہے کہ اس نے چار مرتبہ الیف اے کا امتحان دیا اور ہر مرتبہ صرف ایک نئے مضمون میں فیل ہوتا رہا۔ جس میں پہلے فیل نہ ہوا تھا۔ یعنی اس طرح سے کہ اگر پہلے سال انگریزی میں تو دوسرے سال ریاضی میں۔ تیسرے سال فارسی میں۔ چوتھے سال فلسفہ میں۔ اس طرح پر گویا چار سال میں تین مرتبہ اس طالب علم نے جملہ مضامین میں امتحان پاس کرلیا۔ مگر چونکہ چاروں مضامین میں ایک ہی سال پاس نہیں کیا اس لئے ہمیشہ امتحان میں ناکامیاب رہا اور سرٹیفکٹ سے محروم۔ ایسے طالب علم کی نسبت یہ کہنا کہ اس کو ہر ایک مضمون میں الیف اے کی لیاقت نہ تھی ظلم ہے۔ کیونکہ تین مرتبہ اِس نے ہر مضمون میں پاس کرلیا۔ ایسے طالب علم کو فیل رکھنا اور سرٹیفکٹ نہ دینا محض ایک غلط قاعدہ امتحان پر مبنی ہے۔ جس کی رو سے بلا ضرورت طالب علموں کو اُن مضامین میں جنمیں وہ پاس کرچکے ہیں دوبارہ امتحان دینے پر مجبور کیا جاتا ہو۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے

کہ یہ تعلیمی غلطی بھی جو نہایت مضر اور غیر ضروری سختی پر مبنی ہے ہماری یونیورسٹی کے قواعد سے رفع کردی جائے اور طالب علموں کو جو پہلے ہی بیشمار کتابوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں بیکار زحمت سے نجات ملے۔ ایک امتحان کو بتدریج (By compartments) پاس کرنیکی اجازت دینا ایک ایسا اُصول ہے جسپر یورپ کی اکثر یونیورسٹیاں کاربند ہیں۔ اور اِس اُصول کو تسلیم کرنے میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو مضائقہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

عبدُالرّشید نے سنہ ۱۹۰۶ء میں پھر گورنمنٹ کالج سے امتحان ایف اے دیا اور اب کی مرتبہ پاس ہوگئے۔ پاس ہونیکے چندروز بعد اُنکی شادی بھی ہوگئی گویا دُنیوی ذمّہ داریوں کا بوجھ سر پر آپڑا۔ مرحوم اِس ذمّہ داری کو بہت وقعت دیتے تھے۔ شادی کے بعد طبیعت میں متانت بہت کچھ بڑھ گئی اور گو وہ اپنی شادی سے بہت خوش تھے اور تاہل کی زندگی کو نہایت پسند کرتے تھے۔ اِس زندگی کی ذمّہ داریوں اور فرائض کے خیال اور پیچیدگیوں نے ایک قُدرتی متین طبیعت کی متانت کو افسردگی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ متواتر علالت نے بھی طبیعت کو بالکل بجھا رکھا تھا مگر مرحوم بڑی ہمّت اور محنت سے بی۔ اے کی تعلیم پوری کرنے میں مصروف ہوگئے اور چونکہ بی۔ اے میں ریاضی کی لازمی پرچہ نہ تھی۔ اِس لیئے سنہ ۹۰ کے ہی امتحان بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ سوائے ریاضی کے باقی

مضامین سے خصوصاً زباندانی اور فلسفہ سے مرحوم کو خاص مناسبت تھی انگریزی لکھنے اور بولنے میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ حاصل کی تھی طرزِ تحریر اور طرزِ بیان ہمیشہ سادہ تھا۔ مگر پُرزور۔ اُردو لکھنے اور بولنے میں بھی نہایت درجہ روانی اور سادگی مدنظر رکھتے تھے۔ زمانۂ تعلیم کالج میں اکثر جواب مضمون اُردو اور انگریزی میں نہایت خوبی کے ساتھ لکھتے اور اپنے پروفیسروں اور دیگر قدردانوں سے تحسین وآفرین لیتے عبدالرّشید کے دل میں تحصیل علم کا سچّا شوق تھا اور تعلیم نے اُس کے دل و دماغ اور خصائل پر اپنا نہایت عمیق اور مبارک اثر اچھّی طرح سے ڈالدیا تھا اور وہ علمی رنگ میں ایسے رنگ دیئے گئے تھے کہ اُن کے قول اور فعل سے اِسکی چمک ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ جلسۂ کانووکیشن پنجاب یونیورسٹی سنہ ۱۸۹۰ء میں بی۔ اے کی ڈگری حسب قاعدہ اُن کو عطا کیگئی۔ اور میں نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرّشید کو استحقاق اِس عزت کے حاصل کرنیکا دیگر بہت سے لوگوں کی نسبت جن کو ہر سال جبکہ فضیلت عطا ہوتا ہے بہت زیادہ تھا۔

فصل چہارم

کسب معاش اور انتقال

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیکے بعد کسب معاش کیلئے کیا کرنا چاہیئے۔ ایک ایسا بیڈھب سوال ہی جس کا جواب ایک نہایت مشکل امر ہے ملک کے اہل الرائے اِس مسئلے کے حل کرنیکے لیے عرصہ سے دماغ سوزی کر رہے ہیں۔ مگر بعض وجوہات سے ہندوستان میں یہ مسئلہ ایک معمائے لاینحل بن رہا ہے۔ عام لوگ درحصل ابتک اعلیٰ تعلیم کے مقصد ہی کو نہیں سمجھے۔ وہ اِسے کسبِ معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ایک عرصہ تک اعلیٰ تعلیم کسبِ معاش کا ذریعہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ مگر یہ ذریعہ خاص حد تک محدود ہے۔ بعض عالمانہ پیشے مثل قانون۔ طبابت۔ انجنیری اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہیں۔ بعض اعلیٰ عہدے اور سرکاری ملازمتیں بھی اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد ملسکتی ہیں اور پہلے بکثرت ملتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ جوں جوں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اِن اعلیٰ پیشوں اور عہدوں میں جنگی

تعداد محدود ہے گنجایش کم رہتی جاتی ہے۔ اور اِن میں داخل ہونا یا داخل ہو کر کامیابی حاصل کرنا دشوار امر ہوتا جاتا ہے۔ اِس دشواری کی وجہ سے تعلیم یافتہ فرقہ میں ایک قسم کی بے صبری اور نارضامندی انتظام موجودہ کے خلاف پیدا ہوتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کو بھی اُس بے صبری اور نارضامندی سے گونہ خطرہ کا سامنا ہے۔ چنانچہ دفع مقدر کے طور پر یونیورسٹی کمیشن نے بعض ایسی قیود لگا دی ہیں جن کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم اِسقدر عام نہو جائے کہ کساد بازاری میں پڑ جائے اور خواہ مخواہ کی نارضامندی نقص امن اور بغاوت کا رنگ پکڑ جائے ٭

جو لوگ محض کسب معاش کیلئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں اگر وہ آج تعلیم چھوڑ دیں تو جائے مسرت ہی "خس کم جہاں پاک"۔ یہ دوسری بات ہی کہ اعلیٰ تعلیم پا کر ضمناً انسان اعلیٰ عہدہ پر بھی پہنچ جائے مگر علم کو دھاتوں اور پتھروں کو جمع کرنے کی غرض سے تحصیل کرنا ایک ایسا کمینہ خیال ہے جو ہرگز ہمدردی اور امداد کا مستحق نہیں۔ کیا وہ دماغی اور روحانی فائدہ۔ وہ تربیت اخلاق و ذہن جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ بجائے خود ایک بیش بہا دولت نہیں ہے جو سیم و زر لعل و جواہر سے ہزار درجہ افضل ہی کہ روپے کے ناپاک خیال سے اِس اعلیٰ اور ارفع مقصد کو ذلیل کیا جائے۔ اگر روپیہ کمانا ہی کسی کا مقصود ہی تو اِس کو اعلیٰ تعلیم کی ہرگز ضرورت نہیں۔ تجارت وغیرہ کے

دروازے کھلے ہیں روپیہ کماؤ اور چین کرو۔ البتہ اگر علم کا شوق ہے۔ اگر علمی دنیا میں امتیاز حاصل کرنا مقصود ہے۔ اگر اعلیٰ اور ارفع قسم کی زندگی بسر کرنا منظور ہے تو کالج کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ علم کے مندر میں داخل ہو اور فیض یاب ہو۔ اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ شائستہ اور مہذّب اقوامِ دنیا میں اس کا شمار کیا جائے۔ اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ اپنی سطح ذہانت کو اعلیٰ اور ارفع کرے۔ اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ صنعت اور تجارت اور ملکی دولت کے وہ خزانے کھلجائیں جس کی کنجیاں صرف علمی اور ذہنی قوّتوں کے ہاتھ میں ہیں تو اس قوم کا فرض ہے کہ معقول تعداد ایسے افراد کی پیدا کرے جو اعلیٰ تعلیم کو محض تعلیم اور ہنر کے شوق سے حاصل کریں۔ اعلیٰ تمدّنی زندگی بغیر اِسکے ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ علم کے شیدا عقل اور ذہانت کے پتلے۔ اخلاق مجسّم۔ علم دوست۔ کمال پسند لوگ ہی وہ روشن مرکز ہیں جہاں سے دور دور تمام ملک اور عوام الناس میں ترقّی اور تہذیب۔ شائستگی اور ہنرمندی کی روشنی پھیل سکتی ہے اور عموماً پھیلا کرتی ہے۔ ہندوستان میں جبتک ایسی متبرک اور قابل قدر و قابل تعظیم جماعت معقول تعداد میں پیدا نہو گی تمدّنی زندگی ادنیٰ درجہ کی رہیگی اور کسبِ معاش کا مشکل مسئلہ بھی حل نہو گا۔

عبد الرشید کی نسبت مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ علم کا شیدا تھا۔ اور اُس نے کالج کی تعلیم محض علمی اور اخلاقی شوق کیوجہ سے حاصل

کی ۔ افسوس ہو کہ کوئی دُنیوی فائدہ اُس تعلیم سے وہ حاصل نہ کر سکے
مگر دُنیوی فائدہ اس نیک نہاد نوجوان کو مدِّ نظر ہی نہ تھا۔ عبدُالرّشید
کو کالج کی تعلیم سے فارغ ہونیکے بعد فکرِ معاش ضرور تھی ۔ مگر اِسکی
وجہ صرف یہ تھی کہ مرحوم کی غیوّر طبیعت اس بات کو گوارا نہ کرتی
تھی کہ اپنے والد بزرگوار کو جو کثیرُ العیال تھے ۔ اپنے اخراجات سے
زیادہ دیر تک زیر بار کرے ۔ اگرچہ مولوی حامد علی صاحب کو ایسے
رشید فرزند کے اخراجات محبّت پدری کیوجہ سے کبھی بھی
ناگوار نہو سکتے تھے ۔ مگر عبدُالرّشید کی انصاف پسند اور غیوّر
طبیعت یہ کب مانتی تھی کہ وہ روپیہ جو اَب اُسکے چھوٹے بھائی
بہنوں کی پرورش پر خرچ ہونا چاہیئے اُسکے حصّہ ہی میں آتا رہے
اِس لیئے کالج کی تعلیم کے زمانہ میں بھی اور تعلیم کالج سے فارغ ہونیکے
بعد بھی وہ برابر اپنے اخراجات کیلئے کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش لگا ہی
رکھتے تھے اور اِسی خیال سے وہ مرنے سے پیشتر تک جبتک
کام کرنے کی تاب و طاقت رہی کام کرتے رہے ۔ گویا اُنھوں نے
اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنی جان قربان کردی ۔ شفیق والدین
اور مہربان بھائی اور عزیز دردمند دوست ہمیشہ اُن کو کام چھوڑنے
کی صلاح دیتے رہے بلکہ مجبور کرتے رہے ۔ مگر اُس غیوّر طبیعت کو
یہ ہرگز گوارا نہوا کہ جبتک جسم میں طاقت اور جان میں جان ہے
بیکار رہکر اپنا بار دوسروں پر ڈالے ۔ نیز چونکہ بیماری طول پکڑ گئی

تھی اُن کو یہ بھی خیال رہتا تھا کہ شائد بیکاری میں بیماری اَور بھی شدّت پکڑ جائے۔ کام کرنے سے محبّت تھی اور اپنا دل بہلانے کیواسطے اور بیماری کے ناگوار خیال کو ہٹانے کے واسطے بھی کام کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

ایّام طالب علمی میں مرزا جلال الدین جال بیرسٹرایٹ لا اور بعض دیگر رئیس زادوں کی اتالیقی کا کام تعلیم کالج کے بعد انجام دیتے رہے۔ تعلیم کالج سے فارغ ہونیکے بعد ۲۲ر نومبر ۱۸۹۸ء سے ۲۷ر اپریل ۱۸۹۹ء تک قریباً ۵ ماہ آبزرور پریس لاہور میں منیجر رہے پھر ایک مہینہ تک اسلامیہ کالج لاہور میں کام کیا چونکہ تعلیم و درس و تدریس سے خاص موانست تھی۔ بلکہ موروثی رُجحان تھا وُہ کسی موقعہ کو جو اِس شوق کے پورا کرنے کیلئے ملجاتا تھا ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں قریباً ۵ مہینے کے واسطے اسلامیہ سکول راولپنڈی میں عُہدۂ ہیڈ ماسٹری پر چلے گئے۔ اور ۱۹۰۲ء میں چند ماہ اسلامیہ سکول گوجرانوالہ میں بھی ہیڈ ماسٹری کے عُہدہ پر کام کیا۔ مگر لاہور کی علمی سوسائیٹی کی کشش اور خاندان کی محبّت نے باہر رہنے نہ دیا۔ لاہور واپس آ گئے۔ اِس وقت اخبار آبزرور لاہور کی سب ایڈیٹری خالی تھی۔ چنانچہ ۲۲ مئی ۱۹۰۲ء سے ۳۰ر نومبر ۱۹۰۳ء تک قریباً ڈیڑھ سال اِسی جگہ کام کرتے رہے۔ یہ کام بھی مرحوم کی طبیعت کے موافق تھا اور وہ اِس میں بہت

دلچسپی لیتے تھے۔ بعض نہایت لطیف اور قابلانہ مضامین اِس عرصہ میں اُنکی قلم سے نکلے جن کا ذکر بعد میں کیا جائیگا۔ آبزرور کے کام کے ساتھ گویا دنیا کے کام ختم ہوئے۔ ۳ر نومبر ۱۹۰۲ء کو علالت نے اسقدر شدّت اختیار کی کہ فرض منصبی کا ادا کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ چنانچہ مرض روز بروز طول پکڑتا گیا۔ اور آخرکار ۶ر مارچ ۱۹۰۳ء بروز جمعہ ۱۲ بجے دوپہر کو اِس جہانِ فانی کی کشمکش سے ہمیشہ کیلیئے چھوٹ کر اُس ملک بقا کی طرف راہی ہوئے جہاں نہ کسبِ معاش کا جنجال ہے نہ امراض و علالت کا وبال۔

مجھے اس بدنصیبی کا عُمر بھر قلق رہیگا کہ میں مرحوم کی اِس علالت میں اُنکی کوئی خدمت نہ کرسکا۔ خدمت تو درکنار میں کچھ ایسا بحالت خود گرفتار رہا کہ عیادت کیلیئے بھی نہ پہنچ سکا۔ دلوں میں ملنے کا اشتیاق باقی رہگیا۔ تڑپتا ہوں کہ تہ خاک ہونے سے پیشتر ایک مرتبہ اُس یارِ صادق۔ اُس انسانِ صورت فرشتہ سیرت دوست سے کیوں نہ مل لیا۔ مرحوم نے مجھے خط لکھکر مرنے سے چندروز پیشتر بُلایا۔ میں تعطیلوں کے انتظار میں رہا مگر موت کب فرصت دیتی ہے۔ چندروز کی مہلت بھی نہ دی کہ حسرتِ دیدار تو فریقین کو باقی نہ رہتی۔ اب سوائے کف افسوس ملنے کے چارہ نہیں۔ حالاتِ علالت کی تفصیل جو مولوی حامد علی صاحب نے تحریر فرمائی ہے بجنسہ درج کرتا ہوں ＋

عبدالرشید کو پہلے دستوں کی شکایت تبدیل موسم پر اپریل ۱۸۹۷ء
میں ہوئی۔ دو سال تک یہ صورت رہی کہ مہینے دو مہینے یا چودہ پندرہ
روز کے بعد اُنھیں کثرت سے دست آنے لگتے اور تھوڑے سے
علاج کے بعد طبیعت سنبھل جاتی۔ اپریل ۱۸۹۹ء میں اُنھیں شدت سے
دورہ ہوا اور اُس موقعہ پر سُوء علاج اور مُسہل دیئے جانے کے باعث
اُنکی طبیعت بہت خراب ہوگئی اور تمام موسم گرما بہت بیمار رہے۔
پھر خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں صاحب آنریری سرجن مرحوم و مغفور
اور حکیم شہباز الدین صاحب کے علاج سے دیر تک کامل صحت
معلوم ہوتی تھی۔ نومبر ۱۹۰۲ء میں اُنھیں شدت سے تپ ہوا
اور چند روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اُنکی بائیں شُش کے ماؤف
ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ مگر اُنھیں اُن کی صحت یابی کی قوی اُمید
تھی۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں اُنکی طبیعت نسبتاً اچھی رہی۔ مگر جنوری ۱۹۰۳ء
میں پھر بہت خراب ہوگئی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۰۳ء کو حکیم سلیم اللہ کا
علاج شروع کیا گیا۔ اور اُنھوں نے عبدالرشید کے دم واپسیں
تک کوئی اندیشہ ظاہر نہیں کیا۔ اور صحت کی پوری اُمید دلاتے
رہے۔ حتیٰ کہ اُن کے انتقال سے دو گھنٹہ پہلے جب اُنھوں نے
اُنھیں دیکھا اور میں نے اُن سے علیحدہ ہو کر بہ اصرار پوچھا تو
اُنھوں نے مجھے یقین دلایا کہ ہرگز کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس بھروسہ
پر میں ۱۰ بجے کے قریب دفتر رخصت لینے کیلئے گیا۔ اور جانیکے

وقت حسب معمول عبدُالرّشید کو خدا حافظ اور اُنھوں نے مجھے حوالہ بخدا کیا۔ جب ۱۲ بجے کے بعد واپس آیا تو وہ ایسے سفر پر رخصت ہو چکے تھے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا *

کس نامد از آں جہاں کہ تا پُرسم از و

کا حوالِ مُسافرانِ عالم چوں شد

۲۶ر جنوری سنہ ۱۹۰۳ء سے ۲ر مارچ سنہ ۱۹۰۳ء اُن کی وفات کے وقت تک عبدُالرّشید مرحوم کو طبیب کے حکم کے بموجب سوائے شوربائے مُرغ اور ادویّات و عرقیّات کے کوئی غذا یا پانی نہیں دیا گیا۔ فرزند مرحوم نے انتقال سے دو تین منٹ پہلے میری نسبت پوچھا کہ کہاں ہیں۔ مگر مجھے تو حوالۂ بخدا کر کے وہ رخصت کر چکے تھے۔ میں پھر اُن سے کیونکر ہمکلام ہو سکتا تھا۔ عبدُالرّشید کی مرض الموت کے متعلّق یہ امر عجیب ہی کہ اُنھیں تمام ایّام بیماری میں (سوائے آغاز نومبر سنہ ۱۹۰۲ء کے جب اُنہیں شدت سے بخار رہا) ہرگز کسی طرح کا اضطراب یا بیچینی نہ تھی۔ جو کوئی تردّد پیدا کرتا۔ اور رات بھر نیند خوب آتی رہی اُنہیں آخر دن ایک روز بخار اور کھانسی رہی جس کیلئے دوا دی گئی اور وہ دُنیا میں آخر شب بھی اچھی نیند سوئے۔ البتہ نحافت اور جسم کی لاغری ۲۶ر جنوری سنہ ۱۹۰۳ء سے روز بروز ترقی کرتی گئی جو ہم یونانی علاج کا نتیجہ سمجھتے رہے مگر باوجود اِس کے وہ آخر دم تک ضروریّات اپنے پاؤں اُٹھکر رفع کرتے رہے۔ وفات سے

نوروز پہلے اُنھوں نے مرزا اعجاز حسین صاحب کو ایک دردناک خط لکھا جسمیں اپنی سخت نحافت اور اُٹھنا بیٹھنا اور کروٹ لینا سب دُوسروں کے اختیار میں لکھا۔ کروٹ لینے میں بعض اوقات اُنہیں مدد کی ضرورت معلوم ہوئی۔ مگر آخر دم تک اپنی حاجتیں اسپنے پاؤں سے رفع کیں۔ اور تیمارداروں کو اِسباب میں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔

رُوح کے تحلیل ہونے سے چند منٹ پہلے عبدُالرحمٰن نے کچھ تردُّد ظاہر کیا۔ کہا کہ آپ کے فکر کی کیا وجہ ہے۔ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں رخصت کے وقت موجود نہ تھا۔ مگر بہ اتّفاق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خفیف لمحہ سے زیادہ نزع نہ تھا۔ اور اُسے بمشکل نزع کہا جا سکتا ہی ؎

رہے جہاں میں جبتک تو فکر کا رہے
اور آنکھ مینچ کے سو جائے جب اجل آئے

یہ اُن کی آرزو پُورے طور سے بر آئی ؎

فصل پنجم

مُعتقدات و خصائل

قلیل فرصت جو عبدُالرّشید کو ملی ہرگز کافی نہ تھی کہ وہ اپنے مُعتقدات خود قایم کرتے ۔ دراصل اپنے مُعتقدات پر جو وراثتاً ہمکو پہنچے ہیں غور کر کے اُن کو قایم کرنا ۔ یا اُن میں ترمیم و تنسیخ کرنا نہایت اخلاقی جُراٗت کا کام اور ایسا کر کے اُن کا اظہار کرنا تو اُس سے بھی زیادہ دشوار ہے ۔ جن کو فرصت اور مواقع بھی ایسا کرنیکے ملتے ہیں اُن میں سے بہت شاذ ایسی تکلیف کو گوارا کرتے ہیں ؛

مرحوم کے مُعتقدات عام طور سے وُہی تھے جو اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ہوا کرتے ہیں ۔ سرسیّد کا مرحوم دل سے فدائی تھا ۔ اور اسی لیئے سرسیّد کے مُعتقدات سے بھی مرحوم کو رُجحان تھا ۔ اپنے آزاد خیالات کے اظہار میں مرحوم کو کبھی دریغ نہ تھا ۔ گو وہ کسی کا دل دُکھانا اور محض مُعتقدات کے اوپر مباحثے کرنا اور بدمزگی پیدا کرنا اپنے ایمان اور اُصول اور مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے

مذہب کو محض ذاتی تعلّق خالق و مخلوق کا سمجھتے تھے۔ اور اِس بارہ میں غیر کا دخل انداز ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ دراصل مذہب کا بڑا مقصد اور غایت یہ ہے کہ انسان نیک اور پاک زندگی بسر کرے اور جب وہ کسی شخص کی زندگی کو قابل اعتراض خیال نہیں کرتے تھے تو اُس کے معتقدات کی بابت تجسّس اور تنازعہ بھی نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مذہب اور ملّت کے آدمیوں سے مرحوم نہایت خلوص اور محبّت کے ساتھ ملتے تھے۔ اور دوستی کے معاملہ میں مذہب کبھی حارج و سدِّ راہ نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ہندو عیسائی غرض کہ ہر مذہب و ملّت کے لوگوں میں اُن کے دوست موجود تھے۔ اور مرتے دم تک اُن سے رابطۂ دوستی نہایت خوبی کے ساتھ قایم رکھا۔ تعصّب مذہبی اُن کے پاس نہ پھٹکا تھا۔ باطل پرستی سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ سرسیّد کی محبّت اور قومی ہمدردی دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چنانچہ انتقال سے دس پندرہ روز پیشتر چودھری خوشی محمد صاحب کا مرثیۂ وفاتِ سرسیّد مغفور پڑھ رہے تھے۔ والدہ نے فرمایا کہ اُن کا خیال چھوڑ دو۔ اب تو ضعیف تھے۔ کیا اُنھیں مرنا نہ تھا جواب میں کہا ضعیف تو تھے مگر ہم سے ہزاروں جوانوں کی جانیں اُس ضعیف پر قربان۔ اللہ اللہ کیا کیا کام کیے۔ ہم سے کیا ہو سکتا ہے ؛

وُہ دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اکثر پڑھا کرتے تھے کہ :-

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یکدل بہتر است
کعبہ بُنگاہ خلیلِ آذر است
دل گُذرگاہِ جلیلِ اکبر است

ایک دن اثنائے گفتگو میں اپنی والدہ صاحبہ سے کہا کہ اگر انسان بہت زُہد کرے۔ اور نمازیں پڑھے تو اپنے نفس کے تزکیہ کے لیئے۔ اپنی ذات کیلیئے۔ سر سیّد نے جو کچھ کیا قوم کیلیئے اپنے ہم مذہبوں اور بنی نوع کیلیئے۔ اِسی ضمن میں کہا کہ بدترین خلائق وہ شخص ہے جو کسی کو آزار دے۔ میں دل آزار کو مُشرک سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے مُشرک کیلیئے تو مغفرت نہیں۔ اِس پر مرحوم نے یہ شعر پڑھا

مے خورو مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ہر چہ باشی باش لیکن در دل آزاری مباش

اور اِس کے معنے بھی سمجھائے۔ والدہ نے فرمایا غضب کرتے ہو۔ جواب میں ہنسکر کہا کہ جو دل آزار ہوگا۔ وہ شراب ہی کیوں پیئے گا۔ قرآن شریف کیوں جلائے گا۔ اور کعبہ میں کیوں آگ لگائیگا۔ ایسے کام تو وہی کرے گا جو دل آزار ہو۔ کیوں کہ

ان سب میں دل آزاری لازمی ہے ؎

مجھے وہ دن یاد ہیں جب مَیں اور مرحوم زمانہ طالب علمی میں کہ جب ہمارے دل لوثِ دنیا سے پاک اور ذلیل فانی خواہشوں سے مبرّا تھے۔ اکثر سیر یا فرحت کے وقت باطل پرستی اور ظاہرداری کے مضبوط قلعہ کو عقل اور سائنس کی گولہ باری سے پاش پاش کرنیکی تجاویز سوچا کرتے تھے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب حکومت دولت یا ذاتی وقار ہمارے لیے بے معنی لفظ تھے۔ جب ہماری کوئی خواہش یا آرزو سوائے اِس کے نہ تھی کہ خلق خدا کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرسکیں۔ تیرہ دماغوں کو روشن کریں۔ گرُسنہ معدوں کو غذا سے سیر کریں۔ بیماروں کی دوا درمن کریں۔ بیکسوں مظلوموں کی مدد کریں۔ یتیموں کی پرورش کریں۔ مغموم اور افسردہ دلوں کو خوش دل کریں اور اِس فانی دُنیا کو جہاں تک ہم سے ہوسکے خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنیکے قابل جگہ بنادیں۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہماری بڑی آرزو صرف یہ تھی کہ ہماری زندگیوں کا اکثر حصّہ ذاتی تربیت۔ علمی اور ادبی تحقیقات و تحصیل میں یا خلق خدا کی بہبودی کے کاموں میں صرف ہو۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب اِس دُنیا کی کشمکش۔ انقلاب زمانہ کی بے اطمینانی سے نفرت کرکے ہمارا ارادہ گوشۂ عافیت میں محبّت و اخلاص اور آزادی کے دائرہ میں بے خلل خرّمی کے

ساتھ زندگی بسر کرنیکا تھا - آئین مرنج و مرنجان ہمارا دین و ایمان تھا - حق کی حمایت ہمارا مذہب تھا - اب نہ وہ دوست ہیں نہ وہ آرزوئیں - نہ وہ ارادے ہیں نہ وہ اُصول - زمانہ نے جمال مرحوم کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا - وہ خیالات بھی جو اُسکے ساتھ وابستہ تھے یک قلم محو ہو گئے - اب ہم ہیں اور وُہی معمولی ذلیل دنیا اور اُسکی ذلیل خواہشیں اور ذلیل ضرورتیں ہمخیال رفیق کے چھوٹ جانے سے وہ خیالی نفیس اور لطیف دُنیا بھی چھوٹ گئی - اور ہم وہیں کے وہیں رہ گئے - زمانہ کے آہنی ہاتھ نے منھ پر ایک طمانچہ مار کر کہا کہ یہ کیا لاؤ بالی خیالات ہیں - میری موجودہ ضروریات سے کہاں بھاگ کر جاؤ گے - اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہاں بناؤ گے - خیالی دُنیا خیالی زمین خیالی آسمان کو چھوڑو - اصلی دنیا کے دہندوں میں پڑو - جہاں تمھارا جانے کا خیال ہے وہ تم جیسے کمزور طبیعتوں کیواسطے محال ہے ”سوز غم پروانہ مگس را ندہند“ ایسے جلیل القدر عزم کیواسطے تم بالکل ناموزوں ہو - شاید اپنے نیک دل مستقل مزاج دوستوں کی پامردی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتے - مگر خدا کو یہ بات منظور نہ تھی تمھارے رفیقوں اور مددگاروں میں سے کچھ صیاد اجل کا شکار ہوئے کچھ چرخ تفرقہ انداز نے اُٹھا کر کہیں کے کہیں پھینک دئے اب تم یکہ و تنہا رہ گئے ہو - کب تک رم کرو گے رام ہو جاؤ - طمانچہ کا

لگتا تھا کہ آنکھیں کھُل گئیں - اور دنیا کے بند سے ہو گئے - اِس لحاظ سے مجھے مرحوم پر رشک ہے کہ وہ ہمیشہ اُس خیالی دنیا ہی میں رہا اور مرتے دم تک اُس پاک اور دلکش خیالی دنیا کے خوشنما منظر اُس کے پیش نظر رہے - اور دنیائے دوں کی آلائیشوں سے اُس کا دامنِ دل آلودہ ہونے نہ پایا ؛

باوجود آزاد خیال ہونیکے مرحوم میں ادب کا مادّہ بدرجۂ کمال تھا - مجھے یاد ہے کہ جن لوگوں کے خیالات سے اُن کو اتفاق نہ بھی ہوتا تھا تاہم اُن کا ذکر نہایت ادب سے کرتے تھے - اپنے تئیں بہت ناچیز اور حقیر سمجھتے تھے - کبھی مزاج میں ضد یا رعونت کو دخل نہ دیتے تھے - بعض نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ اپنے آگے کسی دوسرے کی خواہ وہ کیسا ہی قابل تعظیم ہو کچھ حقیقت نہیں سمجھتے - اُن کے مزاج میں "میں" ایسا سمایا ہوا ہے کہ اپنی ذرا سی تعلیم یا کسی ادنیٰ سے رُتبہ پر اِس قدر غرور ہو جاتا ہے کہ اللہ کی پناہ - نہ اُٹھایا جائے نہ دہرا جائے - کسی کو خاطر میں لاتے ہی نہیں - عبدالرشید برخلاف اِسکے نہایت مُنکسر المزاج واقع ہوئے تھے - باوجودیکہ اُن کی رائے ہمیشہ صائب اور اُن کی دلیل معقول ہوتی تھی - تاہم اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی کوئی بات کہتا تو اُس کو غور سے سُنتے - اور خوب جانچ تول کرتے تھے - گو اُن کو اپنی رائے پر پورا بھروسہ ہوتا تھا مگر مزید غور کرنے میں کبھی دریغ نہ تھا -

ہر ایک سے ادب اور تعظیم سے پیش آتے تھے۔ کسی کا نام بھی ادھورا یا بغیر کسی ایسے تعظیمی لفظ کے جیسے مولوی یا منشی ہے نہ لیتے تھے۔ یہ باقاعدہ اور نیک تربیت کا نتیجہ تھا۔ گالی میں نے کبھی اُن کی زبان سے نہیں سُنی۔ بیہودہ باتوں یا گندہ مذاق سے اپنی زبان اور ذہن کو آلودہ نہیں کرتے تھے۔ باوجود منکسر المزاج ہونے کے مرحوم میں خودداری کا بھی بہت خیال تھا۔ طبیعت میں احساسِ سریع بدرجہ کمال تھا۔ ذرا سی نامناسب بات کا فوراً طبیعت پر اثر ہو جاتا تھا۔ مگر ضبط سے کام لیتے تھے۔ اور باوجود سریع الاحساس ہونیکے زود رنج نہ تھے۔ انتقام سے نفرت تھی۔ کینہ وری یا بغض وحسد تو اُن کے پاس بھی نہیں پھٹکی تھی۔ محبت کے بندے تھے راستبازی اور ایثارِ نفس کے عادی تھے۔ افسوس ہے کہ وہ اخلاقِ حسنہ کا نہایت مہکتا ہوا گلدستہ موت کی بادِ سموم سے پیش از وقت کُملا گیا۔ اُسکی خوشبو اب تک دماغ میں بسی ہوئی ہے۔ اور مرتے دم تک بسی رہیگی*

والدین اور عزیزوں اور دوستوں سے غیر معمولی اُنس و محبت مرحوم کی طبیعت کی ایک خاص بات تھی۔ بعض نوجوانوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے کاروبار میں کچھ ایسے منہمک رہتے ہیں کہ کسی عزیز اور دوست کی پروا نہیں کرتے۔ اپنی خودی اُنکے لئے کافی ہے اگر خود کچھ پڑھ گئے ہیں یا کسی رُتبے پر پہنچ گئے ہیں تو اُن پڑھ

رشتہ داروں یا غریب قرابتوں سے بولنا اور بات چیت کرنا عار سمجھتے ہیں
یا اگر عار نہیں سمجھتے تو کم از کم تضیع اوقات سمجھکر احتراز کرتے ہیں۔ مرحوم میں
یہ بات بالکل نہ تھی۔ گھنٹوں اپنا وقت اپنے ایسے رشتہ داروں اور عزیزوں کی
صحبت میں گذار دیتے تھے کہ جن کو علم کی دولت یا رُتبہ کی عظمت حاصل نہ تھی
اُن کو خوش کرنا اُن کو نصیحت کرنا۔ مشورہ دینا۔ دُکھ بیماری میں اُن کی دوا
درمن کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور اِس فرض کے پُورا کرنے کے موقع کو
غنیمت سمجھتے تھے۔ اور اپنے دائرہ میں عزیزوں اور دوستوں کی زندگی کو
خوشگوار بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔

والدہ ماجدہ سے خاص اُلفت تھی تمام زمانہ کی باتیں اُن سے ختم ہوتی
تھیں۔ کہیں گئے۔ کوئی خوشنما منظر دیکھا۔ کوئی عالیشان عمارت دیکھی۔ کسی
نئے آدمی سے ملے۔ کسی جلسہ میں شریک ہوئے۔ کوئی نیا شہر دیکھا۔ یا نئی کتاب پڑھی
کوئی نیا قصہ یا کہانی سنی۔ کوئی چیز نظر سے گذری یا کوئی نئی بات معلوم ہوئی خواہ
وہ سائنس کی دقیق سے دقیق اور پیچیدہ بات ہی کیوں نہو والدہ سے اِس کا
ذکر کرنا ضرور تھا۔ گھنٹوں آغوشِ مادری میں بیٹھکر۔ مذہب۔ تاریخ فلسفہ
اور سائنس کے مسائل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے اور والدہ کی عامہ واقفیت
کو بڑھایا کرتے تھے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور شوق کے کانوں
سے سُنتی تھی۔ اب اُن آنکھوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے پیارے لایق بیٹے کو
نہیں دیکھ سکتیں۔ اور اُن کانوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے پیارے فرزند کی
دل خوش کن آواز کو نہیں سُنتے۔ مگر سوائے دل پر پتھر رکھنے کے اور کیا

ہو سکتا ہے۔ مرحوم نے جو آنکھوں سے دیکھا کوشش کی کہ اپنی پردہ میں بیٹھنے
والی چاہتی ماں کو بھی وُہی تصوّر کی آنکھوں سے دکھا دے جو کچھ کانوں سے
سُنا یا ذہن سے سمجھا۔ محبت پسری متقاضی ہوئی کہ والدہ محروم نہ رہجائیں۔
غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آجکل کتنے بیٹے ایسے ہیں جو اِس فرض کو سمجھتے
ہیں اور اُس کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل کے
نوجوانوں کی خانگی زندگی اور بیرونی خانہ زندگی میں بیّن فرق ہے۔ گویا یہ
سمجھنا چاہیے کہ زندگی کا مزا آدھا رہ گیا ہے۔ گھر کے اندر ہم اَور کچھ ہیں۔
گھر کے باہر اَور کچھ۔ اگر مرحوم کی طرح ہم اپنی ماؤں۔ اپنی بہنوں۔ اپنی بیویوں
کی عام واقفیّت بڑھانے اور گھر سے باہر کی دنیا کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے کی
کوشش کریں اور اُنکی تعلیم و تربیت کے لیئے اپنا وقت صرف کریں۔ تو
یقیناً تعلیم نسوان کا مسئلا اور موجودہ طریق زندگی کی مشکل بہت کچھ حل
ہو جائے۔

اِس فصل کو ہم مرحوم کے روزنامچہ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۹۶ء سے ایک اقتباس
پر ختم کرتے ہیں جس میں مرحوم نے اپنی قلم سے اپنے معتقدات کا فوٹو کھینچا
ہے اور جس سے مرحوم کی اعلیٰ درجہ کی آزاد خیالی اور نیک مزاجی کا ثبوت
ملتا ہے لکھتے ہیں:۔

میرا مذہب ہے۔ نوعِ انسان کی خدمت صُلح کل اور اپنے فرائض
زندگی کی ایمانداری کے ساتھ انجام دہی۔

میرا بہشت ہے۔ میرا کنبہ اور میرا گھر۔

میرے فرشتے ہیں - میرے دوست - میرے بھائی بہن - میرے خیرخواہ اور پیارے رشتہ دار اور والدین - اور سب سے بڑھکر وہ ننھّے ننھّے ہنس مکھ بچّے جو گھر میں میرا دل خوش رکھتے ہیں -

میرا دوزخ ہے - بیماری مصیبت - باہمی فساد اور تنازعات خانگی -

میری عبادت ہے - دوسروں کی امداد - ہمدردی کرنا - دُکھ درد کا علاج کرنا - بچّوں کی دور اندیشانہ طریق پر تربیت کرنا - اور اچھّی کتابوں کا مطالعہ کرنا -



فصل ششم

مرحوم کی یادگار

انسانی تمدّن و شائستگی کا سب سے بڑا سرمایۂ ناز فنِ تحریر کا ایجاد ہے
جذبات خیالات اور محسوسات جملہ ذہنی کوائف ہمادی زنجیروں میں جو
لوہے سے نہیں بلکہ سیاہی اور قلم سے کاغذ پر بنائی جاتی ہیں مقیّد ہیں۔ زبانِ
قلم نے زبان انسانی کی رسائی قوّت اور دائرۂ اثر کو بے انتہا وسیع کر دیا ہے۔
مکان و زمان کا فرق یکقلم مٹا دیا ہے۔ انسانی تجربات کا ذخیرہ جو پہلے صرف ایک
زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ فنا کے ہاتھ سے محفوظ ہو گیا۔ اور نسلاً بعد نسلاً
ترقی پاتا گیا۔ ورنہ زمانۂ موجودہ۔ اور زمانۂ ابتدائے آفرنیش میں کچھ فرق نہوتا۔
اِس فن کی بدولت آج وہ دماغ جن میں صدیوں سے خون کا دوران بند ہو اپنی
روشنی پھیلا کر اہل فش کو مستفیض کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو ہزارہا برس سے موت کا
شکار ہو چکے ہیں۔ آجتک اس آبحیات کی بدولت زندہ ہیں۔ اور پس ماندگان کو
اُن کی زندگی کے خوفناک بحری سفر میں روشنی کا کام دیتے ہیں۔ فانی انسان
نے فنا کی ابدی حکومت کو اس ایجاد کے ذریعہ سے پہلے شکست دی ہے۔

سوچنے والا دماغ۔ لکھنے والا ہاتھ باقی نہ رہے۔ مگران دونوں کا ماحصل اور لُبِّ لباب یعنی زندگی کا اصلی حصہ "انسانی خیالات" ہمیشہ کیواسطے باقی رہ سکتے ہیں۔

۵

نوشتہ بماند سیاہ بر سپید
نویسندہ را نیست فردا امید۔

میرا اعتقاد ہے کہ پیارا رشید زندہ ہے۔ کیونکہ اُسکی تحریرات ہمارے دلوں اور آنکھوں کو اپنی ہستی کا ہر وقت یقین دلاتی رہتی ہیں۔

لکھنے پڑھنے کا شوق مرحوم کو میراث میں حاصل ہوا تھا۔ یہی وجہ ہی کہ مرحوم کی تحریرات نسبتاً زیادہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ ورنہ جس چھوٹی سی عُمر میں مرحوم نے وفات پائی عموماً طالب علموں کو اِس قدر تحریر کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ شفیق باپ کے مجبور دل اور پُرشوق ہاتھ نے مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا پُرزہ پُرزہ جمع کر کے احتیاط سے رکھ چھوڑا ہی۔ یہ اوراقِ پریشان ریش دل کا پھایا اور زخم جگر کا مرہم ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو اگر کچھ تسکین ہوسکتی ہے تو اِن کاغذوں سے ہوسکتی ہے۔ پیارے کی ہر چیز پیاری معلوم ہوتی ہے۔ جوانمرگ کی نشانی یہی کاغذ کے پُرزے ہیں۔ کوئی بادشاہ ہوتا تو اُسکی نشانی بڑے بڑے قلعے۔ بڑے بڑے شہر۔ بڑے بڑے مینار اور مقابر ہوتے۔ کوئی امیر آدمی ہوتا تو بڑے بڑے محل۔ سرائیں نہریں۔ تالاب وغیرہ۔ اپنی نشانی چھوڑ جاتا۔ مگر ایک غریب مزاج طالب علم کی نشانی سوائے چند اوراق کاغذ اور کیا ہوسکتی ہی۔ اعجاز کے دل میں

تو اِس کی وقعت اُن عظیم الشّان یادگاروں سے جو بادشاہ اور اُمرا چھوڑ جاتے ہیں ہرگز کم نہیں۔

۵

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ درین گرد سوارے باشد

کیسے کیسے گوہر مضمون کیسے کیسے بیش بہا خیالات ان اوراق پریشان میں جمع ہیں۔ اہل دل کے لئے یہ تحریریں نہیں ہیں۔ دریائے زندگی کی لہریں ہیں۔ ایسی موجوں کی بہار اُن کا مدّ و جزر۔ اُن کی طغیانی اُن کا زور شور اُن کی روانی اور طمانیت ایک ایسا دلکش نظّارہ ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے دیکھنے والے اِسمیں بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اور مستفید ہو سکتے ہیں۔

عبدُالرّشید حسب ذیل تحریرات اپنی یادگار اور نشانی چھوڑ گئے ہیں۔

اوّل خطوط انگریزی و فارسی جو اُنھوں نے اپنے عزیزوں یا دوستوں کے نام تحریر کئے۔ اُن میں سے چند خطوط جو حُسن اتفاق سے محفوظ رہے جمع کئے گئے ہیں۔ اِن خطوط کی تعداد قریباً ۲۶۰ ہے۔ اور یہ تعداد ایک نہایت قلیل حصّہ اُس خطّ و کتابت کا ہے جس کو مرحوم نہایت شوق کے ساتھ پورا کرتے رہے۔ اگر وہ تمام خطوط جو مرحوم نے تحریر کئے جمع ہو سکتے تو یقیناً اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی۔ کیونکہ مرحوم نہایت ہر دلعزیز اور کثیر الاحباب واقع ہوئے تھے اور اپنا عزیز وقت اُن کے ساتھ خط و کتابت میں صرف کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے وہ خطوط اور عرضیاں جو مرحوم نے ملازمت وغیرہ کے متعلق لکھیں اِس کے علاوہ ہیں۔ ایسے خطوط اور عرضیوں کی تعداد جہانتک ہم پہنچی ہیں قریباً

۷۳ ہیں یہ خط سب پدرانہ محبت لئے نہائیت احتیاط کے ساتھ فائیل بنا کر ترتیب دیئے ہیں۔ صرف چند خطوط جو بعض لحاظ سے خاص دل چسپی رکھتے ہیں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں +

اِن خطوط میں روانیِ مضمون۔ سادگیِ بیان بے تکلفی۔ اداے معانی ومطلب پر کامل قدرت نہایت اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے۔ لفظ لفظ محبت وصداقت سے بھرا ہے۔ دردمندی اور نیک خیالی حرف حرف سے ٹپکتی ہے۔ اِن کے مطالعہ سے خاص لُطف حاصل ہوتا ہے۔ جو احاطہ بیان سے باہر ہے۔ دوئم خطوط کے علاوہ اُردو تحریرات ہیں جن میں بعض نہایت بیش قیمت مضامین پائے جاتے ہیں جن کا مطالعہ فائدہ سے ہرگز خالی نہیں ہوسکتا۔ اِن میں سے بعض مضامین مخزن اور دیگر اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ اور عام پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ اور بعض مسوّدات کی صورت میں تھے۔ اِن سب مضامین کو ہدیۂ ناظرین کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ ناظرین دیکھیں گے کہ ہر مضمون پر فلسفیانہ طریق سے بحث کی ہے۔ اُردو تحریرات میں اِن مضامین کے

علاوہ دو انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی ہیں۔ ایک ترجمہ انکل ٹامز کیبن کا ہے جو انگریزی میں ایک مشہور ناول ہے۔ اور دوسرا ترجمہ ایک اور مشہور اور نہائیت دلچسپ انگریزی ناول کا ہے جس کا نام میڈم کلوچی ہے۔ اوّل الذکر ناول کو مرحوم نہائیت پسند کرتے تھے یہ وہ ناول ہے جس نے امریکہ سے غلامی کی بیخکنی کرنے میں قابل ذکر حصہ

لیا ہے اور مرحوم کا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ ہندوستان کی پولیٹکل حالت میں ترقّی حاصل کرنیکے لیئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ مرحوم نے سرسیّد کی سوانح عمری کا بھی بہت بڑا حصّہ اُردو میں تیاّر کیا ہے جو مسودّہ کی صورت میں نامکمّل ہے۔ ارادہ تھا کہ پاکٹ ایڈیشن کی صورت میں اِس سوانح عمری کو طبع کرائیں۔ مگر حیاتِ جاوید کے طبع ہونے کے بعد مرحوم نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور مسودہ نامکمّل ہی رہا۔ خبر نہیں اُن کا کیا خیال تھا۔ بیوقت موت نے ہزاروں ارادے اور منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ چونکہ یہ تینوں مسودّات نامکمّل ہیں۔ اُن کا ہدیۂ ناظرین کرنا ضرور نہیں۔ اگرچہ دل یہ چاہتا ہے کہ مرحوم کے ہاتھ کا لکھّا ہوا حرف حرف طبع کے دائرۂ حفاظت میں آجائے اُردو کے خطوط اور مضامین میں سے جو یہاں درج کیئے جائیں گے ناظرین پر ظاہر ہو جائیگا کہ مرحوم کی انشا پردازی کس اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اسلیئے اِن نامکمل مسوّدات کو نقل کرنا ضروری نہیں۔

سوم۔ مرحوم کی تحریرات سے ۱۳ کاپیاں ہیں۔ جو زمانۂ طالب علمی میں نصابی مضامین کے متعلّق مرحوم نے بنائی تھیں۔ جس قابلیّت اور محنت سے یہ کاپیاں لکھی گئی ہیں وہ مرحوم کے شوقِ تحصیلِ علم و جانفشانی کا اعلیٰ ثبوت ہیں۔ اِن کے اقتباس یا نقل کی ضرورت نہیں۔

چہارم وہ انگریزی مضامین ہیں جو مرحوم نے ۱۸۹۹ء سے لیکر ۱۹۰۳ء تک بحیثیّت منیجر و سب ایڈیٹر و نامہ نگار اخبار آبزرور میں تحریر کیئے۔

ان سب کا پتہ لگنا تو مشکل ہے کہ اس دراز عرصہ میں مرحوم نے اخبار میں کیا کچھ لکھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ لکھا۔ چند مضامین جن کی تعداد ۱۴ ہے اور خاص دلچسپی رکھتے ہیں منتخب کیئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱)	پرچہ مورخہ	۱۱ر مارچ ۱۸۹۹ء میں	سرسیّد کی برسی
(۲)	"	۲ر مارچ ۱۹۰۱ء میں	انجمن حمائیت اسلام کا سالانہ جلسہ
(۳)	"	۹ر مارچ ۱۹۰۱ء میں	سرسیّد کی برسی
(۴)	"	۱۴ مارچ ۱۹۰۱ء میں	وائسرائے کی علیگڈھ میں آمد
(۵)	"	۸ر جون ۱۹۰۱ء میں	افسوس وفات نواب محمد حیات خان
(۶)	"	۷ر ستمبر ۱۹۰۱ء میں	عدالتہائے ضلع لاہور میں ضروری کاروبار کے لئے جانے والوں کے لئے جائے نشست۔
(۷)	"	"	
(۸)	"	۳۰ر اکتوبر ۱۹۰۱ء میں	ایک مکتب کی جھلک
(۹)	"	۲ر نومبر ۱۹۰۱ء میں	"
(۱۰)	"	۱۴ر دسمبر ۱۹۰۱ء میں	تربیت جسمانی
(۱۱)	"	۲۵ر دسمبر ۱۹۰۱ء میں	آرگنائیزیشن
(۱۲)	"	۴ر جنوری ۱۹۰۲ء میں	کرسمس ڈالی
(۱۳)	"	۱۱ر جنوری ۱۹۰۲ء میں	عید
(۱۴)	"	۲۲ر مارچ ۱۹۰۲ء میں	سرسیّد کی برسی

مندرجۂ بالا مضامین کے عنوان ہی سے ظاہر ہو جائیگا کہ مرحوم کو سرسیّد کے

ساتھ کس قدر خلوص و محبّت تھی۔ کوئی سال نہ جاتا تھا کہ یہ سر سیّد مرحوم کی برسی کرنیکی لوگوں کو ترغیب نہ دلاتے ہوں۔ اور ایک پُر زور مضمون سر سیّد کی عظمت کے متعلّق نہ لکھتے ہوں۔ اسی طرح انجمنِ حمائت اسلام اور عیداور دیگر اسلامی دلچسپی کے مضامین پر خاص شوق سے خامہ فرسائی کرتے تھے۔ چونکہ مرحوم کی صحت عموماً اچھی نہیں رہتی تھی۔ اور اِسکی وجہ زیادہ تر ورزش جسمانی کی طرف ایّام طالب علمی میں بے توجہی کرنا تھی۔ اس لیے جس دلسوزی سے اور ذاتی تجربہ سے تربیت جسمانی پر مرحوم نے مضمون لکھا ہی وہ دل پر خاص اثر پیدا کرنے والا ہے۔ گویا مرحوم پُکار پُکار کر کہہ رہا تھا کہ۔

من نہ کردم شما حذر بکنید

یہ مضامین چونکہ انگریزی میں ہیں اور اِن کا خاص لطف ترجمہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔ اِس لیئے اِس تذکرہ میں اِن انگریزی مضامین کا اندراج نہیں ہوسکتا۔ انشاءاللہ ضمیمہ کی صورت میں بعد میں ترتیب دیئے جاوینگے۔

پنجم۔ اُن مضامین کے علاوہ جو اخبار آبزور میں مرحوم کی تحریر سے شائع ہوئے ۲۲ دیگر مضامین کے مسوّدات انگریزی میں مختلف مضامین موجود ہیں۔ جملہ مضامین نہایت لیاقت سے لکھے گئے ہیں۔ ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن لاہور میں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سربرآوردہ انجمن ہے مرحوم نے کئی مضامین پڑھے۔ جن کی قدردان سامعین اور قابل پریسیڈنٹ خان بہادر میاں محمد شاہدین صاحب ہمیشہ نہائت تعریف فرماتے تھے۔ اِس انجمن کے مرحوم سیکرٹری تھے۔ اور ۱۸۹۵ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک اس کے

جلسوں کی روئداد نہایت قابلیت کے ساتھ شستہ انگریزی میں مرحوم کے
ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے۔ ۱۸۹۰ء کے بعد چند وجوہات سے اِس ایسوسی ایشن
نے خواب راحت میں آرام کیا۔ مرحوم کو بھی زیادہ فرصت نہ تھی کہ اس کو
جگائے۔ تلاش معاش میں لاہور سے اکثر باہر بھی رہنا پڑا۔ اِس لیئے یہ
ایسوسی ایشن آرام سے سوتی رہی۔ اب سنا ہے کہ دو تین سال سے پھر کچھ
جاگی ہے۔ ۱۸۸۵ء سے لیکر ۱۸۹۰ء تک جن لوگوں نے اِس ایسوسی ایشن کے
جلسوں کی گرماگرمی اور رونق دیکھی کچھ وُہی سمجھ سکتے ہیں کہ مرحوم نے کس کوشش
اور جانفشانی سے اِس کو رونق دی تھی۔ ہائے۔

آن قدح بشکست و آں ساقی نماند

مضامین میں ایک مضمون جوالمرگ نوازش علی خاں سے متعلق ہے
جو مرحوم کا ابتدائے عمر کا دوست تھا اور جس کی وفات پر مرحوم کو سخت
صدمہ ہوا تھا۔ اِس مضمون کے لکھتے وقت مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ وہ بھی
جوانی میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو داغ مفارقت دیجائیں گے اور اُنکی
بیوقت موت کے بعد اُن کے دوست بھی اُن کی سوانح عمری اِسی طرح
لکھیں گے۔

ششم۔ روزنامچہ لکھنے کا شوق مرحوم کے خاندان میں وراثتاً چلا
آیا ہے۔ جیساکہ پہلے تذکرہ ہوچکا ہے۔ مرحوم بھی باقاعدہ مگر وقتاً فوقتاً
انگریزی میں اپنی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ گویا اپنے نفس کا محاسبہ لیتے تھے
اپنے دوستوں کی نسبت نہایت آزادانہ اور جُرأت کے ساتھ رائے قائم

کرتے تھے اور اُن کے اخلاق اور حسن و قبح کا موازنہ کرتے تھے۔ کوئی اچھی کتاب پڑھتے تھے یا کسی کی پُر لطف نصیحت آمیز گفتگو سُنتے تھے تو اُس کو اِس ڈائری میں درج کرتے تھے۔ کم و بیش ۵۰ صفحے فلس کیپ کاغذ پر یہ ڈائری لکھی ہوئی ہے۔ کس قدر طالب علم ہیں جو اس قدر نوشت و خواند کیلئے وقت نکال سکتے ہیں۔ مرحوم کا اِس قول پر عمل تھا کہ لکھنا انسان کو کامل بنا دیتا ہے۔ اِس لیئے بجائے بیہودہ لہو و لعب میں وقت صرف کرنیکے جو وقت اُن کو ملتا تھا لکھنے پڑھنے کے کاموں ہی میں صرف کرتے تھے۔

ہفتم۔ کتاب نقاشی۔ مرحوم کو ہاتھ سے تصویریں بنانیکا اور نقش و نگار کرنیکا کمال شوق تھا۔ چنانچہ ایک کتاب پر چند تصویروں کے خاکے کھنچے ہوئے ہیں۔ کہنے کو تو وہ مرغ اور کُتوں کی تصویریں ہیں مگر اُس ہاتھ سے کھنچی ہوئی ہیں جو اب بیکار ہوگیا ہے۔ مرحوم کے چاہنے والوں کی نظر میں یہ مرغ مرغِ سدرہ۔ اور یہ کُتے اصحاب کہف سے کم نہیں۔

اِن خاکوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم میں خداداد ملکہ اور قابلیت نقاشی کی موجود تھی۔ اگر زمانہ فرصت دیتا تو شائید درجۂ کمال تک پہنچ جاتی۔

ہشتم۔ بہت سے متفرق کاغذات نوٹ وغیرہ پنسل سے مرحوم کی قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کیا کیا گوہر آبدار مضامین اس دریائے کتابت میں پنہاں ہیں۔ قریباً سو ڈیڑھ سو صفحہ کا دفتر اس طرح لکھا پڑا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ایک ایک کاغذ کو پڑھوں اور اِس کا ماحصل نکالوں۔ مگر اس قدر فرصت کہاں

احقر کے حوالے کرتا ہوں اور صرف چند اُردو مضامین اور خطوط کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

مرحوم نے اپنے دوست نوازش علیخاں مرحوم کے ساتھ مِلکر بعد فراغت امتحان انٹرنس ایک مجموعہ نظم از نتائج فکر نواب غلام احمد خاں صاحب مرحوم ممبر کونسل آف ہزہائینس مہاراجہ گوالیار۔ ترتیب دیا تھا اور شائع کرایا تھا۔ اور اِس مجموعہ نظم کا نام "مؤثر القلوب" رکھا تھا۔ نہایت دلپسند اخلاقی نظمیں اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں۔ پڑھنے والے جہاں قابل مصنّف کی اعلیٰ سخنوری کی داد دیں گے وہاں اُس چشم انتخاب اور ذہن نقّاد و سخن سنج کی تعریف کرنے سے بھی باز نہ رہیں گے کہ جس نے اِس منتخب مجموعہ کو ترتیب دینے میں حصّہ لیا ہے۔

آئندہ فصل میں ہم مرحوم کی تحریرات درج کرتے ہیں۔ مرحوم کو نظم سے بھی کمال دلچسپی تھی۔ اور اعلیٰ درجہ کا شاعرانہ مذاق رکھتے تھے۔ مگر عموماً شعر خود نہ کہتے تھے۔ مستند شعرائے اُردو فارسی کا کلام اکثر وِرد زبان تھا۔ اور بڑے مزے سے لیکر پڑھا کرتے تھے۔ چند نظمیں خود بھی مرحوم نے لکھی تھیں جو مخزن میں اُن کے مرنیکے بعد شائع ہوئیں وہ بھی ہم درج کرتے ہیں اہلِ نظر پر ظاہر ہو جائیگا کہ مرحوم کی انشا پردازی قوّت بیان اور قوّت تخیّل کس اعلیٰ درجہ کی تھی اور گو وہ عموماً نثر لکھنا پسند کرتے تھے میدان نظم میں بھی عاری نہ تھے۔ ناظرین سلاستِ بیان۔ شستگیِ مضامین خوبیِ ادا کا لطف اُٹھاویں اور فلسفیانہ خیالات اور عقلمندانہ اُصولوں سے

جو ہمیشہ نیکی اور سچائی پر مبنی ہوتے تھے مستفید ہوں۔

فصل ہفتم

عبد الرشید کی اُردو تحریرات

انتخاب از خطوطِ اُردو نوشتۂ مرحوم

۱۔ خط بنام عبد الحمید چشتی اپنے چھوٹے بھائی کے۔
۲۔ ایضاً عبد الرحمٰن چشتی اپنے بڑے بھائی کے۔ والدہ کی طرف سے
۳۔ ایضاً مرزا اعجاز حسین۔
۴۔ ایضاً اپنے والد بزرگوار کے۔
۵۔ ایضاً عبد الرحمٰن چشتی۔ اپنے بڑے بھائی کے۔
۶۔ ایضاً ایضاً - ایضاً
۷۔ ایضاً عبد الحمید چشتی اپنے چھوٹے بھائی کے۔
۸۔ ایضاً ایضاً - ایضاً
۹۔ ایضاً عبد الحمید چشتی۔
۱۰۔ ایضاً ایضاً
۱۱۔ ایضاً ایضاً

مضامین نثر اُردو و انشا پردازی

۱۔ مضمون دوستی

۲۔ " اثر

۳۔ تاریخ عالم کے اوراق۔

۴۔ انگلستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

۵۔ دلِ افسردہ۔

۶۔ مشرقی اور مغربی زندگی کا مقابلہ۔

۷۔ سرسیّد مرحوم کی یادگار (چودھویں صدی راولپنڈی۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۰۱ء)

۸۔ سیّد احمد خانی گدّی (اخبار اتفاق ساڈھورہ۔ یکم فروری سنہ ۱۹۰۱ء)

۹۔ گمالیاں (مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۲ء)

۱۰۔ سرسیّد کی برسی (چودھویں صدی راولپنڈی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء)

۱۱۔ سرسیّد کی برسی (" " ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۰۳ء)

۱۲۔ بچّوں کو اخبار کی مبارک (بچوں کا اخبار جون سنہ ۱۹۰۲ء)

اُردو نثر میں ترجمے

۱۔ دماغی تعلیم۔

۲۔ حقوقِ رعایا (مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء)

۳۔ امریکہ کی آزادی (مخزن جنوری سنہ ۱۹۰۲ء)

اُردو نظم

دوستی

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل ببار آرد
نہالِ دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

جہاں خدائے تعالیٰ نے اِنسان میں اور بہت سی عجیب خصلتیں اور طاقتیں رکھی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہو کہ وہ دوسرے بنی نوع کو سچّے دل سے محبّت کرتا ہے اور یہ خواہش رکھتا ہے کہ دوسرا شخص بھی اُس سے محبّت کرے۔ کیا عجیب بات ہے کہ انسان بالکل انجان اور اکیلا دنیا میں آتا ہو۔ پھر یہاں کے چند روزہ سفر میں ہزاروں تعلّقات پیدا کرتا ہو۔ اور پھر سب

منہ موڑ کر اکیلا چلا جاتا ہے۔ مگر آنے اور جانے کی کیفیتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ آتا ہے ناآشنا۔ اجنبی۔ مسافر کی حالت میں۔ جب جاتا ہے تو اپنی مفارقت سے ہزاروں کے دل خون کر کے جاتا ہے۔

ذرا کی ذرا دنیا کے کارخانے پر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائیگا کہ اس کے سب کاروبار میل ملاپ بلکہ اُنس و محبت پر ہی چل رہے ہیں۔ دنیا میں قدم رکھا نہیں کہ ایک رحمت کا فرشتہ بشکل انسان جھٹ آغوش شفقت میں لے لیتا ہے جسے ہم مادر مُشفقہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ باقی تمام ذمہ داریوں اور سفر کے اخراجات کا بوجھ وہ مبارک ذات اپنے ذمے لے لیتی ہے جسے ہم پدر مہربان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ علاوہ ان کے کوئی بھائی پکارتا ہے کسی کو ہم بہن کہتے ہیں۔ غرض انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی محبّت اور شفقت کے علاقے محکم و مضبوط موجود ہوتے ہیں۔ باقی آگے چل کر یا عام زبان میں جسے ہم بڑے ہو کر کہتے ہیں۔ اس کی اپنی عقل و دانش اور اُنس و التفات پر منحصر ہے کہ ہمراہی اس سے اچھا سلوک کریں یا بُری طرح سے پیش آئیں۔ اگر اس میں محبّت کا مادہ کم ہے تو یہ اپنوں کو بھی بیگانہ بنالے گا اور اگر اس میں خدا کی یہ پیاری ودیعت زیادہ ہے تو وہ بیگانوں کو اپنا اور اپنوں سے بڑھ کر بنا لیگا۔ مگر ہمارا مقصود یہاں اُس خاص تعلّق یا رشتہ سے بحث کرنیکا ہے جسے ہم دوستی کہتے ہیں۔ یہ کہ دوستی کیا چیز ہے کیسے ہوتی ہے۔ اور اُس کے فوائد کیا ہیں۔

الفاظ میں یہ بتانا کہ سچی دوستی کیا چیز ہے اور اس سے انسان کو کیا روحانی فرحتیں حاصل ہوتی ہیں تو محال ہے۔اس ذوق کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔جنہوں نے اس جام سے دو گھونٹ پیئے ہوں۔یا یوں کہیئے کہ پینے نصیب ہوئے ہوں +

یہ وہ چیز ہے کہ جس کی موجودگی میں دُنیا کی نہایت دشوار گزار منزلیں آسانی سے طے ہوجاتی ہیں۔جسکے باعث دُکھ دُکھ نہیں رہتا۔بیماری بیماری نہیں رہتی۔غربت وطن سے بہتر اور مسکنت امیری سے زیادہ خوشی دیتی ہے۔یہ وہ گلزار ہے جہاں بے خار گل اُگتے ہیں اور اُس میں کبھی خزاں نہیں آتی۔اس کے پھولوں سے مشام جان ہمیشہ معنبر و معطر رہتا ہے۔

مگر پیشتر اسکے کہ ہم اسکی کیفیتوں اور خوشیوں کا ذکر کریں مناسب ہوگا کہ ہم یہ واضح کریں کہ جسے ہم دوستی کے نام سے پُکارتے ہیں وہ کس جانور کا نام ہے۔دوست کا لفظ تو دُنیا میں ہر کہ ومہ۔عالم و جاہل کی زبان پر سُنا جاتا ہے۔بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ایک دوسرے کو دوست کہ کر پکارتے۔اُن سے بظاہر ملتے۔نہایت بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔مگر اُن کے درد و دُکھ سے ہمیشہ الگ رہتے۔اُنکی بھلائی اور خوشی سے مستغنی اور بے حس رہتے ہیں۔وہ بعض اوقات اپنے ذاتی فائدہ کے لیے اُن کی حق تلفی کو اپنا عین حق سمجھتے ہیں اور اگر موقع ملے تو اُنکی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے میں دریغ نہیں کرتے۔کیا ہماری مراد

ایسے دوستوں سے ہے۔ حاشا وکلّا ثم حاشا۔ ہماری مراد دوستی سے وہ روحانی یا دلی رشتہ ہی جو دو انسانوں میں اُس وقت پیدا ہوتا ہی جب اُن دونوں میں مساوات یا قریب مساوات کا درجہ پیدا ہوتا ہے۔ جب اُن کے اخلاق کذب۔ کینہ۔ تکبّر وغرور۔ نخوت وریا سے پاک ہوتے ہیں اور دونوں کا میلان کسب اخلاق مُلکی کیطرف ہوتا ہے۔

جہاں ایک دوسرے کو محبّت کرتا ہے محبّت کے لیئے۔ اُس کی خوشی میں وہ خوش ہوتا اور اُسکے آرام میں وہ خود آرام پاتا ہے۔ اُس کا درد اُسے درد پہنچاتا ہے۔ اُس کا غم اُسے غمگین کرتا ہے۔ غرض اُسکے رنج و راحت میں وہ شریک ہوتا ہے۔ نہ ریا سے نہ احسان کیلیئے۔ نہ معاوضہ کے خیال سے۔ بلکہ اُس کی شرکت طبعی ہے اور اگر ہمیشہ طبعی نہیں تو فرض لازمی کے خیال سے۔ دوستی میں سچّی محبّت کی ترقی اُس نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے دوئی کم ہوتی اور یکی اور یگانگت بڑھتی ہی یہی ہے جسے ہم دوستی کہتے ہیں اور اسی کیفیت کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہی ؏

تو من شُدی من تو شدم من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ہر ملک اور ہر قوم اور ہر درجے کے لوگوں میں دوستی کا رشتہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا ہی اور انسان کے دل کا اگر بغور مطالعہ کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ خدا نے دوستی کا مادہ ہر ایک میں کم و بیش پیدا کیا ہے۔

فرق صرف یہ ہی کہ جس طرح انسانوں کی رنگت - آوازوں اور شکلوں میں
فرق ہے اسی طرح اس خیال میں بھی فرق ہوتا ہے - ہمارا مقصود اُس
دوستی سے بحث کرنیکا ہے جس کا ہم نے مختصر بیان کیا ہے - اس قسم
کی دوستی عموماً اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لوگوں میں ہوتی ہے جن کے
خیالات پاکیزہ اور دلوں میں صفائی اور اعلیٰ درجہ کی روشنی ہوتی ہے -

دوستوں کے ہونے سے غرض

دوستوں سے غرض یہ ہوتی ہو کہ جب ہم دنیا کے کاروبار سے فراغت
پاویں تو ہم اُن کی صحبت میں بیٹھیں اور اُس کلفت اور تکان کو جو کسب
معاش یا اور دنیاوی کاروبار کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں دوستوں میں
دُور کریں - اُن سے علمی بحثیں کریں - خیالات کا تبادلہ کریں - چھوٹی چھوٹی
مشکلات میں اُن سے مشورہ لیں اور دیں - اُنکی باتیں سنیں اور اُن کو سنائیں
یہ وہ وطیرہ ہے جو عام حالتوں میں دوستوں کے درمیان ہونا چاہیے
مگر دوستی کا اصل مقصود اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ہم یا ہمارا دوست
رنج میں ہو یا کسی قسم کی تکلیف لاحق ہو جس سے دُنیا میں کوئی بشر
خالی نہیں ہوتا - اُس وقت دوست کا کام ہے کہ جان - مال - وقت
آرام - ہر ایک چیز کے قربان کرنے سے ذرا بھی دریغ نہ کرے -

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالے و درماندگی

انسان کو زندگی مال اور متاع اگرچہ نہایت ہی عزیز ہوتے ہیں

مگر یہ سب چیزیں ناپائیدار اور ہمیشہ حوادث کی زد میں ہیں اور اگر غور کیا جاوے تو ان سب کا نثار کر دینا ایک بلند خیال اور عالی حوصلہ آدمی کے لیئے فرائض میں داخل ہے اور جو خوشی اسکے معاوضہ میں حاصل ہوتی ہے اُس سے بڑھکر انسان کے لیئے کوئی خوشی نہیں ہوسکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ایسی دوستی اور اس قدر خود نثاری کا مادہ بہت کم ہے اور ان باتوں پر عمل کرنے والے مشرق سے مغرب تک معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ضرور ہیں۔ اور یہ خیال ہر شخص کو اپنے دل میں رکھنا چاہیئے اور حتی الوسع عمل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اگرچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کا معاوضہ وہ خوشی ہے جو انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہو یا موت کے بعد دوسری دنیا میں مگر علاوہ ازیں اکثر اوقات اُن لوگوں کے نام سُنہری حروف میں دنیا کی تاریخ میں لکھے جاتے ہیں اور وہ کل بنی نوع کیلئے ہمیشہ کے لیئے نظیر چھوڑ جاتے ہیں ؎

ہر شخص کی زندگی میں تو ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں۔ کہ دوستوں کے لیئے جان اور مال ایثار کرنے کے امتحان پیش آئیں مگر جیسا ہم آگے اشارہ کر چکے ہیں ہر شخص کی زندگی میں کم و بیش ایسے واقعات ضرور پیش آتے ہیں جن میں اُسے کسی سچے دوست کی ضرورت پڑتی ہے۔

وہ ساٹھ برس کا بوڑھا جس کا جوان ہونہار بچہ جو اُس کے بڑھاپے کا

عصا تھا ناگہاں مرگیا ہے اور اُسے دنیا میں بیکسی کی حالت میں چھوڑ گیا ہے
اُس کے کوئی نزدیکی خویش و اقارب موجود نہیں جو اُس کی مدد کریں
آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں۔ خود ضعیف ہے اور اس صدمہ نے زیادہ
ناتوان کر دیا ہے۔ عورتوں اور بچوّں کا بوجھ اُسکے سر پر ہے۔ وہ دیوار
کے ساتھ لگ کر بہ چشم پُر نم بیٹھا ہے اور باوجود اس کے کہ قانع اور
سمجھدار ہے تمام دنیا اُس کی نظر میں تیرہ و تار ہے۔ وہ اُس کی جوان
بیوہ کو دیکھتا ہے۔ کبھی معصوم چھوٹے بچّے کی طرف حسرت کی نگاہ
ڈالتا ہے۔ کبھی اپنی بیوی کی تکلیف کا خیال کرتا ہے۔ وہ کبھی اپنے
پیارے بیٹے کی قبر اور کبھی اُسکی موت کی گھڑی کو یاد کرتا ہے۔ اتنے
میں ایک دوست جو بچپن سے اُس کا دلی رفیق ہے اور اُسکے ساتھ
مکتب کے دنوں میں ملکر کھیلا ہوا ہے اُسکے پاس آتا ہے۔ اُسے تسلّی دیتا
ہے۔ اپنی توفیق کے بموجب اُس سے مدد کا وعدہ کرتا ہے۔ اُسے
اپنے اور اَوروں کے دُکھ سُنا کر یہ جتاتا ہے کہ یہ دنیا میں اچنبا واقعہ
نہیں اور خدا کی ناراضگی۔ اُسکے امتحان اور وعدوں کو یاد کراتا ہے
وہ اپنے دوست کے دل کو خوب جانتا اور اُسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔
اُس شخص کے آنے اور ایسی باتیں کرنے سے ایک عجیب تبدیلی اُسمیں
پیدا ہو گئی ہے۔ وہ دل جو غم کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا جس پر مایوسی
کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اپنے سامنے اُمید کی جھلک دیکھتا ہے۔ اُس کے
دل کی کیفیت ہی اَور ہو گئی ہے۔ اُس کی مایوسی پھر شکریہ میں متبدل

ہو گئی ہے۔ یوسفؑ کے فراق میں زلیخا کے دل کو تسلّی دینے والی صرف
اُمید ہی نہ تھی جیسا شاعر کہتا ہے۔ ؎

بجز اُمید کہ ایمانِ عشق کیشان است
کسے نہ داد تسلّی دل زلیخا را

بلکہ اُس کے دل کی بڑی ڈھارس تھیں اُس کی سہیلیاں۔ دیکھیے
نہ کہ بی زلیخا یوسف کے عشق میں ایک دن بھی جیتی اگر اُس کی سہیلیاں
اُس کے دل کی رفیق نہ ہوتیں۔ مانا کہ اُمید کو بہت دخل تھا مگر کہانتک
ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں ایک دوست کی جوانمردی کا واقعہ
ملتا ہے جو تاریخ کے آسمان پر ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہے۔
ہماری مُراد بیرم خاں کے دوست کی جاں نثاری سے ہی۔

اثر

یہ بات تو مسلّم ہے کہ دنیا میں ایک انسان کے اقوال و افعال دوسرے
پر ضرور اثر کرتے ہیں۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے
تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی کہ قدرت نے اُسے تربیت پذیر بنایا ہے کسی
شخص نے پیدایش سے کیسے ہی اچھے قویٰ کیوں نہ حاصل کیئے ہوں
اُن قویٰ کا نمو ہونا ناممکن ہی جبتک وہ سوسائٹی میں نہ رہے اور تربیت
اُن کو جلا نہ دے۔ پھر آگے سوسائٹی جسقدر ترقّی یافتہ اور علوم و فنون

اور اخلاق میں ممتاز ہوگی عموماً اُسی نسبت سے اُسکے افراد بھی برگزیدہ ہونگے۔ اس کی مثالیں نہ صرف تاریخ عالم کے ہر صفحہ پر ملتی ہیں۔ بلکہ ہر شخص اپنی روزانہ زندگی میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ایک انسان کے اقوال و افعال دوسرے پر اثر کرتے ہیں۔ مگر ایک تیسری چیز ہے اور وہ خیالات ہیں۔ نہ وہ خیالات جو زبان یا قلم سے ظاہر ہوتے ہیں بلکہ جو خاموشی سے انسان کے دماغ میں بنتے رہتے ہیں۔ یہ خیالات دل پر ایک قوی اثر رکھتے ہیں۔ بلکہ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ لوح دل ہر وقت ان خیالات سے نقش حاصل کرتا رہتا ہے اور پھر نہ صرف اقوال و افعال کو خاص سانچے میں ڈھالتا رہتا بلکہ اسمیں ایک برقی طاقت پیدا کرکے اُس میں سے ایک رو جاری کردیتا ہے جو اُسکے اردگرد کے لوگوں پر ہر وقت اپنا اثر کرتی رہتی ہے۔ جہاں کہیں وہ جاتا ہے اور جس شخص سے ملتا ہے اُس پر یہ طاقت اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اگر خیالات فاسد ہیں نفرت غضب حسد طمع اور ایسے ہی ناپاک جذبات سے پیدا ہوئے ہیں تو دل بھی ویسے ہی نقش قبول کرکے دوسروں پر اپنا بُرا عکس ڈالتا رہتا ہے وہ اُس شخص کی طرح ہے جیسے کوئی وبائی بیماری ہوئی ہو کہ جہاں جاتا ہے جس کے پاس بیٹھتا ہے اُس کی بیماری دوسرونکو لاحق ہوجاتی ہے اور اُس کی زہر دوسروں کو چڑھتی رہتی ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی زہر اپنے بچّوں کو

دیتا ہی جس سے گویا وہ اپنی بدی کی دُنیا میں دوامی بنیاد رکھتا ہے - پھر اُسکے دوسرے متعلقین اور ہمنشین درجہ بدرجہ متاثر ہوتے ہیں اور جب اُس کے اپنے دل میں بدی راسخ ہو جاتی ہے تو اُس میں بُرے اور بھلے میں تمیز کرنے کی طاقت زائل ہونی شروع ہوتی ہے اور نہ صرف وہ اپنے خیالات اور افعال کو اچھا سمجھنے لگتا ہی - بلکہ اُس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اور لوگ بھی ویسے ہی ہو جائیں - اور یہ مدنی الطبع ہونیکی ایک ضروری خاصیت ہی - غرض جس طرح پانی میں ایک کنکر پھینکیں تو اُس سے فوراً چاروں طرف چکّر بن کر پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں اور دور دور تک چلے جاتے ہیں - اسی طرح انسان کی نیکی بدی کا حال ہی کہ ایک شخص اپنے خیالات سے بعض اوقات ہزاروں اور لاکھوں بندگان خدا کے دلوں کو ناپاک کرکے سوسائٹی کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیتا ہے - یا لوگوں کی زندگی کو تلخ کرکے دنیا میں رنج و مصیبت کو بڑھاتا ہی - دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے دماغ محبّت - پاکیزگی - ہمدردی - فیّاضی کے خیالات کے مرکز ہوتے ہیں - وہ خیالات اُن کے دل کو ہر وقت منوّر کرتے ہیں اور اُس نور کی شعاعیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور اپنے گرد اندھیرا ہو تو اُجالا اور اگر اُجالا ہو اُسے دوبالا کر دیتا ہے - خیالات کا اثر اقوال اور افعال پر تو کبھی ہونے سے رہ ہی نہیں سکتا مگر اُنکے پرتو سے دل میں جو طاقت پیدا ہو جاتی ہی وہ خود بخود دوسروں کے

دلوں پر قبضہ پاتی جاتی ہی۔ اُن کا دل ایک سنگ مقناطیس کیطرح
بن جاتاہے کہ دوسرے تمام دل اُس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اوراگرچہ
اس دنیامیں ناپاک اور بدکردار لوگوں نے ہرزمانہ میں سوسائٹی کے دلونکو
آلودہ کرکے تمام بنی نوع انسان کے لیئے رنج والم کا بے حد سامان جمع کردیا
ہے۔ مگرتاہم ہرملک اور ہربستی میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں
جنہوں نے اپنے اثر سے دوسروں کے دلوں کو تسخیر کیا ہی اور اُن کو
بدی سے باز رکھکر اُن کے لیئے خوشی اور راحت کی دولت بہم پہنچائی
ہے۔ ایسے لوگوں نے بھی دنیا کی تاریخ میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔
تمام نیک لوگ۔ کُل پیغمبر۔ رشی۔ اولیا اور بزرگان دین۔ اور مشہور مقرّر۔
اور واعظ وغیرہ اسی زمرہ میں گنے جاتے ہیں۔

جو لوگ اپنے دل میں اثر کا مادہ پیدا کرتے ہیں وہ نہ صرف نیکی اور
سچائی کو اپنا دستورالعمل بناتے ہیں۔ بلکہ دل سے اُن کو پسند کرتے
اور اُن پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بنی نوع کی محبّت
جاگزیں ہوتی ہی۔ بھلائی کرنے میں اُنہیں خوشی ہوتی ہے۔ وہ کسی سے
نفرت نہیں کرتے۔ وہ دلسوزی سے ہرایک کو نصیحت کرتے ہیں۔
جہاں تک بن پڑے اُن کا بوجھ خود بانٹتے۔ لوگوں کی آفرین ونفرین
سے وہ اپنے آپ کو برتر رکھتے یا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرونکی
خوشی میں اپنی خوشی۔ اور دوسروں کے رنج میں اپنا رنج پاتے ہیں۔ وہ
حسد وبغض اور تعصّب کو کبھی اپنے دل میں لگنے نہیں دیتے۔ اور اپنے

ملکی قوتوں سے اُن کے ساتھ لڑتے رہتے ہیں۔ بدی سے مقابلہ کرنے میں اگر اُن کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں تو وہ مایوس نہیں ہوتے اور ہمیشہ یہی خواہش رکھتے ہیں کہ ہم دنیا کو چھوڑنے سے پہلے اُسے کچھ نہ کچھ اچھی حالت میں چھوڑ جائیں۔ یہی سچّی معرفت ہی اور یہی حقیقی خدا پرستی ہے۔

ہندوستان کو اس بات کا فخر حاصل ہی کہ قدیم زمانہ میں اس سرزمین نے ایسے بہت لوگ پیدا کئے جنھوں نے اپنے اپنے وقت اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنے بنی نوع کو بہت کچھ متاثر کیا ہندوؤں کے بزرگوں نے تو اسے اُس معراج پر پہنچا دیا تھا کہ شاید ہی کسی قوم نے وہ درجہ حاصل کیا ہو۔ اسی طرح اسلام کے صوفیائے کرام میں ایسے جلیل القدر بزرگ ہو گذرے ہیں جن کا وجود اپنے زمانہ کے لوگوں کے لیئے رحمت سے کم نہ تھا۔ اُن کی ایک نظر سے بڑے بڑے شقی موم ہو جاتے تھے۔ اُن کے فیضِ صحبت سے شیطان فرشتہ سیرت ہو جاتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بیٹھ گئے وہیں اپنے اردگرد کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے۔ بے تعصبی اور عام محبّت کی مثال قائم کرتے اور اپنی ساری زندگی اُن کی اصلاح اور بھلائی میں صرف کر دیتے اُن کے لیئے ہندو۔ گبر۔ نصاریٰ۔ اور مسلمان سب ایک سے تھے وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتے نہ یہ کہ کس ملک اور کس مذہب کا ہی۔ سچ اُن کا مذہب اور محبّت اُن کا ایمان تھا۔

مگر کیا اب ایسے لوگ دُنیا سے مفقود ہو گئے ہیں یا خدا نے انسان سے وہ روحانی ملکہ ہی چھین لیا ہے۔ نہیں اب بھی صاحب اثر لوگ دنیا میں موجود ہیں مگر افسوس کہ کم ہیں۔ اُن کے لئے جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے نہ کسی مذہب کی تخصیص ہے نہ لباس کی نہ زبان کی۔ وہ عیسائیوں میں ہو سکتے ہیں۔ اور ہندوؤں میں بھی۔ اور مسلمانوں میں بھی۔ کوٹ پتلون میں بھی برہنہ فقیر میں بھی۔ ڈاڑھی منڈوں میں بھی اور مقطّع صورتوں میں بھی۔ ہر شخص میں وہ ملکہ موجود ہے۔ اور وہ ہر وقت بُرا یا بھلا اثر بکھیرتا پھرتا ہے۔ مُبارک ہے وہ ملک یا وہ قوم جس میں بہت ایسے لوگ ہوں جو ہر وقت اپنے بنی نوع کی بہتری کے خیالات اپنے دلوں میں جگہ دیئے ہیں جو اپنے ہم جنسوں میں بے ریا الفت اور بے تعصبی پیدا کرنے میں سرگرم ہیں۔ اِس کیلئے نہ جگہ کی قید ہے نہ کسی حیثیت کی ضرورت ہے نہ فرصت ضروری ہے۔ ہر شخص اپنے دل کا مالک ہے اور ہر شخص کے جسم میں خیالات کا دل کے ساتھ راز و نیاز کا سلسلہ جاری ہے۔ نہ اسکے لیئے چِلّے کاٹنے کی ضرورت ہے نہ تارک الدنیا ہونے کی۔ موچی جو جوتیاں سیتا۔ اور مزدور جو مٹی ڈھوتا۔ دوکاندار جو سودا بیچتا اور کلرک جو دفتر میں حساب کتاب کا کام کرتا۔ اور معلّم جو لڑکوں کو پڑھاتا۔ اور جج جو لوگوں کے جھگڑے چُکاتا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر دست بکار و دل بیار ہو کر اپنے آپ میں قوائے ملکی پیدا کر سکتے ہیں۔

تاریخ عالم کے اوراق

تمہید - یہ بات مسلّم ہو کہ کیا افراد کیلئے اور کیا اقوام کیلئے گذشتہ زمانہ آیندہ کیلئے بمنزلہ مشعل یا رہنما کے ہوتا ہو اور اسی کا نام تجربہ ہی۔ یہی تمام ترقی کا اصل اُصول ہے۔ اگر ہر نسل کو اپنے لیئے نئی ایجادیں کرنی پڑیں نئے تجربات حاصل کرنے پڑیں تو علم اور تہذیب میں ترقی مُحال بلکہ ناممکن ہو جائے ہمیشہ سے یہی سلسلہ چلا آیا ہے کہ آنیوالی نسلیں پیش رفتگان کے حالات سے سبق لیتی ہیں اور اُن کی جانفشانیوں اور محنتوں سے مستفید ہوتی ہیں۔ جن باتوں سے اُنہیں نقصان ہوا ہے اُن سے پرہیز اور جن سے اُنھوں نے تمتع حاصل کیا اُنہیں اختیار کرتی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیشہ اسی خیال سے ہونا چاہیے۔ زمانۂ حال کے مورخوں نے اس باب میں بہت کچھ جدّوجہد کی ہے اور تاریخ کو ایک نہایت ہی ضروری اور اہم علم بنا دیا ہی ہم نے اہل ملک کے استفادہ کیلئے یہ ارادہ کیا ہی کہ کبھی کبھی قدیم تاریخ عالم میں سے بعض دلچسپ اور پُرعبرت سین ہدیۂ ناظرین کریں۔ ہم اس سلسلہ کو مصر قدیم کے حالات سے شروع کرتے ہیں جس کی تہذیب سب سے قدیم تہذیب سمجھی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہو ہمارا مُدعا صرف یہی ہی کہ اُن وسیع نتائج کو پیش نظر رکھیں جو قومی عروج اور انسانی ترقی کیلئے

لاُبد ہیں ؛

مصر کا جغرافیہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسکے طول میں جو تقریباً چھ سو میل ہے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو کبھی تو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آجاتی ہیں اور کبھی ہٹ جاتی ہیں۔ اگر کل لمبائی میں وادی کی اوسط لی جائے تو اسکی چوڑائی سات میل بنتی ہے۔ شمال میں یہ وادی بہت وسیع ہوجاتی ہے جہاں بحیرۂ روم کی موجیں اس کے خشکی کے کنارے پر رات دن تھپیڑے مار رہی ہیں۔ اسکے وسط میں دریائے نیل چکّر کھاتا اور شور کرتا چلا جاتا ہے جس کے اُتار اور چڑھاؤ کے کرشمے اس ملک کے فلاح وزیان کے ساتھ ہمیشہ ایسے وابستہ رہے ہیں کہ گویا لازم وملزوم ہیں۔ جاڑے اور بہار کے موسموں میں دریا اُتر جاتا ہے۔ گرمی میں طغیانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ تمام وادی گویا ایک جھیل بنجاتی ہے اور فصلیں بالکل بہ جاتی ہیں۔ مصنوعی گاؤں پانی کے سطح پر تیرتے پھرتے ہیں۔ مگر قدیم مصری اس آفت کو خدا کی اَن ٹل مرضی سمجھ کر اس پر شاکر ہوجاتے اور جب کوئی کام کاج نہ رہتا تو میلوں تماشوں اور دل لگیوں میں اپنا وقت گذارتے بیلوں کو لڑاتے۔ کشتیوں پر سوار ہوکر گاتے بجاتے اور دریا کی سیر کرتے اور مل کر ضیافتیں اُڑاتے۔ پیشوایانِ مذہب اپنے چوغے اور عمّامے پہنکر دریا میں نکلتے اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے دریا میں سونے کے چڑھاوے چڑھاتے کیونکہ پانی ہی سے اُن کی

بقا تھی ورنہ قدرتی طور پر مصر ایک ریگستانی صحرا ہے اور یہ اسی دریا کا فیض ہے کہ ہر سال اسے باغ بنا دیتا ہے۔

چڑھاؤ کے اُتر جانے پر کسان زمین میں بیج پھینک دیتے اور پھر بےفکر ہو جاتے کیونکہ اس پر نہ صرف اُنکی محنتوں کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ دوسری فصل تک اُن کو پانی کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ فصل کیلئے اب ایک چیز کی ضرورت باقی ہے وہ آفتاب ہے اور مصر میں آسمان پر بادل کبھی نام تک کو دکھائی نہیں دیتا۔ غرض تخم ریزی کی چند روز کی محنت کے بعد مصریوں کو باقی تمام سال کی فرصت اور فارغ البالی نصیب ہوتی ✣

یہاں اس بات کو مدّنظر رکھنا چاہیے کہ کسی قوم کی ترقی کیلئے فرصت کی دولت نہایت ہی ضروری ہے۔ اور جس قوم کو دوزخ شکم بھرنے کے لئے شبانہ روز کی محنت سے فرصت نہ ہو وہ کبھی اپنی پستی سے نہیں نکل سکتی۔ اگرچہ یہ بھی جتا دینا ضروری ہے کہ صرف فرصت ہی ایک چیز نہیں ہے جس سے بنی نوع انسان ترقّی کے مدارج حاصل کر سکتا ہے کیونکہ انسانی ترقّی کیلئے سب سے اوّل اور لابدی یہ شرط ہے کہ ایک قوم ایک خاص ملک یا سرزمین میں بس کر وہاں رہائش اختیار کرے اور خانہ بدوشی کو ترک کر کے اُسی خاک کی ہو رہے۔ اس کے بعد اُس بڑے معلّم کی باری آتی ہے جو کُل ایجادوں کی ماں ہے یعنی احتیاج "بھوک"

"تنگدستی" یا اور دوسرے مصائب و با وغیرہ۔

مصری گویا ایک جزیرے میں رہتے تھے اور باقی دنیا سے بالکل الگ تھے۔ اور اسی وادی کی پیداوار پر ان کے بقائے کا انحصار تھا۔ اور یہ اُن کی ترقی کے لیئے ایک فال نیک اور خوش نصیبی تھی کہ مصریوں کو کبھی کبھی اپنے ملک کی پیداوار میں ناکامی ہوتی۔ کیونکہ اگر ہمیشہ اُن کو پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تو وہ قیامت تک ایک نیم وحشی حالت میں رہتے۔

اگرچہ زمانۂ قدیم میں دنیا کے کسی ملک میں اس قدر ارزانی اور کثرت سے غلّہ پیدا نہ ہوتا تھا جتنا کہ مصر میں۔ مگر تاہم خدا کی شان ہے کہ وہاں بھی قحط پڑتے تھے۔ جب نیل کی طغیانی زور سے ہوتی تو غلّہ افراط سے پیدا ہوتا۔ اور جو کبھی کبھی طغیانی میں کمی ہوتی تو غلّہ بھی کم ہوتا۔ مگر جیسا کہ قاعدہ ہے ارزانی کے موسم میں آبادی بہت جلد بڑھ جاتی اور قحط کے زمانہ میں نسبتاً ویسی ہی تکلیف زیادہ ہوتی اور موت کا بازار ایسا گرم ہوتا کہ ملک میں میدان جنگ کی طرح جا بجا لاشوں کے ڈھیر بن جاتے اور ہزاروں مُردے دھوپ میں گل اور سڑ جاتے جو چند جانیں ایک گاؤں میں بچ رہتیں وہ جنگل کی جھاڑیاں اور اپنے ہمجنسوں کی لاشوں پر گذارہ کرتیں۔

مگر ایسی آسمانی بلاؤں سے جو لوگ جانبر ہو جاتے ہیں وہ نہ صرف قوّتِ جسمانی میں دوسروں سے برتر ہوتے ہیں بلکہ قدرت نے اُن کو

دماغ بھی معمول سے اچھے عطا کیئے ہوتے ہیں۔ پس ان قحطوں میں جو لوگ
بچ جاتے اُن کو اپنے ملک کی آیندہ بہتری کے وسائل سوچنے کا موقع ملتا
اُنہوں نے نیل کی بیقاعدہ طغیانیوں اور بے وقت اُتار چڑھاؤ کے اسباب
پر غور کیا اور اُن کے بُرے نتائج سے محفوظ ہونے کیلیے تدابیر سوچنی شروع
کیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کے اُس حصّے کے جو پانی کے متعلق ہے
اور جسے علم الماء یعنی Hydrostatics کہتے ہیں۔ تمام اُصول اُنہوں
نے دریافت کر لیئے۔ اور اُن کی مدد سے دریا کے بہاؤ کو باقاعدہ بنانے
کے لیئے اور قحط کے مصائب سے نجات پانے کے لیئے اُنہوں نے پشتے
اور پانی کے ذخیرے (Reservoirs) اور نہریں بنالیں جن سے
تمام ملک کو پانی بٹ کر ملنے لگا اور طغیانی کے موسم میں خشکی کے لیئے پانی
جمع کر لیا جاتا۔ علاوہ ازیں طغیانی کے باعث زمینوں کی حد بندیاں بہ
جاتیں جس سے اُن کو پیمائش Survey کی ضرورت محسوس ہوئی۔
پھر پانی کے مد کا جب غور سے مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ستاروں
سے بھی کچھ تعلق ہے۔ جس سے علم نجوم Astronomy کی بنیاد پڑی
اور شمسی سال دریافت ہوا اور رفتہ رفتہ علم زراعت علم ہندسہ کا
ایک ضمن بنگیا۔

مگر جب ان باتوں کی تفتیش شروع ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
عوام الناس میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک دماغی کام کرنے والے
یعنی موجد بن گئے۔ جو بعد ازآں مشیران و مدبّران سلطنت ہو گئے

اور دوسرے وہ جو ہاتھ سے کام کرتے اور عام رعایا بن گئے۔

جہاں یہ تفریق پیدا ہو رہی تھی وہاں وقت کی ضرورت ایک اور گروہ پیدا کر رہا تھا جو بعد ازاں فوج بن گیا۔ اور اُس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جنگل کے چرواہے ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے کہ دریا کے کنارے پر رہنے والوں کا مال چھین چھان کر اپنے قبضہ میں کرلیں کیونکہ پانی کے قرب کے باعث اُن کی فصل بہت اچھی ہوتی اور یہ بہت خوش حال اور دولتمند ہو گئے۔ پس فصل کاٹنے کے وقت ان پر جب بادیہ گردوں کے حملے ہونے لگے تو اُن کو اپنے مال کی حفاظت کی ضرورت ہوئی جس سے ایک ملٹری یا جنگی گروہ بن گیا۔ جو رتبہ میں موجدوں یا عالموں کے بعد گنا گیا مگر عوام الناس سے برتر رہا۔ یہاں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قدیم زمانہ میں علم یا سائینس اور مذہب میں کوئی تفریق یا اختلاف نہ ہوتا تھا اور وہی لوگ مذہبی پیشوا ہوتے جو مختلف علوم میں دستگاہ پیدا کرتے تھے۔

اس زمانہ سے پہلے سب لوگ یکساں تھے۔ کوئی شخص دوسرے پر کوئی فوقیت نہ رکھتا تھا۔ مگر ضرورتوں نے جب یہ تمیز پیدا کر دی اور انسانوں کے گروہ الگ الگ ہو گئے تو حکومت اور محکومیت کی بنیاد پڑ گئی۔ ایک حاکم بنا اور دوسرا محکوم۔ ایک آقا اور دوسرا غلام۔ علماء فتویٰ دیتے سپاہی اُسے جاری کرتے۔ اور عوام اُس پر کاربند ہوتے۔

(باقی آئندہ)

انگلستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

انگلستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک ہزار سال کی متواتر اور بتدریج رفتار سے یہ قوم اپنی موجودہ حالت پر پہنچی ہے ۔ اور جو آزادی آج اُن کو نصیب ہے اُس کا بیج ہزار سال پہلے ڈالا گیا تھا ۔ میرا یہ خیال ہے کہ روما والوں کی مہذب حکومت نے گویا اسکی بنیاد دلوں میں قایم کر دی تھی اور اگرچہ آج تک ہم تخت انگلستان پر ایک بادشاہ کو جلوہ آرا دیکھتے ہیں مگر آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ بادشاہ درحقیقت قوم کا ایک تنخواہ دار ملازم ہے جو سلطنت کے خاص خاص فرائض کو رعایا کی مرضی کے مطابق سرانجام دیتا ہے اور بجائے اس کے کہ قانون اُسکی امپیریل مرضی کے زیر عنان ہو وہ رعایا کے بنائے ہوئے قانون کا سب سے بڑا مؤید و حامی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں بادشاہ کے اختیارات محدود ہوتے گئے ویسے ہی رعا کی آزادی اور جمہور کی طاقت بڑھتی گئی اور اب جو قانون ملک کیلئے بنتا ہے کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے ہر فرد کا اُس میں حصہ ہے برخلاف اسکے ہندوستان کو یہ آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی ۔ اور نہ اسکے حالات شروع سے ایسے رہے ہیں کہ ملک میں خود بخود

اس قسم کی کوئی تحریک ہوئی - جو آزادی انگریزوں کی بدولت آج ہمیں
نصیب ہے وہ محض اُس قوم کی فیّاضی اور نیکی کا نتیجہ ہے - ہم تو
ایک خواب خرگوش میں سو رہے تھے اُنھوں نے وہ چیز جو ہزاروں
کا خون بہاکر اور عمروں کی جانکاہ کوششوں سے حاصل کی تھی ہمکو
بن مانگے لادی - اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس نعمت کی قدر کریں اور
اس سے کما حقّہ فائدہ اُٹھائیں - اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آزادی اور یہ
قوانین ہم کو بہت مہنگے داموں ملے ہیں - مگر انصاف کی نظر سے
دیکھا جائے تو یہ ہمارا یا ہمارے بدنصیب حالات کا قصور ہے -
ترقّی کے میدان کھلے ہیں اور ہمیں پکار پکار کر کہا جا رہا ہے کہ ہاں
کمریں چست باندھو اور اس میں حصّہ لو - اس میں شک نہیں کہ
ابھی بہت سی رکاوٹیں ہمارے راستہ میں موجود ہیں - مگر ممکن نہیں کہ
ملک اپنی حالت کی بہتری کی طرف توجہ کرے تو وہ رُکاوٹیں طرفۃ العین
میں دور نہ ہو جائیں - ایک اور قوی وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی قوانین
اور انگریزی آزادی سے ہم پورے پورے بہرہ مند نہیں ہو سکتے
اور وہ یہ ہے کہ یہ قوانین اور یہ آزادی اس ملک کی پیداوار نہیں ہیں
ایک غیر ملک میں اس کا بیج بویا گیا - غیر ملک کی آب و ہوا میں اس شجر
نے نشوونما پائی اور اب غیر ہاتھوں نے یہاں لاکر اسے گاڑا - ہرچند
ہندوستان کی زمین بہت شاداب ہے اور مادۂ قبولیت بہت
بڑھا ہوا ہے - مگر پھر بھی صدیاں چاہئیں کہ یہاں کی آب و ہوا اسکے

موافق آئے۔ یہ بڑھے۔ شاخیں نکلیں اور عمدہ عمدہ پھل دینے لگیں۔
اور یہ اُس صورت میں ہوسکتا ہے کہ جس باغبان نے اس پھل کو گاڑا
ہے وہی اس کی نگرانی کرے۔ وقتاً فوقتاً اُس کی فضول شاخوں
اور پتّوں کو کاٹتا رہے کیونکہ بغیر اسکے کبھی کوئی درخت نہ خاطر خواہ
ترقّی کرسکتا ہے اور نہ اچھّا پھل لا سکتا ہے۔ حضرات ہم روزا خباروں
اور رسالوں میں دیکھتے ہیں کہ انگلستان میں بھی بعض اوقات آزادی کا
بے محل استعمال کیا جاتا ہے اور مدبّرانِ ملک اور اہل الرائے کو اندیشہ
ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ زہریلے مواد ترقی کرکے تمام قومی جسم کو خراب نہ
کردیں۔ اور اس لیئے وہ فوراً اسکی اصلاح کی تجاویز سوچکر اُس کو
وہیں روک دیتے ہیں۔ آزادی کے بے محل استعمال اور بُرے نتائج سے
میری مراد ہے سوشلزم۔ نہلزم۔ اور انارکزم سے جو یورپ کے ہر ملک میں
کسی نہ کسی صورت میں جلوہ دکھا رہے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ان میں
بعض نہایت مخلص اور نیک دل لوگ بھی شامل ہیں اور وہ جو کچھ کرتے
ہیں اپنی دانست میں خلق اللہ کی بہتری کیلیئے کرتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے
کہ اس خیال کو کہ سب انسان ایک جیسے ہیں اور سوسائٹی میں سب کے
حقوق برابر ہونے چاہئیں وہ بہت دور لے گئے ہیں اور جس کام کے
لیئے ہزاروں سال کی لگاتار محنت اور قومی تعلیم کی ضرورت ہے
وہ جھٹ پٹ کرنا چاہتے ہیں۔ جو بالکل خلاف عقل اور خلاف
تدبیر ہے *

میں نے یہ دکھانیکی کوشش کی ہے کہ کیا انگلستان اور کیا ہندوستان ان دونوں ملکوں کی حالت میں طبعی پواعث کو بہت بڑا دخل ہے اسکے بعد میں نے یہ دکھایا ہے کہ ان دونوں ملکوں کی طرز حکومت کیسی رہی ہے اور اُس کے کیوں مختلف نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ اب میں انگریزوں کی قوم کی چند اور ترقیات کا ذکر کرکے دکھانا چاہتا ہوں کہ ہم کو اُن سے کیا نسبت ہے۔ اور ابھی ہمیں اُن سے کیا سیکھنا ہے اور جب یہ معلوم ہوجائیگا کہ ہمیں اُن سے کیا سیکھنا ہی تو اُس سے خود بخود دونوں کی حالت کا مقابلہ ہوسکتا ہے۔

حضرات میرے نزدیک سب سے بڑی خوبی انگریزوں کی قوم میں قومی ہمدردی ہے۔ جسے وہ Sentiment کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے لیئے ملکی ہمدردی اور قومی ہمدردی ایک چیز ہے۔ تمام قوم کا ایک دل ہے اور ایک نبض ہے۔ حالانکہ یہ قوم آج تمام روئے زمین پر بکھری ہوئی ہے اور خواہ اُن میں کیسے ہی مختلف الخیال لوگ کیوں نہ موجود ہوں۔ مگر جس شخص کی رگوں میں انگریزی خون ہے وہ ہر وقت اپنے ملک اور اپنی قوم پر جان نثار کرنے کو تیار رہی۔ جو جو جان نثاریاں انگریزوں نے اپنی قوم اور ملک کے لیے کی ہیں بدنصیب ہندوستان کو خدا جانے وہ دن کبھی نصیب ہو یا نہ ہو کہ ملک کی محبّت اسکے باشندوں کے رگ و پے میں ایسی سرائیت کر جائے جیسے انگریزوں میں انگلستان کی محبّت سرائیت کر گئی ہی۔ مگر اس کا تو ذکر ہی بیوقت کی

راگنی ہی۔ یہاں قومی فیلنگ جو مذہب پر مبنی ہے صرف نام ہی کو رہ گئی ہے۔ اور خصوصاً اُس قوم میں جس میں ہم سب اپنے آپکو شمار کرتے ہیں +

ملکی ہمدردی کے بعد جس چیز نے انگلستان کو سرفراز کیا ہے وہ تعلیم اور قومی تعلیم ہے۔ انگریزی لٹریچر کی تاریخ جن لوگوں نے پڑھی ہے اُنہیں معلوم ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ دلچسپ زمانہ جب اکبر اپنی دلپذیر پالیسی سے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخّر کر رہا تھا۔ اور ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت انگلستان کے لوگوں میں جہاں جہاز رانی اور تجارت کا شوق عروج پر تھا وہاں ساتھ ہی ایک عجیب علمی ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونان اور روما والوں نے جو علم کے بے بہا خزانے چھوڑے تھے وہ انگلستان میں لائے گئے اور اُن کو انگریزی لباس پہنایا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ ملک میں تعلیم کا چرچا زیادہ عام ہو گیا اور جب دماغ خیالات سے پُر ہو گئے تو ترقّی ہونی شروع ہوئی اور اپنی زبان میں تصنیفات ہونی شروع ہوئیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ملکِ خیال کا وہ شہنشاہ پیدا ہوا جس کا نام دُنیا کی یاد سے کبھی نہیں بھُول سکتا اور جس کا کلام انگریزی علم ادب کے لیے ہمیشہ فخر رہیگا۔ کون ہے جو انگریزی جانتا ہو اور شکسپیئر کے نام سے ناآشنا ہو۔ اسی زمانہ میں بیکن نے جدید فلاسفی کی عمارت کا پتھر رکھا۔ جس نے گویا دنیا کے طریقِ خیال کو ہی بالکل بدل دیا

اور طبیعات میں جو ترقی یورپ نے کی ہے اور جس قدر ایجادیں اور نئے فنون پیدا ہوئے ہیں یہ سب Individualistic method کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔ القصہ اس زمانہ میں تعلیم کا ایسا چرچا ہوا اور اُس کے ایسے اچھے نتائج نکلنے شروع ہوئے کہ یہ بات ہر ایک انگریز کے دل پر منقش ہو گئی کہ کیا قومی ترقی اور کیا ذاتی مفاد کیلئے تعلیم سے بڑھکر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے خدا مل سکتا ہے تو اس سے کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔ دنیا کے خزانے حاصل ہو سکتے ہیں تو اس سے۔ اور وحشی سے وحشی اور جنگجو سے جنگجو قوم پر تسلّط ہو سکتا ہے تو اس سے۔ آبِ حیات ہے تو یہ ہے اور کیمیا ہے تو یہ ہے۔ انگلستان کی پچھلی چند صدیوں کی تاریخ ڈنکے کی چوٹ اس بات کی شہادت دے رہی ہے۔

نری تعلیم کبھی ایسی بکار آمد نہ ہوتی اگر انگریز قومی تربیت کا جسے national character کہتے ہیں شروع سے خیال نہ رکھتے اور اُس کے لیئے اپنے ملک میں نہایت اعلیٰ درجہ کا انتظام نہ کرتے۔ یہ وہ تربیت ہے جس نے قوم کو ہمیشہ کیلئے ایک رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور اپنے بھائیوں کی ہمدردی کو دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اس کے حاصل کرنے کیلئے سب سے بڑا وہ مکتب ہے جو ہر ایک بچہ پیدا ہو کر ماں کی گود اور گھر کی چار دیواری میں دیکھتا ہے۔ اس مکتب میں مدبّرانِ ملک قومی ہیرو اور جنرل تیار کیئے جاتے ہیں اور جو کمی یہاں باقی رہجاتی ہے اُسے انگلستان کی قومی یونیورسٹیاں پورا کر دیتی ہیں۔

ڈیوک آف ولنگٹن جب واٹرلو کے میدان میں ظفریاب ہو کر اپنے
Eton College کو جہاں اُس نے تعلیم پائی تھی دیکھنے کیلئے
آیا تو اُس نے بڑے فخر سے اس بات کو بیان کیا کہ اسی کالج کے کرکٹ
اور فٹ بال کے میدان میں واٹرلو فتح ہوا ۔

جب ہم ہندوستان کی طرف آتے ہیں تو پھر اسی قوم کا شکریہ
ادا کرنا واجب آتا ہے کہ یہ قوم جس کے دلوں کو تعلیم نے فیاض اور
ہمدردِ بنی نوع بنا دیا تھا بیدریغ اپنے تمام علوم اپنے ہمراہ لے آئی اور
ہمیں سکھانے شروع کر دیئے۔ کسی بات کو ہم سے چھپا نہیں رکھا۔ آج
عمدہ سے عمدہ کتاب جو انگلستان میں ملسکتی ہے وہ ہندوستان میں
بھی مہیّا ہو سکتی ہے۔ انگریز پڑھانے ولے یہاں موجود ہیں۔ انگلستان
کی اعلےٰ سے اعلیٰ یونیورسٹی میں ہندوستانی خود جا کر تعلیم حاصل کر سکتا ہے
اور اگرچہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی سمجھ کے بہت
اچھے ہیں۔ زود فہم۔ اخذ جلدی کر لیتے ہیں۔ مگر اب تک مغربی تعلیم نے
ان پر جو اثر کیا ہے وہ ہرگز خاطر خواہ نہیں ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ
اب تک صرف تعلیم ہی تعلیم رہی ہے۔ اور اس کا مقصد صرف سرکاری
ملازمت رہا ہے اور قومی تربیت جو قوم کو قوم بنانے کے لیئے درکار ہے
نہ ہندو اور نہ مسلمان کسی نے نہیں سیکھی۔ مگر اس جانب توجہ ہوتی جاتی
ہے اور اگر اہلِ ملک نے سعی کی تو قوی اُمید ہے کہ ہندوستان کے
دن پھر آویں۔ اب تک اگر انگریز یہ کہیں تو واجب ہے۔

زمین شور سنبل برنیارد   درو تخم عمل ضائع مگرداں

غرض ہندوستان کو ضرورت ہو قومی تعلیم اور تربیت کی جسکے لیئے قومی اعلیٰ درجہ کی درس گاہوں کی ضرورت ہے۔ مگر اس ضمن میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کبھی تعلیم یافتہ اور مہذب نہیں ہو سکتا جب تک اُناث کی تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ کی جاوے۔

مشرق اور مغرب کا مقابلہ کرتے ہوئے جو نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی ترقی اور قومی زندگی میں اُناث کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ مغرب میں بھی اُمور سلطنت میں ابھی عورتوں کا عملی دخل نہیں ہوا مگر تعلیم کے علاوہ جو عزت مغربی قومیں اور خصوصاً انگریز اپنی عورتوں کی کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں اُن کے حقوق کی جو نگہداشت ہوتی ہے مشرق میں اُس کا ایک شمہ بھی نہیں ہے۔

حضرات اگرچہ میرا مضمون طویل ہوتا جاتا ہے۔ مگر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ عورتوں اور مردوں کے رشتہ کو کچھ زیادہ وضاحت سے بیان کروں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک نازک مضمون ہے اور شاید بہت سے اصحاب

(افسوس آگے ندارد)

دلِ افسردہ

پشاور۔

۱۱۔ ستمبر ۱۸۹۸ء

شام کا وقت قریب ہے اور دنیا کے معمولی کاروبار جاری ہیں کوچے میں لڑکے گا رہے ہیں۔ سامنے بھٹیارہ تنور گرم کر رہا ہے۔ میں ہوں کہ اس وقت تنہا بیٹھا ہوں۔ اُداسی دل پر گھٹا باندھکے آئی ہوئی ہے۔ اور مایوسی نے اپنا پرا جمایا ہوا ہے۔ ابھی پیٹ میں سخت درد ہو رہا تھا اور میں چارپائی پر تڑپ رہا تھا۔ اب دوائی سے کچھ افاقہ ہوا ہے تو ہاتھ مُنھ دھوکے قلم دوات لے بیٹھا ہوں کہ اس تنہائی کی گھڑی میں اپنے پژمردہ دل کا غبار نکال لوں۔ میرا دل کیوں ایسا پژمردہ ہے اور وہ کونسی ایسی چیز ہے جو مجھے اس جوانی کے عالم میں جب کہ میرے مہربان والدین موجود ہیں۔ عزیز بھائی میری خوشی میں خوش اور میرے رنج میں رنجیدہ ہونے والے موجود ہیں۔ پیاری بہنیں ہیں جو گھر میں قدم رکھتے ہی چمکتی ہوئی آنکھوں اور ہنستے ہوئے چہرے دل سے بُلاتی اور آکر چمٹ جاتی ہیں۔ بیوی ہے جو مجھکو چاہتی ہے۔ گھر میں اگرچہ فارغ البالی نہیں مگر تنگدستی بھی نہیں۔ دوست ہیں کہ سب مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ پھر کونسی چیز ہے جس نے میرے دل کی کلی کو مردہ کر دیا

وہ کمبخت بیماری ہے۔ اور اچھی صحت کی عدم موجودگی یہی وہ کمبخت چیز ہے جس نے میری زندگی تلخ اور میرے ساتھ میرے والدین اور عزیزوں کی خوشی کو فی الحال منغص کر چھوڑا ہے اور معلوم نہیں کہ یہ کب میرا پیچھا چھوڑے گی۔ میرے لیئے سب کچھ میری صحت ہے۔ دنیا کسی حال میں ہو مجھے اُس سے کچھ نہیں کیوں کہ میں نہ اُسکی خوشی میں شریک ہو سکتا ہوں اور نہ اُس کے دردوں کو دور کر سکتا ہوں۔ اور دنیا کے لیئے میں کیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہزاروں میری طرح پیدا ہوتے اور عین شباب میں چلے جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ مگر دُنیا اُن کے مرنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتی۔ اسی طرح میرا مرنا نہ اچھا ہے اور کوئی بڑی بات۔ مگر میری ہزاروں آرزوؤں کا اس سے قتل ہوتا ہے اور میرے والدین اور اقربا کی سینکڑوں امیدوں پر خاک پڑتی ہے۔ میں اپنی زندگی کو اب اگر ضروری سمجھتا ہوں تو اپنے والدین اور اقربا اور خصوصًا اپنی بیوی کیلئے جسکی زندگی فی الحال میرے لئے وقف کر دیگئی ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ میں علم اور آرزو کے مطابق اپنے گھر کو ایسی حالت میں کروں کہ میری اور گھر والوں کی خوشی کا باعث ہو۔ مگر آنیوالا زمانہ میری نظر اور علم سے چھپا ہوا ہے اور وقت کہ اس اندھیرے سمندر میں مجھ دم بخود ہو کر چلا جانا چاہیئے اپنا سمند عمر کہاں دیکھیئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حافظ

ہزار عیش را فرباں کنم بہ ذرۂّ غم
کہ عیش خواب و خیال است و غم ہمیشہ رفیق

مشرقی اور مغربی زندگی کا مقابلہ

پیشتر اس کے کہ میں آج کے مضمون پر آپکی کچھ سمع خراشی کروں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی کسر نفسی کے اس بات کا اعتراف کروں کہ میں اس اہم اور مشکل بحث کی قابلیت نہیں رکھتا اور نہ جو خیالات میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اُن کو فیصل اور قطعی سمجھتا ہوں جس چیز نے مجھے اس مضمون پر کچھ کہنے کی جرأت دلائی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس الیوسی ایشن میں آتے ہیں نہ اس غرض سے کہ اپنی اظہار لیاقت کریں یا خاص عقیدے کی اشاعت کریں بلکہ محض ایک طالب علمانہ حیثیت سے جمع ہو کر بعض قومی ملکی اور لٹریری مضامین پر گفتگو کریں تاکہ تقریر کا مادّہ جس کی قوم کو سخت ضرورت ہے ترقی کرے اور تبادلہ آراء سے یکجہتی خیالات اور معلومات میں وسعت ہو۔ پس میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اسمیں کچھ کہوں گا اور مجھے اُمید ہے کہ جو بحث اس پہ ہوگی اور دیگر اصحاب کہیں گے اُس سے ہم سب نہایت مستفید ہوں گے۔

حضرات! تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ ہی کہ انسان اپنے حالات پر غور کرے جو باتیں مفید ہوں اُن کو اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ اور جو مضر ہوں اُن سے احتراز کرے۔ پس اس زمانہ میں جبکہ اس ملک کا

ایک نہایت سربرآوردہ مغربی قوم کے ساتھ پالا پڑا ہے تو جو لوگ ملک میں تعلیم پاتے جاتے ہیں اُن کے دلوں میں یہ سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ کہاں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ قوم جو ہم پر حکمران ہو گئی کیوں کر ہو گئی۔ ہم پر ان کو کیا فضیلت ہے۔ وہ کونسی باتیں ہیں جو ہمیں ان سے سیکھنی ہیں۔ اور کونسی باتیں ہیں جن کا اختیار کرنا ہمارے حق میں مضر ہو گا۔

صاحبان انگریزی کا مقولہ — Man is creature of circumstances صرف افراد پر ہی صادق نہیں آتا بلکہ قوموں اور ملکوں کی حالت پر بھی ایسا ہی راست ہے جیسا اشخاص کی۔ دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو عجیب حیرت انگیز تماشا دکھائی دیتا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک وقت کے بعد منہدم ہو جاتی ہیں۔ وحشی سے وحشی قومیں اوج فلک پر پہنچ جاتی ہیں اور پھر گر پڑتی ہیں۔ نئے نئے علوم اور نئے نئے فنون پیدا ہوتے رہتے ہیں اور پھر اُنکی جگہ پر اور قایم ہو جاتے ہیں۔

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علَم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اُسکی باری
بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

کسی کو آجتک یہ معلوم نہیں کہ عروج کی تقسیم کس حساب سے ہوتی ہے اور ملکوں

اور قوموں کا تنزل کیوں ہوتا ہے۔ مگر غور کرنیوالوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے بغیر اسباب کے نہیں ہوتا۔ ترقی کے لیے ترقی کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اور پھر اُسی ترقی میں سے تنزّل کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور چونکہ انسان ہمیشہ سے یہ دیکھتا چلا آیا ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے اور ہر معلول کے لیئے کوئی علّت ہوتی ہے تو جس چیز کی علّت اُس کے علم سے باہر ہو اور اُس کے دریافت کرنے سے وہ عاجز آجاتا ہو تو اُس کیلیئے قیاسات سے کوئی علّت بنا لیتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں شخصی اور قومی حالت کی ناپائیداری اور اُس کے تغیّر و تبدل کے جب ظاہری اسباب نظر نہ آئے تو حضرت آدم نے قیاسات سے اُسے نجوم فلک سے منسوب کر دیا۔ جب کسی شخص یا قوم کی حالت عروج پر ہوئی تو جھٹ کہدیا کہ اس شخص یا اس قوم کا ستارۂ اقبال بلند ہے اور یہ خیال قریبًا ہر ایک قوم میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اور دنیا کے کاروبار میں اس خیال نے بڑا پارٹ پلے کیا ہے۔

غرض قدرت کے اُس نامعلوم انتظام میں جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ جب اُن قوموں کے عروج کی باری آئی جن میں سے ایک قوم آج ملک ہندوستان پر حکمران ہے تو جہاں اُسے دنیا کے خزانوں میں سے اور بے شمار نعمتیں عطا ہوئیں ایک بڑی بیش قیمت نعمت یہ تھی کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کی حکومت اُن کے سپرد ہوئی

اور جس طریق سے یہ اُن کے ہاتھ آئی وہ آپ خوب جانتے ہیں کہ آئے تو بطور مہمان اور رفتہ رفتہ گھر کے مالک بن بیٹھے مگر ایسی حکمت سے کہ میزبان کو یاد تک نہیں رہا کہ یہ گھر تو میرا تھا۔ اور جو کبھی یاد آیا تو یہی ماننا پڑا کہ اس گھر کی ملکیت کے تم ہی سزاوار تھے۔ تم آقا ہم غلام۔ تمھارا حکم اور تمھارا زور۔ جس طرح چاہو اس کارخانہ کو چلاؤ۔

اور واقعی انگریزوں نے اپنی خداداد لیاقت سو اس ملک کی کایا پلٹ دی ہی۔ اور اگرچہ ہم میں سے تو شاید کوئی بھی نہیں جو اس مُلک کی موجودہ حالت کا انگریزوں کی حکومت سے پہلے کی حالت سو مقابلہ کر سکتا ہے۔ مگر کوئی شخص جسے ذرا بھی کچھ معلوم ہے وہ کہہ سکتا ہی کہ ہندوستان کا باوا آدم بدل گیا ہے۔ جو لوگ غور سے زمانۂ حال کے حالات کو دیکھتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صبح و شام یہاں ظاہر اور باطنی ایک انقلاب عظیم جاری ہے اور باطنی انقلاب بھی ویسا ہی سریع ہے جیسا ظاہری اور اسی لیے میں ان ظاہری اور باطنی انقلابات کا الگ الگ ذکر کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی اصلی زندگی یعنی انگریزوں کی حکومت سے پہلے کی زندگانی کا ایک مختصر خاکہ کھینچوں اور دکھاؤں کہ لوگ کس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کے مفصّل بیان کے لیئے ایک مبسوط کتاب درکار ہے۔ مگر میں نہایت اختصار سے کام لوں گا۔

آج جبکہ ہم ریلوں تار برقی۔ نہروں۔ سڑکوں۔ کل کی بیشمار چیزوں

اور اِسی قسم کے یورپ کے کرشموں کے عادی ہو رہے ہیں۔ اِس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ جب یہہ تمام چیزیں مُلک میں موجود نہ تھیں تو یہاں لوگ کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہونگے۔ کم از کم مجھے نہایت دُشوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں اُسی زندگی کو اصلی ہندوستانی زندگی خیال کرتا ہوں۔ اور جب تک اُسکا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو بھی قرار واقعی طور پر نہیں جانچ سکتے۔

حضرات! اُس زمانہ کو چھوڑ کر جب ہندوستان کی تہذیب دُنیا کی تمام گذشتہ اور آنے والی تہذیبوں سے برتر تھی۔ اور جب ہمارے آریہ بھائیوں کے قول کے بموجب یہاں ریلوں تار برقی۔ جہاز اور غُباروں کے علاوہ ہزاروں ایسی چیزیں موجود تھیں جو یوروپ والوں نے یا کسی قوم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھیں۔ ہم مابعد کے زمانہ کو دیکھتے ہیں کہ لوگ عموماً ایک سیدھی سادھی زندگی بسر کرتے تھے۔ بادشاہ کو ایک غیر معمولی انسان سمجھتے۔ جس پر خُدا کا خاص سایہ ہوتا۔ اور خلق اللہ گویا اُسی کی ذات کے لئے بنائی گئی تھی۔ اُس کا حکم قانون ہوتا تھا۔ اُس سے اُتر کر جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس۔ سلطنت کی آئے دن کی تبدیلیوں میں وُہ لوگ جو اپنے ہم جنسوں سے نکلتے ہوئے تھے وُہ ہزاروں آدمیوں کو اپنا تابع فرمان کر لیتے اور جس قدر مال و دولت چاہتے جمع کر لیتے

عوامُ النّاس ہیں یہ صفت تھی کہ جس کا دامن ایک بار پکڑ لیا اُسی کے ہو رہے۔ اُمرا بھی اکثر اس امر کو جانتے تھے۔ کہ اُن کی دولت میں غُربا کا بھی حصّہ ہے۔ اور ایک محدُود دائرہ میں اُن کا سلوک بہُت فیاّضانہ ہوتا تھا۔ فیشن کے مُوجد اوّل بادشاہ اور پھر مقامی حکّام یا اُمرا ہوتے تھے۔ عوام اُن کی پیروی کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ عام طور پر مذہب کو بُود و باش اور طرزِ معاشرت میں بے حد دخل تھا۔ بلکہ جو باتیں وہ خلاف مذہب اختیار کرتے اُنہیں بھی مذہباً درست سمجھ کر کرتے۔ یا عُلماء حسب ضرورت اُس کے لئے فتوے تجویز کر لیتے تھے۔ ایک شہر کو دُوسرے شہر سے نہ کوئی تعلّق نہ آگاہی۔ قافلوں میں لوگ سفر کرتے۔ لاہور سے جو شخص دہلی تک ہو آتا کئی پُشتوں کے لئے یہہ واقعہ اُس کے گھر میں یادگار رہتا۔ اکثر لوگ جہاں پیدا ہوتے وہیں رہ کر مر جاتے۔ سب کی زندگی گویا ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کسی بات میں جدّت کا کسی کو اختیار ہی نہ تھا۔ مُلک میں جو کچھ پیدا ہوتا وہ وہیں رہتا۔ اور ضروریات زندگی سب مُلک میں ہی بنتے۔ اور وہیں صرف ہوتے۔ خاص خاص کام لوگوں نے آپس میں بانٹے ہوئے تھے۔ ایک جُلاہے کا لڑکا لازمی طور پر جُلاہا اور عالم کا بیٹا عالم ہوتا۔ بادشاہوں اور امیروں کی قدردانی کے باعث فنُون میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ترقّی ہوتی رہتی تھی۔ لین دین پیسہ روپیہ میں بہُت کم ہوتا۔ اور جنس کا تبادلہ عام تھا۔ غرض ایک

سوسائٹی کی ابتدائی حالت کی تمام بُرائیاں اور تمام خوبیاں موجود تھیں
خیالات اور معلومات کے ساتھ جہالت تھی۔ ہمدردی کا دائرہ تنگ تھا
جھوٹے تعصبات زیادہ تھے۔ ترقی کے راستے مسدود۔ بیکاری غفلت
اور فراغت زیادہ مگر قناعت تھی۔ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب ملحوظ۔ اور
اطاعت کی صفت زیادہ تھی۔ قانون میں پیچیدگیاں کم تھیں اور طبیعتوں
میں امن پسندی زیادہ۔ اوضاع و اطوار اور عادات سیدھے سادے
امیروں کا بہشت یہہ تھا کہ شہر میں ایک بلند محل ہو۔ اُس میں حوض ہو
ڈیوڑھیوں پر کئی آدمی عصا لئے کھڑے ہیں۔ نوبت بجتی ہے۔ دیوان
خانہ میں زمین پر فرش ہے۔ دیواروں اور چھت پر نقش و نگار ہیں
مسند ہے۔ گاؤتکیہ ہے۔ پیچوان اور چاندی کا حُقّہ آگے رکھا ہے۔
شمعدان کونے میں پڑا ہے۔ لوگ سلام کو حاضر ہوتے ہیں۔ کئی کئی
فرشی سلام ہوتے ہیں۔ نذریں گذرانی جاتی ہیں۔ صبح و شام گپ بازی
کا بازار گرم ہے یا چوسر گنجفہ۔ دسترخوان پر ہمیشہ کئی آدمی موجود
ہیں۔ صنّاع۔ خوشنویس۔ میلے ٹھیلے۔ تیوہاروں پر اپنی دستکاری کے نمونے
پیش کرتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔ تماشاگر۔ مداری۔ بہت ناٹک والے
اپنے کرتب دکھا کر جھولیاں بھر کر لئے جاتے ہیں۔ تیسرے پہر نواب
صاحب یا رائے صاحب شہر کے باہر اپنے باغ میں جاتے ہیں۔ تو
گھوڑے کو دیکھئے کہ زیورات اور اطلس و کمخواب سے جگمگ ہو رہا
ہے۔ زرّیں چھتر سر پہ لگا ہے۔ خود بدولت گلبدن کا پائجامہ پہنے

عمامہ سر پر اور کرُتے کے اوپر لمبا کا مدار چوغہ زیب بدن کئے جا رہے ہیں۔ آگے آگے چوبدار ہٹو ہٹو پکار رہے ہیں۔ ہر طرف سے لوگ دو کانوں پر کھڑے ہو کر سلام کر رہے ہیں۔ اِسی طرح عوام النّاس عموماً ایک خاص وضع کے پابند ہوتے تھے۔ اور یکساں زندگی بسر کرتے تھے۔ کہ مشیّتِ ایزدی سے ایک قوم دُنیا کے پرلے سرے پر سات سمندروں کے پار سے آکر اس مُلک پر قابض ہوگئی۔ کہ جسکی زبان الگ۔ مذہب الگ۔ رنگت الگ۔ لباس الگ عادات الگ۔ خو بُو الگ۔ الہٰی یہہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آگئے اور سمندروں کو اُنھوں نے کیسے طے کر لیا۔ کیا کہیں ظُلمات میں اِنہیں خضر تو نہیں مل گیا۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ اُس نے انہیں آبِ حیات بھی پلا دیا ہو۔ یا جن ان کے قابُو میں ہیں۔ کہ اِن کو اُڑا کر لے آئے ہیں۔ غرض ہندوستان کے لوگوں نے اس قوم کی آمد کو نہایت استعجاب سے دیکھا۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ اِس با اقبال قوم کا یہاں کے لوگوں پر کچھ ایسا رُعب جم گیا۔ کہ اِن کو درحقیقت انسان کی حیثیّت سے برتر اور اپنی نوعیّت سے اعلےٰ سمجھنے لگے اور سمجھتے ہیں۔

جو کام اِن ٹاپو کے رہنے والے مچھوؤں نے آکر اِس مُلک میں کیا ہے اور جو اثر اُس کام کا ایک حیرت انگیز سُرعت سے ہوُا اور ہو رہا ہے۔ اُس پر ضخیم کتابیں لکھّی گئی ہیں۔ اور لکھّی جائیں گی۔ اوّل تو قدرتی طور پر حکومت کا اثر انسان کی طبیعت اور حالات پر بہت

ہوا کرتا ہے۔ مگر انگریزوں کی حکومت کے ہم رکاب اِسقدر اور باتیں چلی آئیں۔ جنکا اثر حکومت سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اور وہ کرشمے تھے اِن کے سائنس کے۔ اِن کی تجارت کے اِن کی جوانمردی اور اِن کی تہذیب کے اور وہ سب کے سب ہندوستان کے باشندوں کے لئے کچھ ایسے نئے ایسے دلفریب اور مؤثر تھے۔ کہ اس رنگ نے سب کو رنگنا شروع کر دیا۔

اِس میں شک نہیں کہ اوّل اوّل بہت مزاحمت بھی ہوئی۔ یہاں کے لوگ تھے کنسرویٹو کہ جس حال میں ہیں آپس میں ہیں شادان۔ ہندو اگرچہ کئی سو سال کی ماتحتی کے بعد کسی تبدیلی کو جو اُن کے لئے زیادہ آزادی کا باعث ہو اختیار کرنیکو زیادہ تیار تھے۔ مگر مذہب اور عادت کے باعث اُنہوں نے بعض باتوں پر بہت ناکیں چڑھائیں۔ اور اپنے گھروں میں بیٹھ کر بڑبڑائے مگر زمانہ نے اُن کو بہت سبق دئے ہوئے تھے۔ اُن میں سے جو سمجھدار تھے اُنہوں نے حتی الوسع انگریزوں کا جھٹ ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

مُسلمانوں کے دماغ میں ابھی نشۂ حکومت کا خُمار باقی تھا۔ یہ ابھی اپنی اینٹھ میں تھے۔ اور عیش و عشرت کے عادات نے اِن کی ہمّتوں کو پست کر رکھا تھا۔ اور آخر اِن دونوں قوموں کی ناراضگی نے جو کچھ عرصہ سے شمالی ہندوستان میں دلوں میں پیدا ہو رہی تھی ۱۸۵۷ء کے غدر میں ظہور کیا۔ مگر انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کی خوش نصیبی سے ہندوستان کی سوسائٹی کے اجزا اِسقدر مُختلف تھے کہ کیا بلحاظ مُلک کے بجائے خود ایک برّاعظم ہونے کے اور کیا بلحاظ اقوام اور مذہب کے اختلاف

کے نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ غدر کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت زیادہ استحکام سے جم گئی اور خدا کرے کہ اس کے استحکام میں ضعف نہ آئے

(اس کے بعد مسوّدہ کے صفحات نمبر ۲ سے ۵ تک گم ہیں)

یہہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر جس قدر کہا جائے تھوڑا ہے۔ اور اگرچہ میں آپکا بہت سا وقت لے چکا ہوں۔ مگر ختم کرنے سے پہلے میں اس قدر اور کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ زمانہ کی بازی نے نیا پہلو بدلا ہے۔ اور زمین و آسمان سے یہی صدا آرہی ہے۔ کہ ہندوستان کی غفلت کا زمانہ گیا مغربی قومیں علم اور تجارت کی دَوڑ میں بہت آگے نکل چکی ہیں۔ بیکار رہنے کا وقت نہیں ہے۔ ہر شخص کیلئے پیٹ بھرنا اور دُنیا میں عزت سے گذارا کرنا اب روز بروز مشکل ہورہا ہے۔ اور یہ کشمکش اب اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کہ عورتیں جنکو خدا نے گویا صرف خانہ داری کے لئے اور مرد کے آرام کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ بھی طلب معاش میں مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اُن سے دال روٹی بٹانے میں مستعد ہوتی جاتی ہیں اور ہر طرف نفسی نفسی کی پکار سے گویا میدانِ محشر بپا ہورہا ہے۔

ہر چند ہمارے راستے میں رُکاوٹیں ہیں۔ ہر چند ہماری آب و ہوا زیادہ محنت اور استقلال کی برداشت نہیں رکھتی۔ مگر ہماری تعداد ہمارے مُلک کی زرخیزی اور مزدوری کا سستا ہونا وغیرہ کئی ایک باتیں ہمارے حق میں بھی ہیں۔ اور سب سے زیادہ ہمیں وہ اندرونی قوت پیدا کرنی چاہیئے۔ جس کے سامنے کوئی دقت نہیں ٹھہر سکتی۔ سـ۵

اُولوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمُندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

ہمیں بھی انسانیّت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔کیوں نہ ہم یوُرپ کے اخلاقِ رذیلہ حاصل کرنے کے بجائے اُن کی سی ہمدردی۔اُن کی سی ہمّت۔اُن کی سی محنت اور اُن کی سی ہوشمندی سیکھیں ؎

اخبار چودھویں صدی راولپنڈی یکم اپریل ۱۹۰۰ء

عبدالرشید چشتی مرحوم نے ۲۸۔مارچ ۱۹۰۰ء کی شام ۵ بجے راولپنڈی کے اسلامیہ سکول میں تقریرِ ذیل پڑھی

سرسیّد احمد خاں صاحب مرحوم کی یادگار کا دوسرا سالانہ جلسہ

وقت جو اپنی بے روک رفتار سے چلا جاتا ہے۔ آج اُس نے دو سال طے کر لئے کہ سیّد احمد خان کے جسم پر اُس کے دوستوں اور عزیزوں نے مٹّی ڈال دی۔ اور وہ دماغ اور وہ ہاتھ جو ہر وقت قومی دُھن میں مصروف رہتے تھے دو سال سے زیر زمین بے حرکت پڑے ہیں۔ کاش خُدا کا اٹل قانون اجازت دے کہ پسماندگان میں سے کسی کو یارا ہو کہ جا کر ذرا جھنجھوڑے اور کہے کہ حضرت آپ تو ایک رات بھی قوم کے خیال سے بے فکر ہو کر نہیں سو سکتے تھے۔ دو سال گذر گئے کہ آپ نے اپنی درماندہ قوم کی خبر نہیں لی۔ اُٹھئے کہ بہت سو چکے۔ اور کافی آرام کر چکے۔ قوم کو ابھی ہر دم آپکی ضرورت ہے۔ یقین نہیں آتا کہ سر سیّد کو یہہ کہا جاوے۔ اور وہ بالکل

خاموش پڑے رہیں۔ نہیں نہیں سچ تو یوں ہے کہ اُس قبر سے پُر رقت ایک آواز نکلتی ہے۔ اور جس کو اہلِ دل ہندوستان کے ہر کونے میں سنتے ہیں اور وہ آواز ہے قوم قوم اور اُطلبُ العلم اُطلبُ العلم۔

سر سیّد احمد خاں کی تمام زندگی اور عام تصنیفات اُس ایک لفظ قوم اور اُس جملۂ اُطلبُ العلم کی تفسیریں ہیں۔ اور یہی آواز جب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک اہلِ دل بھی موجود ہے۔ تاقیامت اُس کے کان میں پڑتی رہے گی۔ اور یہی نغمہ ہے جس سے اُس مردہ قوم میں جان پڑ نیکی امید ہے۔ اور یہی نسخہ ہے جو وہ مسیحا آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ گیا ہے۔

اگر چودھویں صدی میں ہندوستان کے مسلمان کسی چیز پر فخر کر سکتے ہیں تو وہ اِس قوم میں سر سیّد احمد خان کا پیدا ہونا ہے۔ کہ باوجودیکہ قوم بحیثیت مجموعی ایسے قعرِ ذلت میں پڑی ہے۔ کہ دُنیا اُس سے عبرت پکڑتی ہے۔ مگر اُس میں خدا نے ایک ایسے نادر وجود کو پیدا کر دیا۔ کہ نہ صرف ہمسائہ قومیں اُس کے ہونے سے ہم پر رشک بلکہ حسد کرتی تھیں۔ بلکہ وہ قوم جسکا اقبال گنبدِ گردوں سے آج بلند ہے۔ اور جس میں ہر اینٹ اُٹھانے پر گریٹ مین ملتے ہیں اور جسکو خُدا نے اپنی حکمتِ بالغہ سے ہم پر حکمران مقرر کیا ہے۔ اِس کا ہر فرد جسنے ایک دفعہ سر سیّد کو دیکھا یا اُس کے حالات پڑھے یا سُنے مفتون ہو گیا۔ اور اُس کے آگے سر کو خم کر دیا۔ اب قوم کا یہ فرض ہے کہ اُس نعمتِ غیر مترقبہ کی جو خدا نے اپنی خاص عنائت اور رحم سے ہمیں عطا کی تھی۔ قدر کریں۔ اور اُس کی قدر دانی یہی ہے۔ کہ اُس کی مثال کو اپنے سامنے رکھ کر سب متفق اور

یک جان ہو کر اُن تدابیر کو عمل میں لادیں۔ جن سے قوم قوم بنے۔ اور اُس اِدبار اور نکبت سے جس میں یہہ گر گئی ہے نکلے۔

سر سیّد احمد خاں نے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ اپنی آنکھوں گُل ہوتے دیکھا اور جو عام بدظنّی غدر کے بعد مُسلمانوں کی نسبت گورنمنٹ میں پیدا ہوگئی تھی اور جسکا نتیجہ یہہ ہؤا۔ کہ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ اور سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کا کوئی حصّہ نہ رہا۔ قوم کی یہ حالت دیکھکر اُسکا دردمند دل پگھل گیا۔ اور اپنے نانا کی اُمّت کا اِس خراب آباد میں یہ حشر دیکھکر ہاشمی خوُن نے اُس کی رگوں میں جوش مارا۔ اور جسوقت ہر ایک کو اپنا رونا پڑا تھا اور ہر سُو نفسی نفسی ہو رہی تھی۔ یہ مردِ خدا اکیلا کمرِ ہمّت باندھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک پُر درد نغمہ گانا شروع کیا۔ جو نغمہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء تک برابر جاری رہا جبکہ قفس عنصری سے مُرغِ روح پرواز کر گئی۔ اُس عرصہ میں سر سیّد نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ سب پر ظاہر ہے اور زمین و آسمان اُس کی گواہی دیتے ہیں کیا کچھ ہے جو اُس کی نسبت نہیں کہا گیا۔ جس قوم کے لئے وہ روتا تھا وُہی اُسے کافر بتاتی تھی اور جس کے درد میں اُسے راتوں نیند نہ آتی تھی وہ اُسکی جان کے دشمن تھے۔ مگر یہاں کیا تھا۔ ؎

جَورِ اِخوان دیدن و در عشقِ اِخوان زیستن

زخمِ پیکان خوردن و مشتاقِ پیکان زیستن

اپنے بیگانوں نے اُس کے کام میں روڑے اٹکائے بُہت دوست ہم سفیر ہوئے مگر چند قدم چلکر ساتھ چھوڑ دیا۔ بلکہ خیر خواہی کا دم بھر کر اُن کو سمجھایا

کہ اس عبث کوشش سے باز آئے اور اپنی زندگی کے دن چین سے گذارئے مگر یہ کب سننے والا تھا۔ کسی رکاوٹ کی پرواہ نہ کی۔ اور اِس شعر پر عمل رکھا۔ کہ ؎

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ مارئے

منزل ہزار سخت ہو ہمّت نہ ہارئے

ولائیت کا سفر کیا خویش و بیگانہ کے آگے اپنا رونا رویا۔ قرض لیا۔ جائداد بیچی۔ گیروے کپڑے پہنے۔ کچکول لیا۔ بھیک مانگی تھیٹر میں سوانگ بھر کر نامے خواہیم ننگ و نام گایا اور آخر وہ شخص جسکے گھر میں ہندوستان کا وائسرائے اور سلطنت آصفیّہ کا وزیر اعظم مہمان ہؤا کرتا تھا مرنے کے وقت کفن کے لئے ایک پیسہ نہیں رکھتا تھا۔

حضرات! اگر خدا کو منظور ہے کہ مسلمانوں کے دن پھریں تو قرنوں اور صدیوں کے بعد قوم سیّد احمد خان کی قدر جانے گی۔ اگر موجودہ نسل اس شخص کی قدر کرسکتی تو قوم کی یہ حالت ہی کیوں ہوتی۔ کہ دو سال کے عرصے میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان ایک قومی یونیورسٹی کے لئے سامان مہیّا نہیں کر سکے۔ اگر ہر شخص ایک پیسہ بھی خود جاکر اِس چندہ میں داخل کردیتا تو آج دس لاکھ روپیہ جمع ہو جاتا۔ مگر ہماری قومی ہمدردی تو زبان تک ہی محدود ہے۔ اے کاش ایک شمّہ اِس درد اور بے نفسی کا ہم سب میں موجود ہوتا جو اُس (کافر) سیّد میں تھا۔ تو ہماری دین و دُنیا میں سُرخروئی ہو جاوے۔ اور ہم اُس پاک نبی کی سچّی اُمّت کہلانے کے مستحق ہو جاویں جس کا لقب

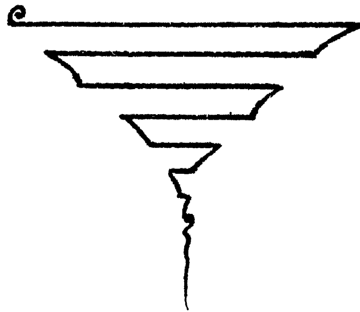
رحمتہ اللعالمین ہے۔

خدا جانے پھر زمانہ ایسا آدمی کب پیدا کرے۔

عمرہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود۔	سید احمد خاں در ہند و اویس اندر قرن

اب تو اِس قومی گاڑی کا چلانا قوم کے سر پر آپڑا ہے۔ اب تو جب تک سب مِلکر کندہ نہ دیں اِسکا چلنا مُحال۔

عزم جزم آرید و برخیزید و ہمدستاں شوید	دست بکشائید و بر بندید دامن بر کمر
شفقت ملّئیں ہست در ہندوستان تو صیدگوئی	وہ کہ چندین خلق درماند ز کارِ یک نفر
یادگارِ خواجہ بعد از خواجہ برپا داشتن	شکرِ اُورا خوب تر زین نیست اسلوبے دگر
مُزدِ اُو ایں بس کہ در صلاحِ خود کوشید زود	جز شما غیر از شما مطلوب اُو چیزے نبود



اخبار اِتّفاقِ ساڈھورہ (انبالہ) - یکم فروری سنہ ۱۹۱۰ء

ساڈھورہ (انبالہ) ۲۳ر جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

سیّد احمد خانی گدّی

سلطنت کی گدّی تو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اور حق تو یہہ ہے کہ اُن کو اِس میں حصّہ بھی کافی مل چکا تھا۔ تیموری خاندان سے پہلے کئی خاندان افغانوں کے دہلی کے تخت پر جلوہ افروز رہے پھر تیموری نسل کے اقبال کا ستارہ صدیوں چمکا۔ اور کیا بلحاظ وُسعت سلطنت کے اور کیا دولت اور ظاہر جاہ و جلال کے دُنیا کی تاریخ میں اُنکی نظیر کم ملتی ہے۔ مگر اب وہ صرف بچّوں کے خوش کرنے کی کہانیاں ہیں یا عبرت کے سبق۔ زمانہ کا رُخ بدل گیا سلطنت اُن کے ہاتھوں سے نکل گئی اور خدا نے اس مُلک پر ایک امن پسند اور ہمدردِ بنی نوع قوم کو مقرّر کیا جو اپنے ساتھ علوم و فنون کا ایک بیش بہا خزانہ لائی جو سینکڑوں سالوں کی ہزار جانفشانیوں اور بحر و بر کی خاک چھان کر اکٹھا کیا تھا۔ اور اس خزانہ کو ہندوستان کے لوگوں میں نچھاور کرنا شروع کیا۔ اور بتایا کہ محنت اور کوشش کے یہ پھل ہیں۔ تم بھی کمرِ ہمّت چست باندھو اور اِس مُہم میں ہمارے ساتھ ہو تمھیں اِس کام میں ہم حتی الوسع مدد دینگے۔ پہاڑ کو کاٹو اور سمندر کو روندو تو

تو یہ آب حیات تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ غرض تو موجود تھا اور رہنمائی کے لئے
تیار بلکہ خواہاں۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے نیند اچھی لے لی تھی سلطنت
کا خمار اُن کے دماغ سے مدتوں کا رفو چکر ہو چکا تھا۔ تازہ دم ہو کر بھاگے اور جھٹ
خضر راہ کے ساتھ ہوئے۔ جہاں تک ہمت تھی۔ لگے اس میدان میں قدم مارنے
تازہ ہوا جو کھائی اور نئے نئے نظارے نظر آنے لگے۔ اور اس امر کا یقین ہو گیا
کہ رہنماء سچا ہے اور آب حیات کے چشمہ کا اُسے پتہ ہے۔ اُن کی ٹوٹی ہوئی
کمروں میں بھی خون پھرنے لگا اور حوصلے بلند ہو گئے۔ مگر مسلمان تو دولت اور
حکومت کے نشے میں چور ہو کر سوئے تھے۔ ایسے سوئے کہ گویا قیامت کو
اُٹھیں گے۔ اول تو جاگتے ہی اپنا اثاثہ پیر مغان کے ہاتھ بیچ چکے تھے
پھر سوئے تو ایسے مست و مدہوش ہو کر کہ جو کچھ باقی تھا وہ چور لے گئے۔ غرض
جس خضر کا ہندوؤں نے دامن پکڑا تھا اُس کے جگائے تو اُنکے کان پر جوں
تک نہ رینگی۔ اُنمیں سے ایک سید احمد خان کی آنکھ کھل گئی اور اُس کے
کان میں یہ بات پڑ گئی اور اُس نے سمجھ بھی لیا۔ کہ ہاں اِس بات میں کچھ
حقیقت ہے۔ اِرد گرد مسلمانوں پر نظر ڈالی تو سب مدہوش ہیں۔ سیادت
نے اپنا جلوہ دکھایا۔ اُٹھا اور لگا چلانے اور رونے۔ کسی کو جھنجوڑا کسی کے
کان میں میٹھی میٹھی باتیں کہیں۔ غرض جتنوں کو جگا سکتا تھا جگایا اور جتنی
دیر جیا اپنا راگ گاتا رہا اور کیا جو کچھ کہ کیا اور اِس بے سرو سامانی کی حالت
میں جو کچھ کر گیا اُس کی اپنے پرائے تعریف کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ آخر
۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو جان بحق تسلیم ہوا۔ مگر مرتے مرتے اپنی مغفرت

کی دُعا کی بجائے یہی کہتا گیا۔ کہ یہ مشعل جو مَیں نے جلائی ہے اُسے بُجھنے نہ دینا اور جس راستے پر میں چلا ہوں یہی راستہ ہے۔ جس پر قومیں آبِ حیات کی تلاش میں جا رہی ہیں۔ مَیں نے باوجود اپنے ضعف اور پیرانہ سالی کے اتنی دُور تمہارا ساتھ دیا۔ اب حکمِ قضا سے چارہ نہیں۔ کسی کو اپنا رہبر بناؤ اور چلے جاؤ۔ راستہ صاف ہے۔ صرف استقلال کی ضرورت ہے۔ غرض اسطرح یہ بزرگ دُنیا میں اپنی ایک گدّی قائم کر گیا۔ اور یہ سُنا گیا۔ کہ یہ کسی کی وراثت نہیں ہے جو قومی خدمت میں سب سے بڑھے گا یہ اُسی کا حصّہ ہے۔ سیّد ہو یا شیخ۔ پنجابی ہو یا ہندوستانی۔ جو اپنا وقت اپنی ہمّت اپنا مال اور اپنی عزّتِ اِس سودے میں ہارنے کو تیّار ہے یہ اُسی کو مل سکتی ہے۔ بجائے تخت کے یہاں کوہ کن کا تیشہ ہاتھ میں اور سر پر کانٹوں کا تاج ہے۔ ہر ایک سر اِس بارِ گراں کو اُٹھا نہیں سکتا۔ یہاں شکست نُصرت سے مقدّم اور ملامت آفرین و مرحبا سے پہلے۔

یہ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ کہ اِس سیّد کا جانشین بھی ایک سیّد بزرگ ہوا خدا اُسے عمرِ نوح عطا کرے۔ مگر آئندہ نسلوں کے لئے یہ سلطنت جمہوریہ کی طرح پریزیڈنٹی کا عہدہ ہر فرد قوم کے لئے خالی ہے۔ اور جس طرح امریکہ میں ایک بُوٹ صاف کرنیوالا یہ کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ میں بھی اضلاع متّحدہ کا پریزیڈنٹ ہو جاؤں۔ اِسی طرح ہر مُسلمان بچّہ جو مکتب میں پڑھتا ہے وہ اِس خدمت کے تخت کو حاصل کرنے کی توقّع رکھ سکتا ہے۔ اِس تخت پر مُتسلّط ہونے والے کے لئے اگرچہ کوئی بڑا اِنعام تو نہیں رکھا۔ مگر اِس گدّی کے بنانیوالے

کے حق میں یہہ کہا گیا تھا۔ ؎

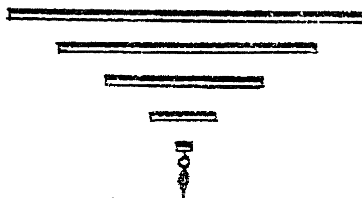
خدا نے تجھکو پہنچایا ہے اُن اعلےٰ مراتب پر
فزوں تر جس سے اب کوئی نہیں ہے مرتبہ باقی

تیمور اور شاہجہان کا نام دنیا جلد بھول جاوے گی مگر سید احمد خان اور اُس کے جانشینوں کا نام شہرت کے آسمان پر تب تک چمکے گا جب تک دُنیا میں تہذیب اور علم کی عزت ہے۔ جس فوج کے وہ حاکم تھے اُس کی فتوحات غیر مستقل اور جھوٹی تہیں۔ مگر جس فوج کی بُنیاد سید احمد خان رکھ گیا ہے اُسکا ایک سپاہی بجائے خود ایک سپہ سالار ہوگا۔ اور علم اور ہُنر کے کارزار میں وُہ وُہ کارنمایاں کریگا۔ کہ دُنیا کی یاد سے وہ کبھی فراموش ہونگے شاہجہان اور اکبر جو عمارتیں بنا گئے ہیں اُن میں سے کئی گر گئیں اور بہتیری ابھی سے مٹنے کے آثار دکھا رہی ہیں۔ مگر جس عمارت کا بُنیادی پتھر سیّد احمد خاں نے رکھا ہے وہ اُمیّد ہے رفعت و شان میں ایکدن رشکِ فلک ہوگا۔ اور تا روزِ قیامت دُنیا کے لئے مرجعِ فیض رہے گا۔

سلطنتوں کی گدّیوں کو چھوڑ کر ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے زمانہ میں اَولیاؤں اور صوفیوں کی گدّیاں ہُوا کرتی تھیں۔ جہاں لوگ صفائی قلب اور سچّی حکمت کے سیکھنے اور نفس کُشی کے سبق لینے کو آتے تھے۔ اور اُن کے فیض سے مُتاثر ہو کر جاتے۔ مگر نہ اب وہ صوفی باقی ہیں نہ وہ اَولیاء اور نہ خلق اللہ میں اب وُہ ارادت۔ اُن گدّیوں کے جانشین اِلّا ماشاءاللہ اکثر دینداری کے پردہ میں دُنیا کو لوٹنے والے اور دُنیا کو ترکِ دُنیا

سکھا کر اپنی دُنیا کا سامان جمع کرنے والے رہ گئے ہیں۔ اور جو نفس کُشی و سکھاتے ہیں۔ وُہ نہ زرِ قلب سے ہے نہ دُنیا میں اُسکا چلاؤ اور نہ خدا اور شریعت کے نزدیک مقبول سر سیّد احمد خاں ہم کو سچّی بے نفسی اور حقیقی اِتقا کا سبق سکھا گیا ہے اور وہ یہہ ہے۔ کہ قوم کے لئے جینا۔ اور قوم کے لئے مرنا۔ اور جو شخص اِس کام کو کر سکتا ہے وُہی سر سیّد احمد خاں ہے

؎ زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم
گر توانی می توانی سیّد احمد خان شدن



رسالۂ مخزن۔ بابت نومبر ۱۹۰۱ء جلد ۲ نمبر ۲

گالیاں

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ گالیاں بھی انسان کے کلام میں ایک جزو ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو اُن سے بالکل پرہیز کرتے کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی گالی ہر شخص کی زبان پر غصّہ کے وقت آجاتی ہے۔ بعض نہایت شریف اور متقّی لوگ جو عام طور پر گالی کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ کسی وقت غصّہ کے مارے بیتاب ہوکر کسی کی شان میں تبرّا بازی کرتے ہیں۔ مگر صرف اُسی حالت میں۔ کہ اُنہیں اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا وجہ یہ ہے کہ گالی دینے کی عادت اُس وقت پڑ جاتی ہے۔ جب انسان نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتا۔ اور نہ اپنی عزّت و وقار کا چنداں خیال ہوتا ہے سب لوگ ایک قسم کی گالیاں نہیں دیتے۔ رذیل بازاری لوگ جو فحش اور غلیظ گالیاں بکتے ہیں۔ شریف وہ الفاظ کبھی نہیں مُنہ سے نکال سکتے۔ ہاں ہر سوسائٹی میں بعض لوگ ایسے ضرور ملینگے جو مہذّب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں میل ملاپ رکھتے ہیں۔ اور خود بھی معزز ہوتے ہیں مگر جب وہ گھر میں آتے یا ایسے لوگوں میں جاتے ہیں جن سے اُن کی نہایت بے تکلّفی ہو یا جو اُن سے ادنےٰ ہوں تو وہ ایسے کلمات کہہ ڈالتے ہیں۔ کہ اُن کی نسبت اُن کے مہذّب دوست کبھی ایسا گمان نہیں کرسکتے۔ مگر عادت ایک ایسی چیز ہے کہ انسان پر کبھی نہ

کبھی غلبہ پا ہی لیتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شائستہ سوسائٹی میں کسیوقت اُن کے مُنہ سے ایسا لفظ نکل جاتا ہے۔ کہ اُن کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ ہمنے ایک دفعہ دیکھا۔ کہ ایک بہت بڑے تعلیمی جلسہ میں جہاں مُلک کے برگزیدہ لوگ جمع تھے اور ایک صاحب کسی خاص مضمون پر نہایت جوش کے ساتھ تقریر کر رہے تھے۔ اُن کے مُنہ سے بے تکلف ایک نہایت غیر مہذب لفظ نکل گیا جو معلوم ہوتا ہے۔ کہ معمولی بول چال میں اُن کا تکیۂ کلام تھا۔ چنانچہ تمام لوگ باوجود آداب محفل کے بے اختیار قہقہ لگا کر ہنس پڑے۔ جو ندامت اُس وقت اُس بزرگ کو ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ گر بیشتر اس کے۔ کہ گالیوں کے اخلاقی پہلو کو لیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے۔ کہ اِن کا ماخذ کیا ہے انسان کے تمام افعال کسی نہ کسی علّت سے خالی نہیں ہوتے۔ اور ہر ایک رسم وعادت کی کوئی ابتدا ہوتی ہے۔ اور کوئی خاص ضرورت اوسکا موجب ہوتی ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جوں جوں انسان کے باہمی تعلّقات بڑہے اور تمدّن نے ترقی کی۔ اُسی قدر زبان ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اسلئے کہ انسانی تعلّقات کا سب سے بڑا آلہ زبان ہی ہے۔ پھر تعلّقات کے بڑھنے سے محبّت اور نفرت بھی بڑھنے لگی۔ اب یہ بات لازمی تھی۔ کہ محبّت اور نفرت کا اثر زبان پر پڑے۔ پس محبّت نے وہ تمام الفاظ پیدا کئے۔ جو دعاؤں میں تہنیتوں میں۔ تعریف میں کہے جاتے ہیں۔ اور نفرت نے تمام گالیاں۔ بددعائیں اور نفرین اور مذمّت کے کلمات کو ایجاد کیا۔ اور پھر مختلف حالات۔ زبانوں مختلف طبیعتوں اور موقعوں نے اُن میں اِس قدر گوناگونی اور کثرت پیدا کردی

کہ آج اگر کُل دُنیا کی صرف گالیوں کی ایک نعت بنائی جائے تو اُمید ہے کہ ایک نہایت ضخیم کتاب بن جائے +

گالیوں کا امتحان کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض دھمکیاں ہوتی ہیں جو ایک انسان کے دوسرے پر غالب ہونیکا اظہار کرتی ہیں۔ بعض بددعائیں جو بولنے والے کی اپنی عاجزی ظاہر کرتی ہیں۔ مگر اُس کے دل کی خواہش کو بتاتی ہیں۔ کہ اگر اُس کے اختیار میں ہو یا خدائی طاقت اُس کے پاس ہو تو وہ اِس طرح مخالف کو نقصان پہونچائے۔ انسان پر بعض اوقات اُنکا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور دُکھے ہوئے دل کی بددُعا نہایت خوفناک سمجھی جاتی ہے شُعرا نے اِس خیال کو کئی طرح سے ظاہر کیا ہے

منجنیقِ آہِ مظلوماں بہ صُبح سخت گیرد ظالماں را در حصار

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دُعا کردن + اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

بعض صرف دوسرے کی مذمّت ظاہر کرتے ہیں اور بولنے والا دوسرے شخص کی نسبت بُری رائے کا اظہار کرتا ہے۔

گالیوں کی نسبت یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر مختلف قسم کی گالیوں کے الفاظ کے موضوع کی بابت سوچا جائے۔ تو پتہ لگتا ہے کہ وہ انسان کی مختلف حالتوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اُس کی گالی سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والی ہوتی ہے۔ اور دل کو کڑوی لگتی ہے۔ مثلاً مستورات کے حیا کا پاس ہر شخص کو بدرجۂ غایت ہوتا ہے۔ اور اِنسانی غیرت کا یہی تقاضی ہے۔ اِس لئے سب سے غلیظ

گالیاں وہ ہیں جو اِس غیرت پر حملہ کرتی ہیں۔ اور ایک شریف آدمی کے لئے کوئی بات اِس سے زیادہ دل دُکھانے والی نہیں ہوسکتی جس قدر کوئی ایسی گالی جو اُس کے گھر کے پردۂ عصمت کو ہدف بنائے ٭

بعض گالیاں ایسی ہیں جن میں خراب پیشوں ۔ بے حیائی اور بے عزّتی کی عادتوں سے نسبت دی جاتی ہے ٭

اِن سے اُتر کر وہ گالیاں ہیں جنمیں انسان کو ناپاک اور ادنیٰ حیوانوں سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ اور نسبتاً بھلے مانس لوگ عموماً ایسی ہی گالیاں طیش کے وقت بچوّں یا نوکروں چاکروں کی تنبیہ کے لئے بولتے ہیں بددعاؤں میں یا تو مخاطب کی اپنی یا اُس کے عزیزوں کی مضرّت چاہتے ہیں یا اُن کے لئے کوئی سخت بیماری یا مصیبت تجویز کی جاتی ہے ٭

مگر سب قسم کی گالیوں میں ایک بات ظاہر ہے۔ کہ شائد انسان کا کوئی فعل اِس قدر بے سوچے سمجھے اور بے معنے نہیں ہوتا جسقدر کہ گالیاں۔ ایک شخص دوسرے کو ہزار گالیاں دے ڈالتا ہے۔ جن میں دھمکیاں بھی ہوتی ہیں۔ بددُعائیں بھی اور مذمّتیں بھی مگر سب سے نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے۔ کہ بولنے والا اُس سے خفا ہے۔ اور اُس وقت اُسکا غصہ مشتعل ہے۔ بسا اوقات گالیاں دینے والا اُس شخص کا جسے گالیاں ملتی ہیں دُنیا میں سب سے بڑا خیرخواہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ شخص ایک لحظہ کے لئے سوچے کہ جو کچھ میرے مُنہہ سے نکل رہا ہے۔ میرا دل اُسکی کہاں تک تصدیق کرتا ہے تو وہ دیکھے گا۔ کہ وہ ایک محض عبث فعل

کر رہا ہے اور ہوا کو ناحق صدمات پہنچا رہا ہے۔ بارہا جسے صلواتیں سنائی
جاتی ہیں۔ وہ موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی فرد بشر بھی پاس نہیں ہوتا مگر دل
کا غصّہ ہے کہ آواز کی سینکڑوں شکلیں اختیار کر کے نکل رہا ہے۔ اور کہنے
والے کے اپنے کانوں کو ہی اُس کا مزہ آ رہا ہے +

کون شخص ہے جس نے سڑک پر چلتے گاڑی بانوں اور چھکڑے والوں
کو اپنے گھوڑوں یا بیلوں کو ہزار ہزار گالیاں دیتے نہیں سُنا۔ کبھی اُس
حیوان کی ماں اور کبھی اُس کی بہن معرض عتاب میں آ رہی ہے۔ اور
کبھی اُس کے پہلے مالک اور بیچنے والوں کی تواضع کی جا رہی ہے۔ بعض
لوگ جب کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں اور اُس میں کوئی مشکل پیش
آ جاتی ہے۔ مثلاً کیل گاڑنے یا دھاگے کی گانٹھیں کھولتے یا برسات کے
باعث سخت ہوئے ہوئے قفل یا کواڑ کھولنے میں دِقّت ہوتی ہے۔ تو
جب تک وہ کام نہ ہو جائے متواتر گالیاں دیتے جاتے ہیں۔

بعض دیوانے یا مخمور لوگ یوں ہی مُغلّظات بکتے ہیں جو اُن کے دیوانہ
پن یا حالت نشہ کے کرشمے ہوتے ہیں۔ اور نفس کی ناپاکی کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعض
ہمارے مُلک کے جُہلا جب خوشی میں آتے ہیں تو تفریحاً ایک دوسرے
کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہولیوں کا تہوار جو یہاں ایک مشہور تہوار ہے اور موسم
بہار میں آتا ہے اور اہل ہنود اُس میں بہت خوشیاں مناتے ہیں۔ اِس میں
ادنےٰ بازاری لوگ صرف دل لگی کے لئے ایک دوسرے کو گالیاں نکالتے ہیں۔
بچوّں کو نئی سے نئی گالی سکھائی جاتی ہے۔ جو وہ کانوں پر بیٹھ کر ہمسائہ دوکاں

والوں کو جن سے بے تکلفی ہوتی ہے۔ گالیاں دیتے ہیں اور اس زرِ قلب کا خوب دل کھول کر لین دین ہوتا ہے۔ اِنہی دنوں میں بازاروں میں نوجوانوں کے بڑے گروہ ایک جگہ جمع ہو کر کسی خاص شخص پر آوازے کستے ہیں جو اپنے کوٹھے پر بیٹھا اُنکا جواب دیتا ہے۔ ایک ایک گالی کو بہت بُلند آواز سے سَو سَو دفعہ دُہرایا جاتا ہے۔ اِسی مشغلہ میں بعض اوقات ساری ساری رات گذر جاتی ہے۔ جبسے گالیاں دیجاتی ہیں۔ وہ خاموش رہنا اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ اور ہرچند اُس کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی آواز خستہ ہو جاتی ہے اور بے خوابی کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے مگر وہ یہ بے غیرتی ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔ کہ اُس سے گالیوں کا جواب بن نہیں پڑا۔ یہی حال بعض عورتوں کا ہے۔ جنہوں نے زبانی لڑائی کو بیکاری کا ایک مشغلہ قرار دے رکھا ہے۔ بعض بدزبان عورتوں نے خوش مزاجی میں اِس بات کا اقرار کیا ہے۔ کہ لڑائی میں اُنہیں ایک قسم کا مزا آتا ہے اور جب کئی دن تک وہ کسی سے دوبدو نہیں ہوتیں تو خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر لیتی ہیں۔ بلکہ ایک خاص فرقہ کی عورتوں کی نسبت مشہور ہے۔ کہ جب اُن پر یہ جذبہ غالب آتا ہے تو وہ اپنی ہمسائی کو بُلا کر لڑائی کی دعوت کرتی ہیں۔ اور اِس طرح ایک عظیم زبانی جنگ کی طرح ڈال دیتی ہیں۔ جو کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے۔ نئی نئی اور فی البدیہ گالیاں جو اُن کا حاضر جواب دماغ ایجاد کرتا ہے اُنکا دُور دُور کے گھروں میں چرچا ہوتا ہے اور ہم چشموں میں بُہت تعریف ہوتی ہے۔

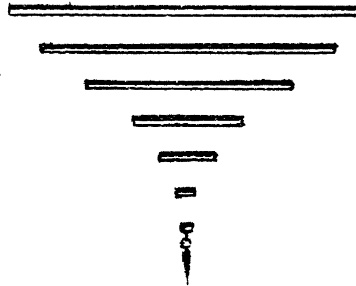
ہمارے ملک کی بعض اقوام میں بیاہ کے موقعہ پر جب دولہا والے برات لے کر آتے ہیں تو دُلھن والے گھر کی عورتیں اپنے سمدھیوں کو اور برات والوں کو مقفّیٰ گالیاں دیتی ہیں۔ جنہیں سٹھنیاں کہتے ہیں۔ اکثر فحش باتیں بے تکلفی سے کہی جاتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو عام طور پر بہت کم گو اور باحیا سمجھی جاتی ہیں اِس رسم میں شامل ہوتی ہیں۔ گویا وہ خاص موقعہ اُن کو اِس قبیح رسم کی اجازت دے دیتا ہے اور اُن کے مرد بھی اِس سے اغماض کرتے ہیں۔ بلکہ بعض خوش ہوتے ہیں۔

بے معنی گالیوں کے ذکر میں اُس مذموم عادت کا بیان کرنا شائد بیجا نہ ہوگا۔ جو بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگوں میں موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ چھوٹی لڑکیوں کو پیار کے موقعہ پر ایسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو دراصل نہائیت دل دُکھانیوالے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک عادت ہے اور اُن کے کہنے والے اُن لڑکیوں کو دل سے عزیز رکھتی ہیں اور جس وقت یہہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ باقی تمام حرکات نہایت ہی مہربانی اور نازبرداری کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ نتیجہ ہے اہل ہندوستان کے اُس غلط اور خودغرضی کے خیال کا جس سے اُنھوں نے اپنے آپ کو اُناث سے اِس قدر بلند پایہ اور اُن کا حاکمِ مُطلق سمجھ رکھا ہے۔ اور اُن پر طرح طرح کی غلامی کی قیدیں لگا رکھی ہیں۔

جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اور جو اصلاح نفس اور اصلاح ابنائے جنس کے خواہاں ہیں۔ اُنہیں گالیوں سے قطعی پرہیز کرنا چاہیئے۔

زبان ہی انسان کی تہذیب کا پہلا معیار ہے۔ اور گفتار کا اثر انسان کے افعال اور اخلاق پر ہوتا ہے۔ کبھی کوئی شخص مہذب نہیں بن سکتا جبتک اُس کی زبان مہذب نہ ہو۔ گالیاں بد تہذیبی کا نشان ہیں اور بے تہذیبی کی یادگار ہیں۔ اور ہر ایک شخص کو کوشش کرنا چاہیئے۔ کہ وہ اِن سے احتراز کرنے اور اپنی اولاد کو ایسے لوگوں کی ہم نشینی سے بچائے جو دشنام دہی کے عادی ہیں۔ گالیوں کی عادت نہ صرف انسان کو اخلاقی اور روحانی اصلاح سے باز رکھتی ہے۔ بلکہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے ناقابل کر دیتی ہے اور خودداری اور غیرت کا مادہ دُور کر دیتی ہے۔ اِس لئے کہ جو دوسروں کو بُرا کہتا ہے۔ وہ سُنتا بھی ضرور ہے (بقول شاعر)

دہنِ خویش بدُشنام میالائے صائب
کیں زرِ قلب بہر کس کہ دہی باز دہد



عبدالرشید چشتی مرحوم کا مضمون جو اخبار چودھویں صدی راولپنڈی مؤرخہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۲ء میں طبع ہوا

سر سیّد مرحوم کی برسی

۲۷ مارچ حال کو سیّد مرحوم کو رحلت فرمائے۔ چار سال پورے ہوگئے۔ سر سیّد مسلمانوں کی قوم کے لئے جو کچھ کر گیا ہے اُسکو کون نہیں جانتا۔ قوم میں اگر احسان شناسی اور شکر گذاری کا کچھ بھی مادہ باقی ہے۔ اور رہیگا تو چار سال کیا چار سو سال کے بعد بھی اُس کی یاد دلوں میں تازہ رہیگی۔ اس نے اس گئے گذرے زمانہ میں اسلام کا نام رکھ لیا۔ اور اپنے نانا کی اُمت کے جہاز کو تباہی اور بربادی کے بھنور سے نکال کر اُسے آئندہ کے لئے ایک سیدہا رستہ دکھا دیا۔ اُس کی دلسوزی۔ اُس کی جانفشانی۔ اُس کی بے نفسی آج چراغ لے کر ڈھونڈیں تو کسی مسلمان میں نہیں پائی جاتی۔ اُس نے خفتہ قوم کے جگانے میں اپنی عمر کھپا دی۔ حاکمانِ وقت کے دل میں قوم کی طرف سے جو بدظنی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کو دُور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اوہامِ باطل کو توڑنے اور مختلف فرقوں کو شیر و شکر کرنے میں ہزاروں کفر کے فتوے لئے۔ اپنی جان تک کو معرضِ خطر میں ڈالا مگر جو حق سمجھا کہا اور قوم کے لئے جس بات کو مفید خیال کیا وُہی کیا۔ وُہی پہلا شخص تھا جس نے قوم کو جہل اور تاریکی کے گڑھے میں گرا ہوا پا کر پیغمبرؐ کا قول یاد دلایا۔ کہ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ پھر اُن کو گذشتہ علمی فتوحات کے تذکرے سُنا کر نئی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ اور بتایا

کہ مغرب کی طرف سے جو طوفان اُٹھا چلا آتا ہے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ مغربی ہتھیاروں سے مسلح نہ ہوں گے وہ پسپا ہو جائینگے۔ اور گرد و غبار کیطرح اُڑ جاوینگے پس مسلمان اگر ایسے شخص کا احسان نہ مانینگے تو کس کا مانینگے اور اگر اُس کی یادگار قائم کر کے آئندہ نسلوں کو اُس کی قومی ہمدردی اور بے غرض انسانی خدمت کا نمونہ نہ دکھائینگے تو اُس احسان فراموش قوم سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ احسان کا ماننا اگر کسی اَور قوم کے لئے قابل تحسین ہے۔ تو مسلمانوں کا عین ایمان ہے۔ اِس لئے کہ اُن کے مذہب میں صاف لکھا ہے کہ جس نے انسانوں کا شکر نہ کیا۔ اُس نے خدا کا شکر نہ کیا +

سر سیّد کی وفات پر بیشک قوم کے ہر اہلِ دل کو ایک سخت صدمہ ہوا تھا۔ اور سب نے اُس عظیم قومی نقصان کو محسوس کیا تھا۔ اور اِس خواہش نے بہت سے دلوں کو متحرّک کیا تھا۔ کہ قومی یونیورسٹی بنجائے۔ مگر افسوس ہم کوششوں میں سُست ہو گئے ہیں اور اپنی معمولی سہل انگاری سے ایک ایسے عظیم الشّان کام میں غفلت کر رہے ہیں۔ ہرچند دلوں میں ارمان بھرے ہوں مگر بظاہر عملی کارروائی کچھ بھی نہیں۔ اِس دفعہ لاہور میں چند ہمدردان قوم کا ارادہ ہے کہ خاص اہتمام سے برسی منائی جائے۔ بیرونجات سے بھی بعض اصحاب نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ بعض نوجوانوں کا ارادہ ہے کہ گھر گھر پھر کر میموریل فنڈ کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ اور پیسہ آنہ روپیہ جو کچھ کوئی دے اُسے خوشی سے قبول کیا جاوے۔ اور سر سیّد میموریل فنڈ میں داخل کیا جاسکے۔ پیش ازیں کہ رسم ... ابنائے قوم اور

سر سیّد مرحوم کے ثنا خوانوں اور فدائیوں کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنے دبے ہوئے جوش کو متحرک کرکے اب کے ۲۷ یا ۲۸۔ مارچ کے دن مختلف شہروں اور قصبوں میں جلسے کریں اور چند روز پہلے سے کچھ چندہ جمع کرنے کیلئے مستعد ہو جائیں اور تھوڑا یا زیادہ جو کوئی دے اُسے لے لیں کہ قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ اس بات کو سب جانتے ہیں کہ سر سیّد میموریل فنڈ کے لئے جو کچھ کیا جائے گا وہ قوم کی تعلیم کے لئے ہوگا۔ اور آئندہ نسلوں کی بہبودی کے لئے۔ پس اگر محض شکر گذاری کے خیال سے ہم یہ جھگڑا اپنے سر پر نہیں لے سکتے۔ تو خود غرضی سے ہی سہی۔ اِن کئی سالوں کے اِسقدر غلغلے کے بعد اگر اسلامی یونیورسٹی ایک موہوم خیال ثابت ہو اور قوم کو مایوسی کا منہہ دیکھنا پڑے۔ تو اِس سے بڑھ کر قوم کے لئے اور قوم کے ہر فرد کے لئے کوئی زیادہ شرمناک بات نہیں ہو سکتی +

علی گڈھ کالج کے طلباء جو مختلف شہروں میں موجود ہیں۔ اُن سے کوئی ایسی درخواست کرنی تو تحصیل حاصل ہے۔ اس لئے کہ اُن کا تو اس کام میں حصّہ لینا فرض منصبی ہے۔ اور اُمیّد ہے کہ وہ اِس موقعہ کو نہایت کامیاب کرکے دکھائیں گے۔ اور محبّت و ہمدردی کا جو سبق اُنہوں نے قومی درس گاہ سے سیکھا ہے۔ اُس پر عمل کرینگے +

خاکسار

عبدُالرّشید چشتی

مضمون جو عبدالرشید چشتی (مرحوم) نے سرسید مغفور کی چوتھی برسی کے موقعہ پر بروز جمعرات ۲۷۔ مارچ ۱۹۰۲ء بہ صدارت مولوی محمد شاہدین بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا اسلامیہ کالج لاہور کے ہال میں پڑھا

جناب صدر انجمن و حضرات

نوعِ انسان کی تواریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ دُنیا میں دو قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنکو قدرت نے دوسروں کی راہ بری کے لئے پیدا کیا ہے اور دوسرے پیروی کیلئے۔ ایک امام اور دُوسرے مقتدی۔ مُہذّب سے مُہذّب سوسائٹی یا وحشی سے وحشی قوموں کو دیکھئے سب جگہ یہی سلسلہ موجود ہے۔ ہر مُلک کے لئے بادشاہ۔ ہر رعایا کے لئے حاکم۔ ہر قافلہ کا سالار۔ ہر فوج کے لئے سردار ہر محفل کے لئے میر مجلس اور ہر محکمہ کے لئے ایک افسر ہؤا کرتا ہے۔ اور تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ سوسائٹی کی کل کے چلنے کے لئے یہ انتظام ضروری بلکہ لابُدی ہے۔ جمہوری سے جمہوری سلطنتوں کو بھی بغیر حاکموں۔ پریزیڈنٹوں کے چارہ نہیں۔ لیکن جہاں تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے وہاں مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ تمام انسان خلقت سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اپنے ہمجنسوں سے بہت اعلےٰ قویٰ لیکر دُنیا میں آتے ہیں۔ اِس کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں۔ مگر

اِس سے انکار کرنے کی کسی کو مجال نہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ماں کے بطن
سے ایک بچہ نہایت ذکی اور ہوشمند پیدا ہوتا ہے اور دوسرا نہایت کُند اور بلید
بلکہ دیوانہ۔ اسی طرح ہر زمانہ اور قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔
جو اپنے عام ہمعصروں سے خاص خاص باتوں میں فائق اور ممتاز ہوتے ہیں
اور وہ اپنی طبعی فوقیّت کے باعث اُن کے سرگروہ اور امام بن جاتے ہیں۔ اُنہیں
یہ ملکہ موجُود ہوتا ہے کہ اپنے اعلےٰ جذبات اور قوُے کے ذریعہ دُوسروں کو ایسا
مُؤثّر کریں کہ وُہ اُن کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ لیکن مُشاہدہ نے یہ بھی ثابت کر دیا
ہے۔ کہ عوامُ النّاس میں پیروِی اور اطاعت کا جوہر بھی طبعی موجُود ہے۔ جہاں
کِسی میں کوئی غیر معمُولی بات دیکھی پہلے حیرت ہوئی۔ پھر حیرت مدح وستائش
میں بدل گئی اور ارادت وعقیدت اور تعظیم و پرستش کی حد تک پہونچ گئی
لیکن یہ بات انسان کی فِطرت میں داخل ہے۔ اور دُنیا کے کارخانے کے
چلنے کے لئے یہ بھی لازمی تھا۔ ہرچند اس میں بہت غلطیاں ہوئیں اور
ہوتی رہیں گی۔ مگر دُنیا کی تاریخ یہہ بات پُکارے کہہ رہی ہے۔ کہ ایسے فطری
جوہر کے مناسب اور ٹھیک اِستعمال سے قومیں ترقّی کرتی ہیں اور اِسی کے
بے محل اور غلط اِستعمال سے وُہ ذلیل اور پست ہو جاتی ہیں۔ بہر حال ہمیں
یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تماشاگاہ عالم کے سٹیج پر
ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص ایسا آتا رہتا ہے۔ اور کوئی ایسا کھیل دکھاتا ہے
کہ دیکھنے والے عش عش کرتے رہ جاتے ہیں۔ وہ ہزاروں دلوں کو اپنی
طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور ایک جادوگر کی طرح جو چاہتا ہے اُن سے کرا لیتا ہے۔

اور پھر پردۂ عدم کے پیچھے غایب ہے ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تماشا گر مختلف حالات اور مختلف اقسام کے ہُوا کرتے ہیں ؎

ہر یکے را بہر کارے ساختند

کوئی تو ان میں میدانِ جنگ اور فتحِ ممالک پر مٹے ہوتے ہیں جیسے سیزر سکندر۔ تیمور۔ نادرشاہ۔ نیپولین وغیرہ کہ اُن خدا کے بندوں نے اپنے زمانہ میں دُنیا کو وہ وہ ناچ نچوائے اور وہ خون ریزیاں کرائیں کہ آج تک دُنیا اُن کے نام سُن کر کانپتی ہے۔ اُن کی زندگی کا مشن یہی تھا۔ کہ سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیں۔ اُن کے ایک اشارہ سے ہزاروں بندگان خدا کا ناحق خون بہ جاتا تھا۔ اور سروں کے پہاڑ بن جاتے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو کر بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکتے۔ غرض جب تک جئے ایک عالم میں فساد رہا۔ طوفان اور آندھی کی طرح آئے۔ اور بادل کی طرح کڑکتے اور گرجتے چلے گئے۔ لیکن صرف اسی لئے کہ وہ ایک خاص بات میں اپنے بنی نوع سے فائق تھے اور دوسروں کو زیرِ فرمان کرنے کی لیاقت رکھتے تھے۔ لاکھوں آدمیوں نے دُنیا میں اُنکو اپنا رہبر اور معبود بنا کر رکھا۔ اور عملی طور پر اُنکی پرستش کی۔ اِس سے بڑھ کر اور کیا پرستش ہو سکتی تھی۔ کہ جان تک اُن کیلئے دریغ نہ کی۔

اہلِ سیف کو چھوڑ کر اہلِ قلم کی طرف آئیے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض اہلِ قلم نے دُنیا میں کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ خصوصاً آجکل کے زمانہ میں کہ جو اہلِ قلم یا اہلِ زبان مانے گئے ہیں وہ بے تاج و تخت کے شہنشاہی کرتے ہیں۔ بادشاہوں تک کو اُن کی حالت پر رشک ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اُن کی تعظیم و تکریم میں سب سے

آگے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے قلم سے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور سلطنتوں کو لڑا دینا یا قوموں میں صلح کرا دینی اُن کے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں۔ اُن کا قوتِ بیان اور قوتِ خیال اُن کے ہاتھ میں ایسے آلے ہیں جس سے وہ گویا دُنیا کو اپنی مٹھی میں کئے ہوئے ہیں۔ بائرن نے اپنی پُر زور نظم سے یُونان کو ٹرکی کے قرضہ سے آزاد کرا لیا۔ سر والٹر سکاٹ نے سکاٹ لینڈ کے منظروں کی تعریفیں کرکے اپنے مُلک کو دُنیا کے سیّاحوں کا ایک زیارتگاہ بنا لیا۔ شیکسپیئر نے انگریزی قوم کے دلوں پر صدیوں سے جو سکّہ بٹھا رکھا ہے اُس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں اور ایسی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں *

اہلِ سخن کے بعد اگر ہم اُس متبرّک گروہ کی طرف آئیں جو دُنیا کے رُوحانی اور اخلاقی حکمران ہو گذرے ہیں۔ جن میں انبیاء۔ شُہدا۔ اولیا۔ اوتار اور ریفارمر شامل ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے بعض نے اپنی روحانی طاقت اور قلبی صفائی سے وہ حیرت ناک تغیّرات پیدا کئے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اُنہوں نے بغیر دولت یا ثروت کے۔ بغیر آبائی حکومت یا سلطنت کے دُنیا کو اپنا غلام بنا لیا اور جس راہ پر چاہا اُن کو چلایا۔ جہاں اُنکا پسینہ گرتا تھا وہاں اُن کے پیرو اپنا لہو بہاتے اُن کے لئے اپنا وطن چھوڑتے۔ باپ بیٹے سے۔ بھائی بھائی سے الگ ہو جاتے۔ اُن کی ایک نظر سے وحشی سے وحشی قومیں طرفتہ العین میں تہذیب اور شائستگی کے معراج پر پہنچ گئیں ہر چند کہ اُن میں سے اکثر نے بہت ایذائیں بھی برداشت کیں۔ دُکھ اُٹھائے

حاسدوں کی ملامت اور دشنام کے تیروں کے ہدف بنے مگر دُنیا میں ایسی آگ سُلگا گئے۔ کہ قیامت تک نہ بُجھے۔

مذہب کے فلسفہ پر جن لوگوں نے غور کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر کام کے لئے انسان طبعاً کوئی نظیر یا مثال ڈھونڈتا ہے۔ اور گو تمام انبیا ہمیشہ سے یہ تعلیم کرتے آئے ہیں۔ کہ ایک خدا کی ذات ہی تمام صفاتِ کاملہ کی جامع ہے اور اُسی کو تمام عبادت سزاوار ہے۔ مگر انسان ہے۔ کہ سب سُنتا ہے مان بھی لیتا ہے۔ مگر پھر خدا کو کسی جسمانی صورت میں ڈھونڈتا ہے۔ قدرتی چیزوں۔ درختوں۔ حیوانوں اور عناصر کو پُوجنے لگتا ہے۔ لیکن جب کسی میں اپنے چال چلن اور طریق زندگی کے لئے مثال نہیں پاتا تو اپنے ہاتھ سے مٹّی کی مورت بناتا اور اُس کی پرستش کرتا ہے۔ مگر اُس سے بھی مایوس ہوجاتا ہے آخر اپنی راہبری کے لئے کسی انسان کو ہی ڈھونڈتا ہے۔ چنانچہ بعضوں نے اپنے پیشواؤں کو خدا کا اوتار مانا۔ عیسائیوں نے جناب مسیحؑ کو خُدا بنا دیا۔ لیکن یہ نتیجہ اُسی طبعی مردُم پرستی کا تھا جسے انگریزی میں ہیرو ورشپ کہتے ہیں اور جس کی طرف میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں۔ صرف بعضوں نے اِس میں مُبالغہ کیا اور حدِّ اعتدال سے بڑھ گئے ورنہ اِس کے عین انسانی فطرت ہونیمیں کوئی شک و شُبہ نہیں ہے۔ اطاعت۔ ارادت اور ستائش تمام مذاہب کے اصل اصُول ہیں۔ اسلام نے کافۃُ المُسلمین کے لئے جناب سرورِ کائنات کی ذات مجمع صفات کو پیش کیا ہے۔ اور ذرا اپنے دلوں سے پوچھئے۔ کہ اُس مُبارک نام سے مسلمانوں کو کیا نسبت اور کیا تعلّق ہے۔ بدکار ہیں۔ نالائق ہیں۔

ذلیل و خوار ہیں۔ احکام شرع سے کوسوں دُور پڑے ہیں۔ مگر مسلمان اُس نام کو سُنکر ہاتھوں کو چُومتے ہیں۔ آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ درُود پڑھتے ہیں۔ کہیں اُس عرب کے ریگستان میں بکریاں چرانے والے اُمّی پیغمبر کا ذکر ہو رہا ہو پھر دل ہیں کہ محبّت کے دریا بنے ہوئے ہیں۔ اور چشموں کی طرح سے اُبل رہے ہیں۔ مولانا حالی نے مُسلمانوں کی اِس اسادت کو کیسی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ شعر

اُمّت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دِل دادہ تیرا ایک سے ایک اُنمیں سوا ہے
ہر چند کہ پامالِ دہرِ مُخالف ہیں تیرا نام
ہتھیار جوانوں کا ہے پیروں کا عصا ہے
جو خاک تیرے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لئے داروُئے شفا ہے
جو شہر ہُوا تیری ولادت سے مُشرّف
اب تک وُہی قبلہ تیری اُمّت کا رہا ہے
جس مُلک نے پائی تیری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اُس کی ہر اک دل میں سوا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پر آخر ہیں تمہارے
نِسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے۔

اِسی اِنسانی عادت کو دیکھ کر جناب فخرِ عالم نے اپنے بعد اُن

لوگوں کو قیامت تک اُمّت کا سردار بنایا۔ اور اُن کی تعظیم کو داخل ایمان کر دیا جو ہر زمانہ میں اُس انسان کامل کی مثال کو پیشِ نظر رکھکر ہمدردی۔ خود ایثاری۔ محبّت اور اخلاق میں اپنے ہمعصروں میں سربرآوردہ ہوں اور اسلام کی مشعل کو روشن رکھنے میں ساعی ہوں۔

اسلام کی تاریخ نے بھی مختلف صیغوں میں متعدد ہیرو پیدا کئے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ہمیشہ زمانہ کی ضرورتیں اور حالات ہیرو پیدا کیا کرتے ہیں۔ آج جس شخص کی یاد میں یہ جلسہ قائم کیا گیا ہے۔ اُس کے طبعی جوہر بھی خاص حالات نے دُنیا پر ظاہر کئے اور وقت کی ضرورت نے اُس سے وہ کارہائے نمایاں کرائے جس کے لئے ہندوستان کے مُسلمان اُس کے احسان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

یوں تو جو دل اور آنکھیں رکھتے ہیں۔ اور جنھوں نے اپنے ایمان اور بصیرت کو بیچ نہیں کھایا۔ وہ کب انکار کر سکتے ہیں۔ کہ سیدؔ مرحُوم کا وجُود اس زمانہ میں اسلام اور مُسلمانوں کے حق میں ابر رحمت سے کم نہ تھا پھر بھی ہمارا یہ فرض ہے۔ کہ ہم اُس کی نسبت جو رائے قایم کریں وہ محققانہ ہو اور دیکھیں کہ آیا سرسیّد قومی ہیرو کے خطاب کا کہاں تک مُستحق ہے اور آیا ہم اُس کا نام دُنیا کے آگے اور آئندہ نسلوں کے آگے فخر سے پیش کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مینے اس بحث کو اِس لئے چھیڑا ہے۔ کہ اب سرسیّد ہم میں سے اُٹھ گیا ہے۔ اُس کی وفات کو بھی چند سال گذر گئے ہیں اب کوئی بات ایسی نہیں کہ ہماری آنکھوں کو چکا چوند کر دے۔ اب

کوئی ذاتی غرض یا منفعت کا خیال باقی نہیں ہے۔ اور جو فیصلہ اسوقت قوم سیّد کی نسبت امعان نظر سے فرماوے گی وُہی سچّا فیصلہ ہوگا۔ اور غالباً آخری فیصلہ ہوگا۔ اور اِس لئے ضرورت ہے۔ کہ مُسلمان اُس کے زندگی کے حالات کا بغور مُطالعہ کریں۔ اور اپنے دل کو کسی رعایت یا تعصّب سے خالی کرکے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں اُس کے لئے وہ کرُسی تجویز کریں جو اُس کے منصب کے لائق اور سزاوار ہے۔

مُجھکو جہاں تک سیّد مرحوم کے حالات پر غور کرنے کا موقع ہوُا ہے۔ اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ قوم کے اکثر اہلُ الرّائے مجھُ سے اتّفاق کرینگے۔ کہ سیّد خدا کا ایک نہایت برگزُیدہ بندہ تھا۔ نہ صرف مُسلمانوں کے لئے وہ ایک غیر معمُولی شخص تھا۔ بلکہ آج دُنیا کی سب سے مُہذّب قومیں بھی اُس پر فخر کرسکتی تھیں۔ جس وقت اُس نے قومی ہمدردی کا دم بھرنا شروع کیا اور پھر جس عزم اور استقلال سے تا دمِ آخر اپنے مشن کو نباہا وہ لاکھوں میں ایک نہیں کروڑوں میں سے ایک کا کام تھا۔ سلطنت مُغلیہ کا ٹمٹماتا ہوُا چراغ اُس کے سامنے گُل ہوُا۔ اور پھر اُس نے وُہ قیامت خیز ہنگامہ دیکھا جس نے مُسلمانوں کی رہی سہی طاقت۔ رہی سہی عزّت۔ دولت اور عظمت کو خاک میں ملا دیا اور گویا ہمیشہ کے لئے اِن کے نام گمنامی اور بربادی کا فتویٰ لکھدیا۔ اُس وقت جبکہ ہر شخص نفسی نفسی پُکار رہا تھا۔ اِس شخص کا قوم کی حالت زار دیکھ کر دل پگھلا جاتا تھا۔ اُس وقت تمام ہندوستان میں کوئی دوسرا فرد نہ تھا جو اِس خبط میں مبتلا ہو اور جس کے دل کو اِتنی چوٹ ہو۔

عوام دُوسروں کے بھڑکائے بہکائے قتل و غارت پہ آمادہ۔ اُمرا جاہل و مغرور اور اپنی مُصیبت میں مُبتلا۔ عالم بے عقل اور مُفسد۔ نہ قوم میں اتفاق نہ کوئی سربراہ۔ حاکمانِ وقت سخت بدظن اور خُون کے پیاسے۔ اُسوقت وُہ یکّہ و تنہا سب باتوں کو سوچتا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا۔ کہ کیا کرے۔ اُسنے قوم کی طاقت کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا۔ اور سمجھ لیا تھا کہ مُسلمانوں کے لئے اب سلطنت کے خواب دیکھنے اور اِس خبط کو پالنا ایسا ہے جیسا بچّہ کے ہاتھ میں تیز چھُری۔ اِس نازک گھڑی میں ہاشمی خُون میں حرکت ہُوئی اور رگِ حمیّت نے جوش مارا۔ اُٹھا اور کمرِ ہمّت چُست باندھ کر پہاڑ کی استقامت سے ڈٹ گیا۔ اور تعصّب۔ جہالت اور خود غرضی کی فوجوں سے ایک جنگِ عظیم کی طرح ڈالی اور جب تک بدن میں جان رہی ہتھیار ہاتھ سے نہ دئیے۔

حاکمانِ وقت کے دل میں جو غلط فہمیاں تھیں۔ اُن کو دُور کرنے میں کِسی ذاتی غرض کا خیال نہ کیا۔ اور جو کچھ سچ سمجھا صاف کہدیا۔ ہرچند گورنمنٹ کے سر پر اُس وقت انتقام کا بھُوت چڑھا ہوُا تھا۔ مگر انگریزوں کی قوم ہے مرُدم شناس۔ اُس کی سچّائی۔ اُس کے طبعی جوہر۔ اُس کی بے نفسی کو فوراً تاڑ گئے۔ دیکھا کہ اِس خراب آباد ہندوستان میں بھی کوئی بے غرض اور ہمدردِ بنیِ نوع ہو سکتا ہے۔ اور سچ پُوچھیئے۔ تو انگریزوں نے سرسیّد میں جو خُوبیاں دیکھیں وُہ شائید ہم خود نہ دیکھ سکتے۔ اور جو قدردانی انگریزوں نے اُس کی کی ہے۔ وہ مُسلمان نہیں کر سکے۔ اوس کا ایک ادنےٰ ثبوت یہ ہے۔ کہ سیّد کی سوانح عُمری سب سے اوّل ایک انگریز نے ہی لکھی تھی۔

غرض راجا اور پرجا کے تعلّقات میں اصلاح کرنا سیّد کی زندگی کا ایک مشن تھا۔ اور بحالاتِ موجودہ اُس نے اُس میں جو کچھ کر دکھایا اُسی کا کام تھا۔

سرسیّد کی زندگی کا دوسرا مشن تھا مُسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح۔ وہ یہ خوب جانتا تھا۔ کہ مُسلمانوں کا تمام دارومدار مذہب پر ہے۔ اور مُسلمان اگر بہ حیثیّتِ قوم قوم بن کر رہ سکتے ہیں۔ تو صرف مذہب کی بناء پر۔ مذہب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مذہب اُن کی دُنیا ہے۔ اور مذہب ہی دین ہے۔ اگر مذہب نہیں تو مُسلمان کہاں۔ چنانچہ اسی لئے اُس نے اِس میدان میں بھی قدم رکھّا۔ حالانکہ وہ دینیات کا کوئی عالم مُتبحّر نہ تھا۔ مگر عقل سلیم کی مدد اور اپنی صداقت کے بھروسہ پر یہ بیڑا بھی اُٹھالیا اور لگا اپنا سا راگ گانے۔ لیکن مُسلمان تو ہورہے تھے بالکل لکیر کے فقیر۔ اُس کی باتیں سُنکر بہت جُھنجلائے۔ بعض مولویوں نے دیکھا کہ یہہ شخص ہماری کسدبازاری کے درپے ہے۔ لگے فتوے پر فتوے دینے اور بہکی بہکی باتیں کرنے۔ کوئی حضرت مکّہ شریف صرف اِسی خاطر گئے کہ وہاں سے سیّد کے لئے کُفر کا فتویٰ شیخ مکّہ سے لکھوا کر لائیں۔ چنانچہ وہ اِسی ضمن میں حاجی بھی بن آئے۔ اور سیّد صاحب نے اپنے کُفر پر ناز کیا جو لوگوں کو حج کرا دیتا ہے۔ کوئی نا مُلائم لفظ نہ تھا جو اُس بزرگ کے لئے تجویز نہ کیا گیا ہو۔ قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ مُنہ پر بُرا بھلا کہا گیا۔ فحش خط لکھے گئے۔ مگر وہ کوہ تحمّل اِن باتوں سے کب ڈرنے والا تھا۔

جو فلاحِ قوم کی آئی سمجھ میں اُسکے بات
بر ملا کہتا رہا اور بر ملا کرتا رہا
تھی اُسے پروائے تحسین اور نہ کچھ نفرین کا ڈر
اُس کو جو کرنا تھا بے روے وریا کرتا رہا
ناسزا سُنتا رہا اور مرحبا کہتا رہا
کُفر کے فتووں میں کام اسلام کا کرتا رہا
اپنے دل پر سینکڑوں سہتا رہا رنج و الم
دردِ دل کی قوم کے لیکن دوا کرتا رہا

سرسیّد کا تیسرا مشن تھا قومی تعلیم اور یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا مشن سمجھا جاتا ہے۔ کوئیل کا مدرسہ اُس کی ایک زندہ یادگار ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمیشہ قائم رہے۔ میں سیّد کی تعلیمی خدمات پر زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ وہ آفتاب کی طرح سب پر روشن ہیں۔ مختصراً یہہ ہے کہ قرض لے کر ولایت کا سفر کیا۔ کہ وہاں کی تعلیمی حالت کا مُطالعہ کرے۔ سائینٹفک انسٹیٹیوٹ جاری کیا۔ بُہت سی مُفید کتابیں اُردُو میں ترجمہ کروائیں۔ کالج کی خاطر اپنا وطن چھوڑا۔ اور وطن بھی کون۔ دِلّی۔ علیگڈھ میں رہائش اختیار کی۔ کالج کے لئے کاسئہ دریُوزہ ہاتھ میں لیا۔ شاہ سے بھی مانگا اور گدا سے بھی۔ سرکار سے امداد طلب کی۔ ریاستوں کے آگے ہاتھ بڑھائے۔ دوستوں کے جیب ٹٹولے۔ اپنا تمام متاع خرچ کیا۔ جب تک جیا گداگری کرتا رہا۔ کہ مُسلمانوں کی نسل

کی ایک تعلیم گاہ بن جاوے۔ ؎

کاسۂ دریوزہ سے ڈالی بنائے قصر و کاخ

کام جو شاہوں کا تھا سو یہ گدا کرتا رہا

اپنے گرد دوستوں کا ایک مجمع اکٹھا کیا۔ اپنے گھر کو ایک مہمان خانہ بنا دیا۔ چاہا کہ دوسروں کو بھی اس جنوں میں شامل کرے۔ مگر قومی مجنوں بنائے سے کب بنتے ہیں۔ چند قدم چل کر رہ گئے۔ اُس کے درد اُس کی دل سوزی۔ اُس کے استقلال کو کوئی نہ پہونچا۔ شعر

زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم

ناتوانی مے توانی سیّد احمد خان شدن

درد کا لپکا تو نیت سے دلوں کو لگا دیا۔ مگر زبانی جمع خرچ کرنے والے زیادہ تھے اور عملی کام کرنے والے کم۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں "وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ اُسکی تلاش میں دور و دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مُشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے۔ اُنہیں کو دُشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتلتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کُفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں بھائی بند عزیز و اقارب سب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر

چُپ ہو رہتے ہیں۔"

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں

بھائی سیّد تو کچھ دوانے ہیں

"ساتھی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر ہاں ہاں کہہ کر محنت اور دل سوزی سے دُور رہ کر۔ بہت سے ہمدردی کرتے ہیں۔ مگر کوٹھی کُٹھلی سے الگ رہ کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔" فراہمی چندہ کے لئے کئی بار پنجاب کا سفر کیا۔ گیروے کپڑے پہنے کچکول ہاتھ میں لیا۔ تھیٹر بنایا۔ اس پر۔ ما نمے خواہیم ننگ و نام را۔ گا یا۔ قوم میں تعلیم کا چرچا عام کرنے کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس بنائی۔ غرض اِس پیرانہ سالی میں۔ بیماری میں۔ رنج و راحت میں قوم کی خدمت نہ چھوڑی اور آخر اکیاسی برس کی عمر میں جب مرا۔ تو پاس کفن کیلئے پیسہ اور نہ سر پر رہنے کے لئے اپنی چھت تھی۔

مولانا حالی نے ایک چھوٹی سی نظم میں سرسیّد کے صفات کا ایک نقشہ کھینچا ہے۔ جو بلحاظ سادگئ زبان کے اور جدّت مضمون کے اپنا آپ ہی نظیر ہے یقیناً آپ میں سے اکثر اصحاب نے وہ نظم پڑھی ہوگی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے اِس موقعہ پر پھر سُناوُں۔ وہ فرماتے ہیں۔

کاٹے دن زندگی کے اُن یگانوں کیطرح ۔۔۔ جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کیطرح

منزلِ دُنیا میں ہیں پادرِ رکاب آٹھوں پہر ۔۔۔ رہتے ہیں مہانسرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں ۔۔۔ جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرمانروا — نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کیطرح

شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں — غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کیطرح

رکھتے ہیں تمکین جوانی میں بڑھاپے سے سوا — رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کیطرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی — پر بھلا تکتے ہیں اِک اِک کا یگانوں کیطرح

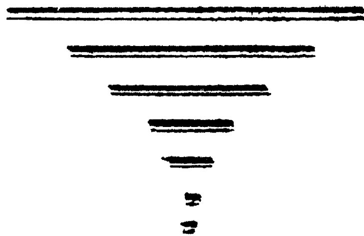
آس کھیتی کے پنپنے کی اُنہیں ہو یا نہ ہو — ہیں اُسے پانی دئے جاتے کسانوں کیطرح

اُنکے غُصّہ میں ہے دلسوزی مُلامت میں ہے پیار — مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام ہے کام اُن کو اپنے گو ہو عالم نکتہ چین — رہتے ہیں بتّیس دانتوں میں زبانوں کیطرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار — دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کیطرح

کیجے کیا حاؔلی نہ کیجے سادگی گر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح



بچوّں کا اخبار بابت ماہ جون سنہ ۱۹۰۲ء

بچوّں کو اخبار کی مبارک

مَیں مُدّت سے اُس دن کا منتظر تھا کہ اِس مُلک میں کوئی ایسا اخبار نکلے جو صرف بچوّں کے فائدے کے لئے ہو۔ جسے پڑھ کر وہ اِس طرح خوش ہوں جس طرح کوئی کسی دوست کو مل کر خوش ہوتا ہے۔ اور جیسے کوئی نیک دوست یا بزرگ اُن سے مزے مزے کی باتیں کرتا۔ کبھی کہانیاں سُناتا۔ کبھی کوئی چیستان کہتا۔ اور ساتھ ہی محبّت سے اُنہیں نصیحتیں بھی کرتا جاتا ہے۔ اور بچوّں کو فریفتہ کرلیتا ہے۔ اسی طرح ہر مہینے کے بعد بچےّ اس اخبار کے ملنے کے مشتاق رہیں اور جب اُس سے ملیں تو اُس کی باتوں سے خوب لُطف حاصل کریں۔ کیوں صاحب! کیا یہ تعجّب کی بات نہیں ہے۔ کہ مردوں کے لئے تو بیسیوں اور سینکڑوں اخبار ہوں عورتوں کے لئے بھی کئی اخبار مُلک میں نکل چُکے ہوں۔ اور ہمارے پیارے بچوّں کے لئے جن سے مُلک کو آئندہ بہتری کی اِس قدر امید ہے۔ کوئی اخبار یا رسالہ نہ ہو۔ اخبار کا پڑھنا تو اب مہذّب ملکوں میں ایسا ضروری ہوتا جاتا ہے جیسا کھانا پینا۔ بہت سے لوگ ہیں جنہیں اگر ایک دن کے لئے اخبار نہ ملے تو وہ بیچین ہونے لگتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں بھی بُہت لوگ اخبار پڑھنے کے عاشق بن گئے ہیں۔ اور خواہ اُن کی آمدنی قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی اخبار ضرور منگواتے یا کسی ہمسایہ یا کسی کتب خانہ میں جاکر اخبار ضرور پڑھتے ہیں۔

اور ولائیت کے مُلکوں کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ وہاں تو مہتر جو سڑکیں صاف کرتا ہے۔ اور گھروں کی خادمہ جو برتن دھوتی اور روٹی پکاتی ہیں۔ وہ بھی اخبار ضرور پڑھتی ہیں۔ اور مُلک کی باتوں میں اُنہیں اسقدر دلچسپی ہوتی ہے۔ کہ جب وہ ادنٰے اور غریب لوگ مُلکی معاملات پر آپس میں گفتگو یا بحث کرتے ہیں۔ تو اُن کے جوش کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ گویا کسی نہائیت ضروری اور ذاتی معاملہ پر باتیں کر رہے ہیں۔ اِن اخباروں کے پڑھنے سے اُن کے خیالات میں اُنکی تہذیب میں۔ ہمّت میں علم میں۔ مُلکی ہمدردی میں اِس قدر ترقی ہوئی ہے کہ وُہ مُلک کے نقصان کو اپنا نقصان اور مُلک کے نفع کو اپنا ذاتی نفع سمجھنے لگے ہیں۔ آج لندن میں کوئی بُری خبر دُنیا کے کسی حصّہ سے آجائے۔ کہ فلاں جگہ کسی انگریزی فوج کو شکست ہوئی یا کسی انگریزی جہاز کو سمندر میں نقصان پُہنچا تو تمام قوم سہم جاتی ہے۔ لوگ پارلیمنٹ میں جمع ہوتے ہیں۔ فوراً تدبیریں سوچتے ہیں۔ اِسی طرح کسی خوشی کی خبر پر ہزاروں آدمی اپنے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ اور بازاروں میں جمع ہوکر اپنی ٹوپیاں اُچھالتے۔ ایک دوسرے کو گلے ملتے۔ ہاتھ ملاتے۔ خوشی کے نعرے کستے بلکہ ناچنے لگتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ اخبار اور رسالے پڑھنے سُننے کی بچپن میں اُنہیں عادت پڑ جاتی ہے اُن کو اپنے مُلک کے حالات سے ہر وقت آگاہی رہتی ہے۔ اور آگاہی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُن باتوں میں خاص دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے صرف بچوّں کے لئے ہر قسم کے اخبار وہاں بڑے سامان اور آب و تاب سے نکلتے ہیں۔ ہر عُمر کے چھوٹے بڑے بچوّں کے لئے الگ الگ مختلف قسم کے

پرچے چکنے کاغذوں پر۔ رنگین اور عمدہ تصویریں لئے ہوئے اور اچھے اچھے آدمیوں کے لکھے ہوئے چھپتے ہیں۔ کہ جس سے وہ اپنا دل پرچالیں بچوں کا اخبار جو مولوی محبوب عالم صاحب نے نکالا ہے وہ خبروں کا اخبار تو نہیں ہے۔ (اگرچہ ممکن ہے کہ بچوں کے مذاق کی خبریں بھی وُہ اسمیں درج کردیا کریں) لیکن خبروں کے اخبار کی بچوں کو علیحدہ ضرورت بھی نہیں۔ یورپ میں بھی بچوں کے لئے خبروں کے اخبار الگ نہیں ہوتے۔

ہمارے بچوں کو مولوی محبوب عالم صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے سب سے پہلے اُن کے لئے ایک ایسا اچھا اخبار نکالا ہے۔ اِس سے وہ طرح طرح کے فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔ اور اُمید ہے۔ کہ یہ اخبار مُلک کے ہزاروں ہونہار بچوں کی زندگی کو درست کرکے اُن کو مُلک کے نہائیت ہمدرد اور مفید انسان بنادیگا۔ جب وہ بڑے ہونگے۔ تو وہ اِس بات پر فخر کرسکیں گے کہ ہمنے سینکڑوں اچھی اچھی باتیں اپنے پیارے اخبار سے سیکھی ہیں۔ اور بہت سی نیک عادتیں ہم میں کبھی نہ ہوتیں۔ اگر یہ اخبار نہ پڑھتے۔ اُن کیلئے خدا کا شکر کرنا بھی واجب ہے کہ وہ ایسے وقت میں پیدا ہوئے ہیں۔ جب علم اور اخلاق۔ اور نیکی کے حاصل کرنے کیلئے ایسے ایسے ذرائع موجود ہیں۔ اُن کو سوچنا چاہیئے کہ اُن کے والدین کو یہ باتیں نصیب نہ تھیں۔ کاش بچپن کا زمانہ پھر لوٹ آئے۔ اور مَیں بھی اُس خوشی میں شریک ہوں۔ جو بچوں کو اپنے اخبار کے نکلنے پر ہوگی۔ لیکن یہ تو ناممکن ہے۔ اب میری خوشی اِسی میں ہے۔ کہ دوسروں کو جو ابھی بچے کہلاتے ہیں خوش ہوتا دیکھوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں بھی اِسمیں کبھی کبھی

کچھ لکھا کروں۔ چنانچہ آج میں اپنے ملک کے پیارے چھوٹے بچوں سے اِس اخبار کے ذریعہ ملاقات کرکے اپنا سلام اُن تک پہنچاتا ہوں۔ اور تہِ دل سے مبارکباد کہتا ہوں۔ خدا کرے۔ کہ اِس اخبار کی عمر دراز ہو۔ اور اِس کے پڑھنے والے بڑے ہو کر ہندوستان کے نامور اور اچھے باشندے بنیں +

عبدالرشید چشتی بی۔اے



اُردُو نثر مین ترجمے۔

(دماغی تعلیم)

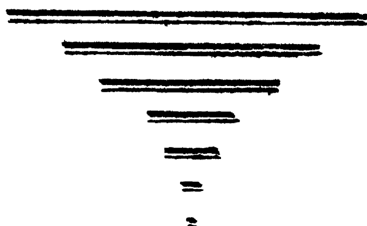
ہر زمانہ میں تعلیم کے مختلف نصاب (جو یکے بعد دیگرے مروّج ہوتے ہیں) اور تمدُن کی پے درپے حالتوں میں ایک لازمی تعلق اور مناسبت ہوتی ہے۔ چونکہ ہر عہد کے صیغجات کا ماخذ (انسٹیٹیوشن*)۔ خواہ وہ صیغجات کسی مطلب کے لئے ہوں اُس قوم کا دل و دماغ ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اُن میں باہم ایک خاندانی مُشابہت ہو۔ جب لوگ اپنا پنتھ (مذہب) اور اُس کے معانی ایک بے عیب (بری از خطا) ذات سے حاصل کرتے تھے جس میں چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ تو قدرتی طور پر بچوّں کی تعلیم بھی ایک محض مُطلق العنان طریقہ پر ہوتی تھی اور جب (church) مذہب یا شریعت یہ کہتا تھا۔ کہ "بس مان لو اور کچھ نہ پُوچھو"۔ تو مدرسہ کا اصُول بھی ضروری طور پر یہی ہوتا تھا۔ برخلاف اِس کے اب جو پراٹسٹنٹ طریقہ نے بالغ العُمر اشخاص کے لئے ذاتی رائے قائم کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے اور عقل کا فیصلہ طلب کئے جانے کا طریقہ رواج پا گیا ہے۔ تو ساتھ ہی اِس کے بچوّں کی تعلیم میں بھی ایک تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اور جو کچھ اُن کو سکھایا جاتا ہے۔ اُسکی تشریح ایسے طریقہ سے کی جاتی ہے۔ کہ اُن کی سمجھ اُسے قبول کر سکے۔ مُلکی

* فٹ نوٹ۔ انسٹیٹیوشن ایک نہایت ہی وسیع لفظ ہے۔ اور اسجگہ مُراد ہے تمدن کے کل لوازمات

خود مختاری کے ساتھ جسکے احکام اٹل حکومت بزور جبر) اور نیز جرائم کے لئے سزائے موت اور باغی سے بے حد درشت انتقام کا دستور تھا تعلیمی درس گاہوں کی پابندی (عسلم مغمہ) بھی ویسی ہی سخت ہوگئی جس میں شاگردکے لئے بے شمار ہدایات ہوتے تھے۔ اور ہر حکم عدولی پر جسمانی سزا مقرر تھی۔ غرض اُستاد اپنے غیر محدود اختیارات کو ڈنڈے۔ چھڑی اور اندھیری کوٹھڑی کے ذریعہ عمل میں لاتا تھا۔ اُدھر ملکی آزادی کے بڑھنے سے شخصی افعال پر قانونی رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور قانون فوجداری کی اصلاح کے ساتھ اُس کے مشابہ ایک غیر جابرانہ تعلیم کی جانب ترقی شروع ہوئی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اب شاگرد پر کم قیود ڈالے جاتے ہیں اور فرمانبردار کرنے کے لئے سزائے بدنی کی بجائے اور ذرائع استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اس ترکِ دنیا کے اصول کے زمانہ میں لوگ اس بات پر عمل کرتے۔ کہ جسقدر رنج اور دُکھ زیادہ برداشت کیا جائے اُسی قدر بہتر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جتنے لذائذ دُنیاوی سے ہم زیادہ اجتناب کرینگے ویسے ہی ہم زیادہ نیک ہونگے تو ضرور تھا کہ وہ سب سے بہتر تعلیم اپنے بچوں کے لئے وہی خیال کرتے تھے جس میں اُن کی خواہشات کو روکا جاوے۔ اور یہ کہہ کہہ کر کہ "تمہیں یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے" اُنکی ذاتی ہمت و جودت کو خاک میں ملا دیا جاوے۔ برخلاف اس کے زمانۂ حال میں جب حصولِ فرحت ایک جائز مدعا سمجھا جانے لگا ہے۔ روزانہ محنت کے گھنٹے کم ہو کر عوام کے لئے تفریحات مُہیا ہوتی جاتی ہیں تو والدین اور اُستاد سمجھنے لگے ہیں کہ بچوں کی نہایت بھولی بھالی خواہشات کو پُورا کرنا عین مُناسب ہے اور

اُن کو کھیل کود کی رغبت دلانا ضروری نہیں ہے۔ اب یہ بات بھی اُن پر عیاں
ہوگئی ہے۔ کہ ایک بڑھنے والے دل (Growing mind) کے
دماغی قوے کی ترقی کے ساتھ جو خواہشات اور رجحان پیدا ہوتے ہیں۔
وہ ایسے پُر از شیطنت نہیں ہوتے جیسا وہ خیال کرتے تھے۔ علیٰ ہذا جس
زمانہ میں لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ مختلف تجارتوں کو ٹھیکوں اور رکاوٹوں
سے قائم کرنا چاہیئے۔ اور جو چیز ایک کاریگر بنائے اُس کی قسم اور قیمت اور
جس چیز سے وہ بنے وہ قانوناً مقرر ہونا چاہیئے۔ اور قانون ہی کو سکہ کی قیمت مقرر کرنی چاہیئے
تو کیا تعجب کی بات ہے۔ اگر وہ یہ بھی سمجھتے کہ بچہ کے دل کو جس طرح چاہیں ڈھال سکتے ہیں
کہ سکول ماسٹر اُسمیں قوے کو ٹھونس سکتا ہے اور وہ ایک برتن ہے جسمیں علم بھر
سکتے ہیں اور اُستاد جس طرح پسند کرے اُسے وضع کر سکتا ہے۔ مگر اس فری ٹریڈ
(Free Trade) کے زمانہ میں جب ہم اس بات کو سیکھ
رہے ہیں۔ کہ دُنیا کے امور خود بخود بہت کچھ ٹھیک [illegible]
ترتیب اختیار کر لیتے ہیں اور محنت (صنعت) تجارت۔ زراعت اور جہاز
رانی بغیر انتظام (دخل در معقولات) کے بخوبی چل سکتے ہیں۔ اور ذاتی حکومت
بوجہ احسن اندرونی طور پر (اور نہ بیرونی مداخلت سے) پیدا ہو سکتی ہے
جہاں یہ باتیں ہم جان چکے ہیں۔ وہاں ہم یہ بھی سیکھ رہے ہیں۔ کہ ذہنی ترقی
اور نشوونما کا ایک قدرتی عمل ہے جسے خارجی ایذا سے درہم برہم نہیں کرنا چاہیے
اور وہ دل جسکے جوہر خود بخود کھل رہے ہیں۔ اُس پر اپنے مصنوعی رنگ بھر چڑھانا
ایک غلطی ہے۔ بلکہ سائیکالوجی (علم ماہیتِ قلب) بھی ہمکو قانون (Supply
and Demand) موجودگی اور طلب (مانگ) کا سکھلاتی ہے جب اگر ہم نقصانات

نہ پہنچانا چاہیں۔ تو اُس کی مطابقت میں چلیں پس کیا بلحاظ مذہبی مُطلقُ العنانی کے اور کیا ناواجب اور جابرانہ قیود اور پابندیوں کے۔ کیا ترکِ دُنیا کے عقیدے اور کیا ہر امر میں انسانی تجاویز کے دخل کے قدیم طریق تعلیم اپنے زمانہ کے نصاب تمدُّنی کے ہمیشہ مُشابہ رہا ہے۔ اور اسی طرح زمانۂ حال کے طریق تعلیم و تربیت ہمارے زیادہ وسیع مذہبی اور مُلکی انسٹیٹیوشنوں (صیغجات) کے مُطابق اور مُتناسب ہیں*



رسالہ مخزن بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۱ء جلد ۱ نمبر ۶

حقوقِ رعایا

ذیل میں لارڈ مکالے کی ایک مشہور تقریر کا جو اُنھوں نے ۱۰ جولائی ۱۸۳۳ء کو پارلیمنٹ میں کی تھی۔ ترجمہ درج ہے۔ اُس وقت ایک مسوّدۂ قانون اِس مضمون کا پیش ہوا تھا۔ کہ ہندوستانی مقبوضات پر زیادہ مہذّب طریقہ سے حکومت کیجائے۔ یہ ترجمہ ہمارے دوست مولوی عبدُالرّشید صاحب چشتی بی۔ اے نے کیا ہے۔ جنہیں انگریزی اور اُردو علمِ ادب دونوں سے خاص دلچسپی ہے:-

صاحبان! میں آپ کا بہت سا وقت لے چکا ہوں۔ مگر اِس مسوّدہ میں ایک جُملہ ایسا ہے۔ کہ مجھے بے اختیار مجبور کرتا ہے۔ کہ اُس پر میں چند الفاظ کہوں۔ میری مُراد اُس نیکی اور ہمدردی سے بھرے ہُوئے اور مُدبّرانہ فقرے سے ہے جو یہ قرار دیتا ہے۔ کہ ہماری ہندوستانی رعایا میں کوئی شخص اپنی رنگت۔ نسل۔ یا مذہب کی وجہ سے کسی عہدہ کے حاصل کرنے کے ناقابل نہیں سمجھا جائیگا۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے لئے بھی فلسفی کا لقب تجویز نہ کیا جائے جو تنگ دل اور خود غرض لوگ ایک نہائیت مذموم اور حقارت آمیز مفہوم میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ مگر میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ مجھے اپنی

زندگی کے اخیر دن تک اِس بات کا فخر ہو گا۔ کہ مَیں نے اُس مسوّدہ کے بنانے میں جس میں یہ فقرہ موجود ہے مدد دی ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ وقت کبھی نہیں آسکتا۔ جب ہندوستانی اعلےٰ سول اور فوجی عہدوں پر مقرر کئے جا سکیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی شرط ہے۔ جس پر ہماری طاقت کا انحصار ہے ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ ہمیں اپنی رعایا کو اُن تمام نعمتوں سے بہرہ ورنہ کرنا چاہیئے۔ جن سے مُستفید ہونے کی اُن میں قابلیت ہے۔ نہیں جنکا دینا ہماری طاقت میں ہے۔ بلکہ جن کے دینے سے ہماری حکومت کے استحکام اور استمرار میں فرق آنیکا کوئی اندیشہ نہیں۔ میں اِس خیال کی بڑے زور سے تردید کرتا ہوں اور اِسے سچّی حکمت عملی اور سچّی انسانیت دونوں کے برخلاف سمجھتا ہوں میں ہرگز ایسے نازک مسئلہ میں جلدی سے کام نہیں لینا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی بھلائی اِسی میں ہے۔ کہ دیسیوں کو بڑے بڑے عُہدے بتدریج اور آہستہ آہستہ دئے جائیں۔ مگر اِس بات کا خیال آنے سے کہ جب وہ وقت آجائے۔ کہ ہندوستان کی بہتری کے لئے یہ تبدیلی ضروری ہو تو اُس وقت ہم اپنی طاقت کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے اندیشہ سے ایسی تبدیلی کرنے سے انکار کریں۔ مجھے بے اختیار رنج اور غصّہ آتا ہے۔

موجودہ صورت میں یہ پالیسی نہ صرف قابل نفرت ہے بلکہ بیہودہ ہے۔ صرف سلطنت کی وُسعت سے کوئی فائدہ لازم نہیں آتا۔ یہی وسعت بہتیری سلطنتوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ۔ اور بعضوں کے لئے مُہلک ثابت ہوئی ہے۔ زمانۂ موجودہ کا ہر ایک مُدبّر انشا تو ضرور کہے گا۔ کہ کسی قوم کی خوشحالی اُس کے

افراد کی خوشحالی پر موقوف ہے۔ اور ایسی سلطنت کی خواہش کرنا جس سے نہ کسی شخص کے آرام میں ازدیاد ہو نہ امن میں۔ محض بچوں کی سی ہوس خام ہے ؛

ہماری قوم تجارت میں ایسی بلند پایہ ہے اور صنعت و حرفت میں ایسی ممتاز ہے۔ کہ اگر کوئی دوسری قوم حصولِ علم میں۔ آسائش زندگی کے مذاق میں اور حصول دولت میں ترقی کرے تو اُس سے ہمارا سراسر فائدہ ہے۔ اُن بیشمار فوائد کا اندازہ کرنا جو مشرق کی کثیر آبادی میں مغربی تہذیب کے پھیلنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ناممکن ہے۔ اِس مسئلہ کو اگر ہم نہایت خود غرضی کی نظر سے بھی دیکھیں تو بھی ہمارے لئے یہی بہتر ہو گا۔ کہ ہم ہندوستان کے لوگوں کو مہذب حکومت اور آزادی دیں۔ بجائے اِس کے کہ حکومت خراب ہو اور وہ ہمارے مطیع وزیرِ عنان رہیں۔ اگر اُن کے اپنے بادشاہ اُن پر حکمران رہیں۔ مگر وہ ہمارے بنائے ہوئے کپڑے پہنیں اور ہمارے اوزار استعمال کریں تو یہ اِس سے بہتر ہو گا۔ کہ انگریز کلکٹروں اور انگریز مجسٹریٹوں کے سامنے جُھک جُھک کر کورنشات و آداب بجالائیں۔ مگر جاہل ایسے ہوں۔ کہ ہماری ساخت کی قدر نہ کر سکیں یا مفلسی کے مارے خرید نہ سکیں۔ مہذب لوگوں کے ساتھ تجارت کرنا وحشیوں پر حکومت کرنے سے بدرجہا مفید ہے۔

برنیر صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض شقی القلب لوگوں کا دستور تھا۔ کہ جب وہ رعایا میں سے کسی شخص کو لائق یا جوشیلا دیکھتے

اور اُس کے قتل کرنے کی جرأت بھی اپنے آپ میں نہ پاتے تو اُسے ہر روز افیم کی ہجوں دینا شروع کر دیتے اور چند مہینوں میں اُس کے تمام جسمانی اور دماغی قُوے کو نکما اور سست کر کے اُسے مخبوط الحواس اور مجنوں بنا دیتے۔ یہ ناپاک حرکت جو قتل سے بھی بڑھ کر خوفناک ہے۔ اُن ہی کے شایانِ تھی جو اِسکے مرتکب ہوتے تھے۔ انگریزوں کے لئے یہ کوئی نمونہ نہیں ہو سکتی۔ ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ایک اتنی بڑی قوم کو افیم دیجائے۔ اور جس عظیم گروہ انسانی کو خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ اُسکو اِس ظالمانہ غرض سے نکما اور بے حس کر دیں۔ کہ وہ ہمارے تابع فرمان ہو جائے۔

اُس اختیار کی کیا توقیر ہو سکتی ہے جو بدی۔ جہالت اور فلاکت پر مبنی ہو؟ حیف ہے اگر ہم اختیار کو اُن پاک فرائض کو توڑ کر قائم رکھ سکیں جو حکام پر واجب ہیں۔ خدا نے ہمکو ملکی آزادی اور دماغی روشنی کا غیر معمولی حصہ دیا ہے۔ اور ہندوستانیوں کو جو تین ہزار سال تک خود مختار حکومتوں کے ماتحت اور مذہبی پیشواؤں کی قید میں رہ کر پست و ذلیل ہو گئے ہیں۔ ہم پر حق حاصل ہے۔ ہماری تہذیب اور ہماری آزادی کسی کام کی نہیں ہے۔ اگر ہم نسل انسان کے کسی حصہ کو اُس آزادی اور تہذیب کا پورا پیمانہ دینے کو تیار نہوں۔ پھر میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا ہم ہندوستانیوں کو اِس لئے جاہل رکھیں کہ وہ ہمارے زیر رہیں؟ یا یہ ممکن ہے وہ علم بھی حاصل کر لیں۔ اور اُن میں ترقی کی خواہش پیدا نہو۔ یا ہم چاہتے ہیں۔ کہ انہیں ترقی کی خواہش پیدا کر کے اُس کے جائز اظہار کے لئے کوئی سامان مہیا

نہ کریں۔ کون ہے جو اِن سوالوں کے جواب میں ہاں کہہ سکے؟ ۔ میں جو کچھ کہتا ہوں بلا خوف تردید کہہ رہا ہوں۔ ہمارا فرض اِس بارہ میں ظاہر ہے۔ ہمارا راستہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اور بیشک یہی دانائی ح قومی بہبودی۔ اور قومی افتخار کا راستہ ہے ؎

ہماری ہندوستان کی سلطنت کی قسمت ہیں سوائے سخت تاریکی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بھلا اس سلطنت کے نصیب پر قیافہ بھی کیا لگایا جا سکتا ہے جس کی دُنیا کی تواریخ میں کوئی مثال ہی موجود نہیں۔ ہندوستان کے لئے تو علمِ تمدّن میں ابھی ایک نیا باب کھُلا ہے۔ جو قوانین اِس کے مدّ و جزر سے مربُوط ہیں۔ وہ ابھی ہمیں معلوم ہی نہیں ہوئے۔ ممکن ہے کہ ہمارے طریقِ عمل سے عوام کے دل و دماغ میں وُسعت پیدا ہو یہانتک کہ ہماری پابندی کی اُنہیں ضرورت ہی نہ رہے یعنی اعلےٰ طرز حکومت سے ہم اپنی رعایا کی ایسی تربیت کریں کہ اُن میں خود ہم سے بہتر حکومت کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے اور مغربی تعلیم سے مستفیض ہو کر وہ کسی آئندہ زمانہ میں مغربی قوانین و رسم و رواج کی بھی خواہش کرنے لگیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دن آنے والا ہے یا نہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ میں اُس دن کو روکنے یا دُور رکھنے میں ساعی ہوں۔ جب کبھی وہ دن آئے وہ انگریزی تاریخ میں سب سے زیادہ قابل فخر دن ہوگا ؎

ایک بہت بڑی قوم کو غلامی اور اَوہامِ باطل کے گہرے گڑھے میں

ڈوبا ہوا پانا۔ اور پھر اُن پر ایسی حکومت کرنا کہ وہ تمدن کے تمام حقوق کی خواہش کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس پر جس قدر ناز کیا جائے تھوڑا ہے۔ تاج سلطنت چھن جائے تو چھن جائے۔ غیر متوقعہ صدمات ہماری بڑی بڑی تجویزوں کو خاک میں ملا دیں تو ملا دیں۔ میدانِ جنگ میں ہمیں شکستیں ہوا کریں مگر جو فتوحات میرے مدِ نظر ہیں وہ شکست سے مبرا ہیں جس سلطنت کی میں خواہش کرتا ہوں وہ اسبابِ انحطاط سے آزاد ہے۔ یہ وہ فتوحات ہیں جو عقلِ سلیم خاموشی سے جہالت اور وحشت پر حاصل کرتی ہے۔ اور یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی سلطنت۔ ہمارے فنون ہمارے اخلاق۔ ہمارے عِلم ادب اور ہمارے قوانین کی سلطنت ہے *

رسالہ مخزن بابت جنوری ۱۹۰۲ء جلد ۲ نمبر (۴)

امریکہ کی آزادی

امریکہ کے ایک مشہور جادو بیان مسٹر ہنری پیٹرک نے امریکہ کی آزادی کے متعلق جنگ شروع ہونے کے وقت ایک پُرزور تقریر کی تھی۔ اُس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔ انسان کا اُمید کی دلفریبیوں میں محو ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ تلخ۔ سچے اور غیر مساعد واقعات کی طرف سے ہم اکثر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور اُمید کی راگنی سُنکر ایسے متوالے ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ ہماری عقل کو سلب کر کے ہمیں حیوان بنا دیتی ہے۔ مگر کیا یہ اُن مدبّروں کا شیوہ ہے۔ جو آزادی کے حاصل کرنے کے اہم اور مشکل کام میں لگے ہوں؟ ۔ کیا ہم اُن لوگوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں۔ مگر دیکھتے نہیں۔ جو کان رکھتے ہیں مگر اپنی نجات کی باتوں کو نہیں سنتے اگر مجھے پوچھئے تو میں تو حق سُننا چاہتا ہوں۔ خواہ وہ کیسا ہی صدمہ پہنچانے والا اور تلخ کیوں نہ ہو۔ میرے قدم کی راہ نمائی کے لئے تو صرف ایک ہی چراغ ہے اور وہ تجربہ ہے۔ میں آئندہ کا موازنہ صرف ماضی سے کر سکتا ہوں۔ پس گذشتہ دس سال کے عرصہ میں برطانیہ کی وزارت کے برتاؤ میں کونسی بات ہے جو اُن اُمیدوں کو پورا ہونے کا حوصلہ دلا سکتی ہے۔ جو بعض

اصحاب کے دلوں میں باقی ہیں ؟ - کیا وہ محبّا رانہ تبسّم جو ہماری درخواست پر کیا گیا ہے ؟ - جناب اس پر اعتبار نہ کیجئے گا یہ تو آپ کے لئے ایک کمند ہے دیکھئے کہیں آپکا مُنہ چُوم کر دھوکا نہ دیں - ذرا اپنے دل سے پوچھئے کہ آپ کی درخواست کی کیا آؤ بھگت ہوئی ہے - اُس کو اُن جنگی تیاریوں سے جو ہمارے قریب کے سمندروں میں ہو رہی ہیں - اور جو ہمارے ملک پر اپنا تاریک سایہ ڈال رہی ہیں - کیا مناسبت ہے - کیا صلح اور محبّت کے کاموں کے لئے جنگی بیڑوں اور فوجوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے - کیا ہم نے صلح سے اسقدر گریز ظاہر کی ہے کہ ہماری محبّت کو پھر بہ جبر حاصل کرنے کی ضرورت واقع ہوئی ہے - حضرات اپنے آپ کو دھوکا نہ دیجئے - یہ تو صاف جنگ کے سامان ہیں اور ہمارے زیر کرنے کی تیاّریاں ہیں - یہ بادشاہوں کی آخری دلیلیں ہوتی ہیں کیا آپ اِن جنگی تیاریوں کے سوائے ہمیں جبراً و قہراً مطیع کرنے کے کوئی اور معنے بتا سکتے ہیں - کیا دشمن کے اِس حصہ میں برطانیہ کا کوئی اور دشمن بھی ہے جس کے لئے یہ جہاز اور فوجیں جمع کی گئی ہیں ؟ ہرگز نہیں - یہ صرف ہمارے لئے بھیجے گئے ہیں - کہ وہ زنجیریں کہ جو برطانیہ کی وزارت اتنی دیر سے ڈھال رہی ہے ہمیں پہنائی جائیں اور ہم جکڑ دیئے جائیں -

اب ہمیں کس طرح ان کا مقابلہ کرنا ہے - کیا بحث و تکرار کی جائے ؟ - ہم اِس سال تک بحث کر چکے ہیں - اس مضمون پر کون سی نئی بات ہے جو ہم کہہ سکتے ہیں ہمنے جہاں تک ممکن تھا ہر پہلو سے اِس پر دلیلیں پیش کی ہیں - مگر بے سُود - کیا ہم عاجزانہ التجا اور منّت و سماجت پر اُتر آئیں ؟ مگر وہ الفاظ کہاں سے

آئیں گے جو پہلے استعمال نہیں کئے گئے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ آزاد ہو کا نہ کہئیں ہمنے اپنی طرف سے پُوری پوری کوشش کی ہے کہ اُس طوفان کو جو آرہا ہے لَوٹا دیں۔ ہم نے درخواست کی ہے تکرار کی ہے۔ عاجزی کی ہے۔ اپنے آپ کو تخت کے آگے گرا کر التجا کی ہے کہ مظالم اور پارلیمنٹ کے مظالم کو روکا جائے مگر ہماری درخواستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہماری شکایات کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ ہم پر مظالم زیادہ کر دئے گئے ہیں۔ ہماری عاجزیوں کی کچھ پرواہ نہیں کی گئی اور تخت کے پائیہ سے ہمیں نفرت کے ساتھ دھکیلا گیا ہے۔ اِن تمام باتوں کے بعد صُلح اور امن کی اُمیّد کرنا خیال خام ہے۔ اُمیّد کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اگر ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں اور اُن بیش قیمت حقوق کو جن کے لئے ہم اتنی دیر سے جھگڑ رہے ہیں قائم رکھنا چاہتے ہیں اگر ہم اُس قابل فخر جدّوجہد کو جس میں ہم مُدتّوں سے لگے ہوئے ہیں۔ اور جس کے لئے ہم نے حلفیں اوٹھائی ہوئی ہیں۔ کہ جب تک وہ عظیم الشان مقصود حاصل نہ کر لیں کبھی نہ بیٹھیں گے۔ ذِلّت اور کمینہ پن سے ترک کرنا پسند نہیں کرتے تو ہمکو لڑنا پڑیگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہمیں جنگ کے لئے آمادہ ہو جانا چاہیئے۔ سوائے ہتھیاروں سے کام لینے اور تمام لشکروں کے مالک کی درگاہ میں اپیل کے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔

ہماری نسبت کہا جاتا ہے کہ ہم کمزور ہیں اور ایسے خوفناک اور قوی دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔ مگر وہ وقت کب آئیگا جب ہم قوی ہونگے۔ اگلے ہفتے یا اگلے سال ؟ کیا جب ہتھیار چھِن جائیں گے۔

اور ہر گھر پر ایک انگریز محافظ مقرر ہوگا۔ کیا ہم توقّف اور تساہل سے طاقتور ہو سکتے ہیں۔ کیا سُستی سے زمین پر پڑے رہنے اور اُمیدّ کے جھلاوے پر بھروسہ کرنے سے وہ سامان مُہیّا ہو جاوینگے جن سے ہم مقابلہ کر سکیں گے۔ اُس وقت تک تو دشمن ہمارے ہاتھ اور پاؤں کو باندھ کر ہمیں نکمّا بھی کر دے گا۔

اگر ہم اُن وسائل کا جو قدرت نے ہمیں دئے ہیں مناسب استعمال کریں تو ہم کمزور نہیں ہیں۔ آج ہمارے تیس لاکھ بھائی آزادی کے مُقدّس نام کے لئے مسلّح ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارا مُلک ایسا ہے کہ خواہ دشمن کتنی بڑی فوج کیوں نہ لے آئے اِسے تسخیر نہیں کر سکتا۔ اور پھر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن لڑائیوں میں ہم تنہا نہ ہونگے۔ وہ عادل خدا جس کے ہاتھوں میں قوموں کی قسمت ہے۔ وہ ہمارے لئے بُہت سے معاون پیدا کر دے گا۔ جو ہمارے لئے لڑینگے۔ جنگ میں ہمیشہ طاقتور ہی فتح نہیں پاتا۔ بلکہ وُہ جو زیادہ بہادر اور چُست و ہوشیار رہتا ہے بازی لے جاتا ہے۔ مگر اَب ہمارے لئے اِس بات کے فیصلہ کی کوئی گُنجائش نہیں کہ جنگ کیجائے یا نہ کیجائے۔ اگر ہم اِس ذِلّت کے قبُول کرنے پر راضی بھی ہو جاتے تو اُس کا وقت بھی جا چُکا ہے۔ اب اگر پناہ لینا چاہیں تو غُلامی اور ذلیل اطاعت کے سوا اب کہیں پناہ نہیں ہمارے لئے زنجیریں تیاّر ہو چکی ہیں اور اُن کے چھَن چھَن کی آواز باسٹن کے میدانوں سے سُنائی دے رہی ہے جنگ ناگزیر ہے۔ بس اب اُس کے لئے کمرِ ہمّت چُست باندھ لو۔ اور تیاّر

ہو جاؤ۔ اب حقیقت کو چھپانا یا کم کر کے دکھانا ٹھیک نہیں۔ بعض صاحب امن امن پکارا کریں مگر اب امن کہاں۔ جنگ شروع ہو گئی۔ دوسرا ہوا کا جھونکا جو شمال سے آویگا۔ اُس میں ہتھیاروں کی چھنکار سنائی دیگی۔ ہمارے بھائی میدان میں آچکے ہیں۔ ہم یہاں کیوں بیکار پڑے ہیں۔ اب بتائیے کیا مرضی ہے۔ کیا جان ایسی پیاری اور امن ایسا عزیز ہے کہ غلامی اور زنجیروں کے بدلے خرید لئے جائیں۔ اے خدا تو ہم سے اُس دن کو باز رکھ۔ اوروں کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر مجھے یا تو آزادی دے یا موت ؞

رسالہ مخزن بابت مارچ ۱۹۰۲ء جلد ۲ نمبر ۶

اُصُولِ حکومت

مسٹر رُومتہُ الکبرےٰ کا مشہور مُدبّر اور مُقرّر جو اپنی فصاحت اور بلاغت میں آپ ہی اپنا نظیر تھا۔ اپنے بھائی کوئیٹس کو جو کسی ایشیائی صُوبہ میں حاکم تھا۔ ایک خط لکھتا ہے اور اُسے اطلاع دیتا ہے کہ اُس کی حکومت کا زمانہ ایک سال کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ اور اِس مُدّت کے لئے سلطنت کی اہم ذمّہ واری ابھی اُسی کے سر پڑیگی چنانچہ اِس ضمن میں وہ اُسے تدبیر سلطنت کے متعلق چند نصائح کرتا ہے۔ اس خط کو پڑھ کر ناظرین کو معلوم ہوگا۔ کہ یہی نصائح ہمارے کِسی حاکم کے لئے کیسی صادق آسکتی ہیں ÷

اگر تم اور ایک سال کے لئے تازہ دم ہو کر پھر ہر بات میں نیکنامی اور شہرت کے حاصل کرنے کے لئے یُوں آمادہ ہوجاؤ کہ نہ صرف دوسروں پر۔ بلکہ خود اپنے پہلے حالات پر سبقت لیجاؤ۔ اور اپنے دِل ودماغ کے تمام قُوٰے اور خیالات کو اِس طرف لگا دو کہ جو کام تم کرو اُسی میں تُمہاری تعریف ہو تو مان لو۔ کہ ایک سال کی محنت سے تم اپنی زندگی کے بُہت سے سالوں کی خوشی کو بڑہانے کے علاوہ اپنی آئندہ نسل کے لئے باعث افتخار ہوگے ÷

اِس لئے میں التجا کرتا ہُوں۔ کہ اپنی ہمّت کو پست نہ ہونے دو اور نہ اپنے کام کی اہمیت کو دیکھ کر ڈر جاؤ۔ بلکہ تمام مشکلات کا سامنا کرنے کیلئے مردانہ وار

کمرِ ہمّت چُست باندھ لو۔ اِس لئے کہ تمہارے متعلق ایسا کام نہیں ہے۔ کہ تم اتفاقیہ اس میں کامیاب ہوجاؤ گے۔ بلکہ اُس میں محنت اور تدبیر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اگر تمہارا زمانۂ حکومت ایک ایسے وقت میں بڑھایا جاتا جب تم کسی بڑے جنگ میں مصروف ہوتے تو میں ضرور کہتا کہ تمہاری باگ قسمت یا اتّفاق کے ہاتھ میں ہے۔ مگر فی الحال سلطنت جمہور کا وہ حصّہ تمہارے زیر عنان ہے۔ جس میں اتّفاق اور قسمت کو بہت ہی کم دخل ہے اور وہ زیادہ تر تمہاری نیک روی اور تمہاری طبیعت کے اعتدال پر منحصر ہے۔ اسوقت نہ ہمیں کسی دشمن کے حملہ کا اندیشہ ہے نہ کسی جنگی معرکہ آرائی کا خوف۔ نہ کسی باجگذار کی بغاوت کا کھٹکا ہے نہ تنخواہوں اور رسدرسانی کی کمی ہے۔ اور نہ فوج میں کوئی بغاوت۔ یہ حادثات ایسے ہیں کہ بعض اوقات نہایت دُور اندیش لوگوں کو بھی پیش آجاتے ہیں۔ اور جس طرح کوئی بڑا کار آزمودہ ملاّح بھی طُوفان کی شدّت کو نہیں روک سکتا۔ اِسی طرح اتّفاق یا قسمت کی دشمنی کا کوئی شخص مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تمہارے حصّہ میں پُورا پُورا امن آیا ہے مگر یہ امن بھی ایسا ہے کہ اِس میں حزم و احتیاط اور جفاکشی کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تمہیں جن امُور کی انجام دہی کرنی ہے وہ نہایت ہی اہم ہیں اور اُنہیں پرلے درجہ کی دوربینی لازم۔ لیکن جن لوگوں پر تمہیں کُلّی اختیار حاصل ہے اُنکو زیر فرمان رکھنا کونسا مشکل امر ہے۔ شرط صرف یہ ہے۔ کہ تمہیں اپنی ذات پر قابو رہے۔ کسی اور شخص کی نسبت اپنے نفس پر اختیار رکھنا زیادہ دشوار ہے مگر تمہیں تو قدرت نے طبیعت ہی ایسی دی ہے۔ کہ اگر تمہیں تعلیم بھی نہ دیجاتی

توبھی شائد اعتدال کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ چہ جائے کہ اس پر تمہیں ایسی تربیت ہوئی ہے کہ بُری سے بُری خلقت کو بھی نیکی کی طرف مائل کردیتی۔ پس اِس بات کی طرف سے مجھے پُوری طمانیت ہے۔ کہ تم اپنی ذات سے تو ہر قسم کی ناواجب خواہشات سے مُبّرا ہو۔ مگر ڈر یہ ہے کہ تمہاری حکومت میں حریص اور لالچی اہلکار یا سوداگر فریب یا ظلم سے دوسروں کو نقصان نہ پہونچائیں اور تُم اُن کا کماحقہٗ انسداد نہ کرسکو۔ اگر تم اِن باتوں کو مدِّ نظر رکھکر حکومت کروگے تو تمہاری یُونانی رعایا یہ سمجھے گی کہ تم بھی اُن کی قدیم روایات کے مُطابق ایک آسمانی دیوتا ہو اور دُنیا کی بہی خواہی کے لئے زمین پر اُترے ہو۔

میں یہ اِس لئے نہیں لکھتا کہ تم صرف اِن باتوں پر عمل ہی کرو۔ اور اگر عمل کرتے ہو تو بیش از بیش کاربند ہو جاؤ بلکہ اِن پر عمل کرکے اِن سے مسرت حاصل کرو۔ تمہارے لئے بڑے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ تم تین سال تک ایشیا میں کامل فوجی اختیارات سے حکومت کرو۔ اور اِس عرصہ میں کوئی بُت یا تصویر یا برتن یا لباس یا غُلام یا ذاتی خدمت یا نقد زر (ایک ایسے صوبے میں جہاں اِن چیزوں کی اِس قدر کثرت ہے) تمکو دیانت داری اور اعتدال کی راہ سے ایک دم کے لئے منحرف نہونے دے۔

اِس سے بڑھ کر اور کونسی بات ہوسکتی ہے۔ کہ تمہاری پرہیزگاری اور اعتدال تاریکی میں نہ دبے رہیں۔ بلکہ ایشیا کی روشنی میں روزِ روشن کیطرح چمکیں۔ تمکو خدا نے ایک ایسے صُوبے پر حکمران کیا ہے۔ جو دُنیا کے مُلکوں اور قوموں میں مشہور و معروف ہے۔

اِس بات کا بھی خیال رکھو کہ ایسا نہ ہو کہ جہاں تم جاؤ وہاں کے لوگ ہراساں ہو جائیں یا تمہارے اخراجات سے تنگ آجائیں یا تمہاری موجودگی سے اُن میں شورش پیدا ہو بلکہ جہاں جاؤ لوگ خوشی سے جامے میں نہ سمائیں اور ہر شہری یہی سمجھے کہ ہم ایک اپنے مربّی کی مہمانداری کرتے ہیں نہ ایک ظالم وجابر کی۔ ہر گھر میں یہ خیال ہو کہ ایک مہمان اُترا ہوا ہے نہ راہزن۔

اِن تمام اُمور میں غالباً تجربہ نے تمہیں بتادیا ہوگا۔ کہ صرف یہی کافی نہیں ہے۔ کہ یہ تمام صفات تمہاری ذات میں موجود ہوں۔ بلکہ تمہارا یہ فرض ہے کہ جس مُلک پر تم حکمران ہو وہاں نہ صرف تم اپنے لئے جوابدہ ہو۔ بلکہ سلطنت کے تمام افسروں۔ ماتحتوں۔ رعایا اور جمہور کے تم نگرانِ حال ہو۔ بیشک تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری نیابت میں ویسے لوگ موجود ہیں کہ نیکی اور خودداری اُن کو ہرگز کسی ذلیل یا کمینہ پن کے فعل کی اجازت نہ دیگی۔

تمہارے صُوبے میں ایسے افسر بھی ہونگے جنکو تم نے مقرر نہیں کیا۔ بلکہ جنکا عزل ونصب تمہارے اختیار سے خارج ہے۔ اوّل تو اُن کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ تمہارے مطیع رہیں اور ہر حال میں تمہارے ہم آہنگ ہوں۔ لیکن اگر انہیں کبھی کوئی بدلگامی ظاہر کرے تو تمہارا برتاؤ اِس قسم کا ہونا چاہیئے۔ کہ جہانتک وہ ایسے قواعد میں بے ضابطگی کرتا ہے جنکے تم خود پابند ہو اور صرف تمہاری ذات کے متعلق ہیں تو تمہیں تحمّل اور برداشت کرنا چاہیئے۔ لیکن جہاں وہ عوامُ النّاس کے فائدہ پر ذاتی منفعت کو ترجیح دے تو تمہارا اغماض کرنا غلط ہوگا جن لوگوں کو سلطنت نے تمہاری اعانت اور نیابت کے لئے مقرر کیا ہے

ضرور ہے کہ وُہ مُلکی اُمور کی انجام دہی میں اُن اصولوں کے پابند رہیں جنکا بیٹے اوپر ذکر کیا ہے۔

مگر وہ لوگ جنکو تُمنے خانگی طور پر اپنی مصاحبت اور ہمراہی کے لئے اِنتخاب کیا ہے۔ یا تمہارے ضروری مُلازم جو تُمہارے درباری کہلاتے ہیں۔ اُنکے تمام افعال بلکہ اقوال کے لئے بھی تُم خود جوابدہ ہوگے۔ لیکن تمہارے گرد جو لوگ ہیں وہ اِس قسم کے ہیں کہ اگر وہ راست روی سے کام کریں تو وہ تُمہارے عزیز ہو سکتے ہیں۔ اور اگر وہ تمہاری مثال کی پیروی نہ کریں تو تُم بڑی آسانی سے اُن کو درست کر سکتے ہو۔ اور اب تمہاری حکومت کے تیسرے برس میں تُمہیں وُہی دیانتداری اور سچائی کے اصُول کو قائم رکھنا چاہیئے بلکہ بہ نسبت سابق کے زیادہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا چاہیئے۔

تُمہارے کان ایسے ہونے چاہئیں۔ کہ جو کچھ وہ خود سُنیں وُہی تُم سُنو نہ یہ کہ جو کچھ کوئی اپنے لالچ اور فائدے کے لئے تُم سے کہدے اُسے ہی قبُول کر لو۔ تمہاری مُہر صرف ایک آرائش کی چیز نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ وہ تمہاری قائم مقام ہو۔ وہ کسی اور شخص کی مرضی کے تابع نہ ہو۔ بلکہ وہ خود تمہاری شاہد ہو۔ تُمہارا سارجنٹ ایسا شخص ہونا چاہیئے۔ کہ بجائے رشوت ستان ہونیکے لوگوں کا اور سلطنت کا سچّا اور وفادار مُلازم ہو۔ ہمارے بزرگ یہ عہُدہ ہمیشہ آزادی کے ساتھ اُس شخص کو دیتے تھے جو اِس کے قابل ہوتا تھا۔ اور اُس سے غلاموں کی طرح سے کام لیتے تھے۔ اُسی طرح سے تمہارے سکرٹری اور دوسرے نائب خود مختار اور جفاکار لوگ نہ ہوں بلکہ جو لوگوں کی

دل سے بہتری چاہیں اور ہمیشہ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں۔ علاوہ بریں تمہاری تمام رعایا کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہیں اپنے ماتحتوں کا پاس خاطر اُن کی حرمت اور عزت اور اُن کی سرفرازی دل سے مقصود ہے۔ اور یہہ بھی عام طور پر مشہور ہونا چاہیئے۔ کہ تم نہ صرف رشوت لینے کو بُرا جانتے ہو بلکہ رشوت دینے کو بھی ویسا ہی مکروہ سمجھتے ہو۔ اور کسی شخص کو اِس لالچ سے رشوت دینے کی جرأت نہ ہو۔ کہ تمہارا کوئی ماتحت افسر تمہارے مزاج پر قابو رکھتا ہے اور جو چاہے تم سے کرا سکتا ہے۔

میرا اِس نصیحت سے ہرگز یہ مدّعا نہیں کہ تم اپنے نائبوں سے درشتی کرو یا خواہ مخواہ اُن پر شک کیا کرو۔ بلکہ اگر اُن میں سے ایسے لوگ ہیں جو اِس دو سال کے عرصہ میں دیانتدار رہے ہیں تو کیوں اُن پر پُورا پُورا اعتماد نہ کیا جائے۔ مگر جن کی بددیانتی سے تم ایک دفعہ آگاہ ہو گئے ہو اُن پر کبھی بھروسہ نہ کرو اور خصوصاً کبھی کوئی اپنا ذاتی اختیار اُن کے سپرد نہ کرو۔

اگر تمہارے صُوبے میں کوئی ایسا شخص ہو جو اِس عرصہ میں تمہارا دوست بن گیا ہو اور اِس زمانہ سے پہلے تم اُسے نہیں جانتے تھے۔ تو اُس پر اعتماد کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لو۔ اِس لئے نہیں کہ اُن میں قابل اعتبار لوگ نہیں ہیں۔ بلکہ اِس لئے کہ تمہیں اُسکا علم نہیں اور لوگوں کے بعض عیوب سالوں تک پردے میں رہتے ہیں۔ اور اُن کی صورت شکل۔ طرز بود و باش کسی چیز سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ کہ اُن میں کوئی خاص عیب بھی موجود ہے۔ بعض لوگ تم سے از حد محبت اور اُلفت کا اظہار کرینگے۔ مگر در اصل

ذاتی لالچ پر مٹے ہونگے۔ اور شائد وہ ہر حاکم سے ایسی ہی قرابت حاصل کر لیتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے بچنا نہایت ضروری ہے اور اُن سے کبھی خلا و ملا کی نوبت نہ آنی چاہیئے اِس لئے کہ ایسے لوگ رشوت اور ناجائز ذرائع سے خوب واقف ہوتے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں ابیضِ منقوش کی خاطر کرتے ہیں۔ ہاں اگر تم نے کسی کو پرکھ لیا ہے تو بخوشی اُسے اپنے احباب کے زُمرے میں داخل کر لو۔

یُونانیوں سے بے تکلّفی کرنے میں بھی خاص احتیاط برتنی لازم ہے۔ اِسلئے کہ کئی پُشتنوں کی غلامی سے اُن میں بُہت سی بُری عادتیں آگئی ہیں اور وہ عموماً سخت خوشامدی ہیں۔ اُن کی حالت کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ اُن سے نہایت فیاّضانہ سلوک کیا جائے اور اُن کی منفعت اور رعائیت ملحوظِ خاطر رہے۔ کہ وہ اپنی پہلی سی عادتیں پھر حاصل کر لیں۔ مگر اُن سے بے تکلُّفی کبھی نہ ہو اس لئے کہ نہ صرف وُہ ہم سے حسد رکھتے ہیں۔ بلکہ آپس میں وہ ایک دُوسرے کو اچھّی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔

الغرض تم اپنے طریقِ عمل میں اِن باتوں کا خاص خیال رکھّو اوّل اپنی ذات سے دیانتدار اور میانہ رَو رہو۔ دوم وہ لوگ جو تمہارے گِرد ہیں اُن میں خودداری قائم رکھو۔ سوم کیا ایشیا کے لوگوں۔ اور کیا یونانیوں سے بے تکلُّف دوستی میں نہایت درجہ کی احتیاط کو کام میں لاؤ۔ چہارم اپنے خانگی معاملات میں انتظام اور پابندی مدِّ نظر رکھو۔ جس صُوبے پر تم حکمران ہو وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ قانون کی پابندی نہائیت لازمی امر ہے۔ اِسلئے عدالت میں ہرگز بیجا نرمی یا رعائیت کو دخل نہ دینے دو۔ بلکہ سب کو یکساں سمجھو۔ اور یکساں

سلوک کرو اور دیکھو کہ تمہارے نائب اس بات کو کبھی ہاتھ سے نہ دیں۔

مزید برآں لوگوں کے عذرات اور عرضداشتوں کو نرمی اور تحمل سے سُننا فیصلہ کرنے میں نرمی۔ اور عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش اور اُن کے دلائل پر غور کرنے کی عادت سے تم بہت جلد ہردلعزیز ہو سکتے ہو۔ رُوم میں جہاں لوگ اسقدر خودسر اور آزادی پسند ہو گئے ہیں۔ وہاں بھی نرمی کی بہت قدر ہوتی ہے۔ چہ جائے کہ ایشیا جہاں نہ تم سے بڑھ کر کوئی اعلےٰ حاکم ہے۔ نہ تمہارے فیصلوں کی کوئی اپیل ہے۔ نہ جمہوری طرزِ حکومت۔ بلکہ لوگ ہر وقت تمہاری طرف دیکھتے ہیں کہ کیا اشارہ ہو۔ اِس لئے تمہاری عدالت اور حکومت ایسی ہونی چاہئے کہ لوگوں کو یہ خواہش کبھی محسوس ہی نہ ہو کہ کوئی تم سے بڑا حاکم بھی ہو جس کے آگے وہ جا کر فریاد کریں۔ اور ایسے طریقِ عمل کے لئے ایک وسیع دِل اور روشن دماغ کی ضرورت ہے جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو اور ذاتی لیاقت سے معمور رہو۔ یہ سب صفات تم میں بدرجۂ اکمل موجود ہیں۔ مگر میں اُن کی یاددہانی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اُمید ہے کہ تم اِسے کسی اَور بات پر محمول نہ کرو گے۔

رسالۂ مخزن بابتِ ماہ مارچ ۱۹۰۳ء جلد ۴ نمبر ۶

دلِ پُر درد

اِس مہینے مخزن کو ایک ناقابل برداشت صدمہ ہمارے ایک نہائت قابل اور ہونہار مضمون نگار مولوی عبدُالرّشید صاحب چشتی بی۔اے کے بیوقت اور افسوسناک انتقال سے پہنچا ہے۔ مرحُوم کی صحت کچھ عرصہ سے بگڑی ہوئی تھی۔ اور عارضۂ اسہال قریب قریب دوامی ہوگیا تھا۔ بہتیرے عِلاج کئے گئے مگر مرض میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ اور آخر ۱۶ مارچ ۱۹۰۳ء کو اِس جہان فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ خدا انہیں غریقِ مغفرت کرے۔ اور اُن کے پسماندگان کو اور بالخصوص اُن کے والد بزرگوار مولوی حامد علی صاحب چشتی کو جو لاہور کے ایک ذی علم خاندان کے رُکنِ اعلے ہیں۔ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ یقیناً وہ سب حضرات جو عبدُالرّشید صاحب کے بیش بہا تراجم جو اُنھوں نے مکالے کی تقریروں اور بعض اَور لکچروں کے کئے تھے۔ پڑھتے رہے ہیں۔ اِس اظہارِ رنج و ہمدردی میں ہمارے شریک ہونگے۔ کیونکہ مرحُوم اُن چند ڈگری یافتہ نوجوانوں میں تھے جنکی انگریزی اور اُردو دونوں تحریریں مقبُول ہوئی ہیں اور جنہیں علُومِ ادبیّہ کا ایسا چسکا تھا۔ کہ وہ اپنی عمر اُن مشاغل میں وقف کرنیکا قصد رکھتے تھے۔ اُن کی خصوصیّتوں میں ایک قابل قدر خصوصیّت اُنکا دِلِ پُر درد تھا۔ اور ہم آج اُنکو نہیں روتے بلکہ ایک دلِ دردمند سے ایک

دلِ پُر درد کا نوحہ لکھ رہے ہیں۔ مگر ہم کیا نوحہ لکھینگے۔ مرحوم اپنا مرثیہ خود کہہ گئے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ ہمیں آجتک معلوم نہ تھا۔ کہ اُن کی طبع رسا شعر بھی موزون کرلیتی ہے۔ نہ کبھی کہیں انکا کوئی شعر شائع ہؤا۔ مگر اب اُن کے والد صاحب نے اُنکے کاغذات میں کچھ اشعار پائے ہیں جو اُن کے آخری جذباتِ دل کی تصویر ہیں۔ اور جنہیں ہم اُمید کرتے ہیں۔ ایک خاص دلچسپی سے دیکھا جائیگا۔ کیونکہ وہ دل اب اُس پہلو میں نہیں دھڑکتا۔ اور وہ زبان جس سے یہ کلام نکلا ہے۔ ہمیشہ کے لئے گویائی کی ذمہ واری سے سبکدوش ہوچکی ہے۔ اور وہ ہاتھ جنکی مدد سے یہ الفاظ صفحۂ کاغذ پر اُترے تھے ہمیشہ کے لئے آرام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید ۔۔۔ نویسندہ رانیست فردا اُمید

بس کوچ کا آگیا ہے پیغام ۔۔۔ پُر ہوچکا اپنی عُمر کا جام

دِن عُمر کا اپنی ڈھل چُکا ہے ۔۔۔ کچھ کرنے کا وقت ٹل چُکا ہے

لو کھیل ہُؤا تمام اپنا ۔۔۔ یہ آخری ہے سلام اپنا

رحلت کا ہے وقت آخرِ کار ۔۔۔ رُخصت کا ہے وقت آخرِ کار

تھا ایک طلسم کا تماشائی ہیں ۔۔۔ اور ایک جنون کا تھا سودائی ہیں

یہاں کی ہے شناخت ناشناسی گویا ۔۔۔ ہوں جتنے حواس بے حواسی گویا

حیرت کا لگا ہے ایک بازار ۔۔۔ حیراں ہیں سب یہاں خریدار

گاہک نہیں جنس سے ہیں آگاہ ۔۔۔ ہیں بیچنے والے آپ گمراہ

شاعر ہیں تو بے ٹھکانے باتیں ۔۔۔ ہیں منطقی تو عجیب گھاتیں

صوفی ہیں الگ جمائے کچھ رنگ
تسبیح کہیں اور کہیں نے وچنگ

یہ ایک غزل ہے جو ارادتاً قید قوافی سے آزاد ہو کر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے

عشق زنجیر ہے اک دل کے جکڑنے کیلئے
حسنِ گل دام ہے بلبل کے پکڑنے کیلئے

صبر سے کٹتی ہے یہاں صحنِ چمن ہو کہ قفس
تو چہکنے کو ہے بلبل نہ پھڑکنے کے لئے

خم ہے گردنِ تسلیم ہر اک کے آگے
سرو بے پھل رہا ایک اپنے اکڑنے کیلئے

حسن پر اپنے نہ کر ناز جوانِ رعنا
تیرے جوبن کا نشہ بھی ہے اترنے کیلئے

دیکھنا اطلس و کمخواب بھلا دیں نہ کہیں
جامۂ تن بھی ہے ایک روز ادھڑنے کیلئے

در و دیوار سے بغداد کے آتی ہے صداء
بستیاں بنتی ہیں دنیا میں اجڑنے کے لئے

مصر ہو ہند ہو یونان ہو روما کہ عرب
بزم جو جمتی ہے اک روز بکھرنے کیلئے

کامیابی سے مجھے کیسی خوشی ہوئے دوست
بات بنتی بھی ہے اپنی تو بگڑنے کے لئے

بند کر دفترِ فریاد کو خاموش رشید
تجھ کو قدرت نے بنایا ہے تڑپنے کیلئے

جان اور تن میں ہو گیا ہے بگاڑ
ایک سے دوسرا ہوا بیزار

مرغِ روح آشیاں سے جانے لگا
میہمان اب سراے سے جانے لگا۔

جب تک آپس میں یہ رہے دمساز
نغمۂ زیست کا تھا خوب انداز

جائے گی روح کہاں خدا جانے
گھر ہے اس کا کہاں خدا جانے

رسالہ مخزن اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء - جلد ۶ نمبر ۱

اِستقلال

گر بہ فرقِ ما نہد صد کوہِ محنت روزگار
چینِ پیشانی نہ بیند گوشۂ ابروئے ما

پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے
اور آفتاب بھی قبلِ عُروج ڈھل جائے

مگر نہ صاحبِ ہمّت کا حوصلہ ٹوٹے
کبھی نہ بھُولے سے اپنی جبین پہ بل لائے

ہزار بار ارادہ میں گو نہ نُصرت ہو
مگر نہ پائے صداقت کہیں پھسل جائے

رقیب لاکھ ہوں حاسد ہوں سینکڑوں بیشک
حسد کی آگ میں بدخواہ خود ہی جل جائے

ہمیشہ دشتِ طلب میں ہو گرم رفتاری
ہزار عیش ہو مُنہ موڑ کر نکل جائے

ہمیشہ فکر رہے دوسروں کا دامنگیر
دلِ حزیں کو نہ اِس بے کلی سے کل آئے

نہ کارِ خیر میں گاہے ہو التوا ہرگز
جو کام آج ہو کرنا وہاں نہ کل آئے

جو فتح ہو تو کبھی اُس پہ شادمان نہو
غرور و کبر سے سر میں نہ کچھ خلل آئے

مثالِ مرد ہر اک اِمتحان سے گذرے
لگے اگر کہیں ٹھوکر تو جھٹ سنبھل جائے

رہے جہان میں جب تک تو فکرِ کار رہے
اور آنکھ میچ کے سو جائے جب اجل آئے

جو مُستقل ہو ارادے میں اِسقدر لے دِل
وہ کیوں نہ باغِ جہاں سے ہمیشہ پھل پائے

زمانہ خواہ کسی بیکسی سے پھیرلے آنکھیں
مگر نہ اُس کا دلِ پُر وفا بدل جائے

رسالۂ مخزن جنوری ۱۹۰۴ء جلد ۶ نمبر ۴

کیفیّتِ حج

اِسلامیوں کا آج یہ دربارِ عام ہے
ہر ایک دل بھرا ہُؤا وحدت کا جام ہے

سب کا لباس ایک ہی اور ایک سی ہی وضع
پوچھو وطن تو چین ہے یا ہند و شام ہے

ہر اک کے دل پہ خوف الٰہی ہے چھا رہا
شاہ و گدا ہے رند ہے یا نیک نام ہے

پر خوف سے فزوں ہیں امیدوں کے ولولے
سُلطانِ دوجہان کا یہاں فیضِ عام ہے

کمزور اور قوی میں سرِ مو نہیں تمیز
دہشت سے یہاں ہر ایک بنا زرد فام ہے

دُنیا کے شاہسوار بھی تھر تھر ہیں کانپتے
رُستم ہے اپنے وقت کا یا کوئی سام ہے

بھوکا فقیر اپنی ہے عادت سے مانگتا
یہاں شاہ کی بھی ہاتھ گدائی کا جام ہے

آپس میں بیخ ہیں غرض و نہیں کلفتیں
کوسوں دلوں سے دُور یہاں انتقام ہے

زینت کا ہے خیال نہ سنگار کا ہے چاؤ
چادر کا ایک سب کو یہاں اہتمام ہے

یہاں ملّت و عقیدہ کا کچھ تفرقہ نہیں
یہ کُل گروہِ اُمّتِ خیر الانام ہے

رسالۂ مخزن بابت ماہ فروری ۱۹۰۴ء جلد ۶ نمبر ۵

کُتّا

میری قسمت میں گو لکھی ہے ذِلّت
نہیں ہے پر بُری میری جبلّت

گلے میں ہے وفا کا طوق میرے
ہے دل میں بھی وفا کا شوق میرے

مُجھے احسان ہمیشہ رہتا ہے یاد
نہیں نیکی کسی کی کرتا برباد

غلام اُس کا ہوں جو مجھ پر کرے لطف
نہ کچھ دل کش بنی ہے اپنی صورت
اگر آواز کو دیکھو تو مکروہ -
تُرش روئی میں گو ضرب المثل ہوں
نمک کھاتا ہوں جسکا بھرتا ہوں دم
وہ سوتا ہے تو میں رہتا ہوں بیدار
میں آنکھوں میں بسر کرتا ہوں راتیں
نہ مجھکو لوگ یُوں بیکار سمجھیں -
ادا کرتا ہوں جب یُوں فرضِ خدمت
مجھے خود ہاتھ سے دیتا ہے روٹی
لگایا ہے میرا ہر روز کا دُود

فدا جاں اُسپہ جو مجھ پر کرے لطف
نہ ہیں کچھ خوب اپنے خلق و سیرت
کہ سُننے والے کی کانپ اُٹھتی ہے روح
مگر خوئے وفا میں بے بدل ہوں
سرِ طاعت اُسی کے آگے ہے خم
نہ آجائے کہیں دُزدِ سیاہ کار
نہیں کچھ چور کی چل سکتیں گھاتیں
درِ مالک پہ شب بیدار سمجھیں -
تو آقا بھی میری کرتا ہے عزّت
کبھی ہڈّی کبھی دیتا ہے بوٹی
بُہت جلتے ہیں تو کر گرچہ مردُود

عبدالرشید چشتی (مرحوم)

رسالہ مخزن مارچ ۱۹۰۴ء - جلد ۶ - نمبر ۶

آرزوئے صحت

ایک دفعہ حکیم محمد اجمل خان صاحب (مرحوم) کا علاج کرنے کیلئے مرحوم عبدالرشید چشتی بی - اے دہلی جانیکو تھے تو چند اشعار جناب حکیم صاحب (مرحوم) کیخدمت میں پیش کرنیکو لکھ لئے - جن کے پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی ٭

ضُعفِ معدہ عارضہ میرا پرانا ہو گیا
جس سے اب بالکل مجھے دُشوار جینا ہو گیا
سال و ماہ و روز و شب میرے گذرتے ہیں یُونہیں
اکتسابِ علم و فن کے دن نکلتے ہیں یُونہیں
دِن بدن مایُوس ہوتے جاتے ہیں میرے عزیز
مُنھ سے گو کہتے نہیں پر دِل میں رکھتے ہیں تمیز
لائی ہے شہرت مجھے تیری مسیحائی کی یہاں
ایک عالم آج ہے اس گھر کے فن کا مدح خوان
تیرے باپ اور بھائی کے احسان سب کو یاد ہیں
تیرے حُسنِ خلق سے بھی اہلِ دوران شاد ہیں۔
فیض ہے اِس در کا جاری ایکسان صبح و مسا
شاہ سے پہلے یہاں ہی پوچھا جاتا ہے گدا
حکمتِ یونان کا باقی نام ہے گھر سے تیرے
ہند میں اس فن کا جاری کام ہے گھر سے تیرے
تھیں اُمنگیں سینکڑوں دل میں رہی جاتی ہیں سب
خوبیاں جو تھیں طبیعت میں دبی جاتی ہیں سب
ساتھ چھوڑا ہے نہیں اب تک مگر اُمید نے
رہنمائی کی ہے اِس در تک میری اُمیّد نے
گوہرِ مقصد کو آخر آج میں نے پا لیا

پا لیا میں نے شفا کو جب یہاں تک آ لیا
عبدالرشید چشتی (مرحوم)

رسالۂ مخزن بابت ماہ جنوری ۱۹۰۵ء جلد ۸ نمبر ۴

سپوت بیٹا

آتا ہے ہند سے تو اے نوجوان سپاہی
مجھکو بھی کچھ بتا جا رکھے تجھے الٰہی

اُنیتسویں کی پلٹن ہے اک ہاں بہادر
جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور

کچھ اُنکا حال کہنا اور مجھکو یہ بتانا
کیا ہیں وہ سب سلامت اور خرّم و توانا

بیٹا میرا ہے اُنمیں ۔ میرا عزیز لڑکا
جسکی ہے سب سے بڑھ کر دنیا میں مجھکو پروا

احسان کریگا ماں پہ اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دعائیں اُس کی خبر سنا کر

آتا ہوں ہند سے میں موجود جنگ میں تھا
حصہ میرا بھی اُس جا تیر و خدنگ میں تھا

اُنیتسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہوں
اُسکے سپاہیوں کی جرأت کو مانتا ہوں

افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہوں میں شناسا
ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا

لایا پیام ہوں اک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا تیرے پیغام خوش سنو بڑی ماں

رابرٹ کو میرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا
سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا

اے نیک خو سپاہی اُسکا پیام کیا تھا
کہنا اُسی کے الفاظ ۔ اُسکا کلام کیا تھا

ہائے ۔ وہ لفظ کہنا جو اُسکے منہ سے نکلے
لختِ جگر کے میرے جو اپنے منہ سے نکلے

تجھکو خبر نہیں وہ کیسا مجھے ہے پیارا
اپنی ضعیف ماں کی ہے آنکھ کا وہ تارا

فرقت میں اُسکی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دِل میرا غموں سے پامال ہو رہا ہے

ہیولاک کی لڑائیاں اُسنے لڑی ہیں ساری
دشمن پہ وار سارے اُسکے ہوئے ہیں کاری

دو بار لکھنؤ پر وہ چڑھکے خوب اَڑا ہے
تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے

کر شکر اُس خدا کا جس نے اُسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کا رہا ہے سایا

صد شکر یا الٰہی طاقت نہیں بیاں کی
تونے سُنی دعائیں اُسکی غریب ماں کی

اے دو جہاں کے مالک اے کردگار میرے
اِس رانڈ ناتواں کی سُن لی نثار تیرے

گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا
اپنے کرم کا نقشہ دل پر میرے جمایا

پر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُسکا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا

اے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا
اور ہر زباں پہ اُسکا پھیلا ہوا ہے چرچا

کرنل کی جان کو اُسنے رن میں بچا لیا تھا
سرکار میں یہ قصّہ سارا لکھا گیا تھا

اِسکے صلے میں اُسکو تمغہ عطا ہوا ہے
زائد بران وظیفہ اُسکو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اُس کی تارا ہے درخشاں

اے نیکدل سپاہی تیری زباں پہ رحمت
جس خاندان سے ہے تو اُس خاندان پہ رحمت

اے پیارے[۱] مرنیولے تو کاش آج ہوتا
اِس میرے جھونپڑے میں کیا رنگ راج ہوتا

ع۱ خاوند سے مُراد ہے جو مرچکا ہے ۱۲

دُکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں — سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پوچھنا تھا تم سے — حالت تھی اُسکی کیسی اور کیا کہا تھا تم سے

رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ و رُوپ کیا تھا
للہ مجھے بتادو تم سے جو کچھ کہا تھا۔

سُرخی سے اُسکی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے — داڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وہ نازنین شمائل — پہچان اُسکی امّاں تم کو بھی ہو گی مشکل
مرد جوان کیا ہے ہم نے تمہارا بچہ — دِل اُسکا پر وُہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھکو۔ کرتا ہے تیری باتیں — اور جانتا نہیں ہے وہ ایسی ویسی باتیں

لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے
جلدی ہی خود ملیگا وہ آکے تم کو بارے

ہیں سچ مچ آ رہا ہے سچ مچ ملیگا مجھکو؟ — کب میرا پیارا ننھا دیدار دیگا مجھکو
تمنے کہا تھا جلدی آیا وہ چاہتا ہے — جھوٹا نہیں ہیں امّاں سچ مچ وہ آچکا ہے

اُو میرے پیارے رابرٹ! امّاں تمہارے واری
اُو ماں میں تیرے قرباں حق نے سُنی ہماری

عبدالرشید چشتی (مرحوم)

خط چھوٹے بھائی عبدالحمید چشتی کے نام

لاہور۔ بازار حکیماں۔ ۸۔ جنوری ۱۹۰۲ء

برادرِ عزیزم۔ صبح آپکا کارڈ دیکھا۔ میں کل رات بھی آپکی طرف ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ میں اِس کارڈ کو دیکھ کر بُہت حیران ہوا۔ اِسلئے کہ یہاں اَب کے چندروز آپ خوش رہے ہیں جس سے میرے دل کو بُہت اِطمینان تھا۔ مگر اپنی قسمت کی خوُبی ہے۔ کہ چین کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا میں متعجب ہوں کہ اِس موسم میں کیونکر طبیعت ایسی اُداس ہو۔ سوائے اس کے کہ آپکو کسی خاص چیز کا شوق نہیں اور کیا وجہ ہو سکتی ہے میری خیال میں تو ایسے موقع کو بُہت غنیمت جاننا چاہیئے۔ اِس میں اِنسان کچھ تحصیل کر سکتا ہے۔ تنہائی میں کتاب ایک ایسا رفیق شفیق ہے۔ کہ دُنیا میں اِس سے بڑھ کر ہمدرد مرنجاں ومرنج اور مخلص دوست نہیں ہے۔ اور تو کیسا ہی پیارا دوست کیوں نہ ہو۔ کھانے کو مانگتا ہے۔ اونچی نیچی باتیں کہتا ہے۔ کبھی خفا ہوتا ہے کبھی خفا کرتا ہے۔ کسی کی باتیں پھیکی اور بد مزہ ہوتی ہیں۔ مگر کتاب دُنیا میں اچھےؐ سے اچھےؐ آدمی کو انسان کے ہاتھوں میں لا بٹھاتی ہے۔ اوہ وہ بُلبُلِ ہزار داستان کی طرح وُہ وُہ باتیں سُناتا ہے۔ جس پر خود اُسے ناز ہوتا ہے۔ خیال تو کیجئے۔ کہ کہاں ایک مجھ جیسے بیکس آدمی کا گھر اور کہاں دُنیا کے بڑے سے بڑے خوش خیال لوگ۔ کہاں ننگڑ[۱] اور کہاں سیّد احمد خاں۔ آزاد۔ شرر۔ مولوی نذیر احمد۔ شبلی

[۱] ننگڑ۔ لاہور کے ضلع میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ جہاں عبدالحمید محکمۂ نہر میں ملازم تھے۔

حالی۔ سعدی وغیرہ وغیرہ ہاتھ باندھے آپ کے پاس کھڑے ہیں۔ اور آپ جب چاہیں اُن سے اچھّی سے اچھّی باتیں سُن لیں۔ پھر اگر آپکو پنسل کے کام کا شوق ہے۔ ماشاء اللہ آپ کے خُسر آرٹسٹ ہیں۔ کسی درخت کی تصویر کسی جاٹ کی تصویر۔ کسی سبزہ زار کی تصویر بنایا کریں۔ تمام مہذّب ملکوں میں دِل کے بہلانے کا یہ ایک عمدہ طریقہ ہے۔ اور عزیزِ من اگر روپیہ ہی دُنیا میں حاصل کرنیکے قابل چیز ہے۔ تو وہ یُونہی شکوہ وشکایت سے تو نہ آیا نہ آوے۔ یہی وقت جو آپ رنج واندوہ میں صرف کرتے ہیں۔ اگر اِسکو کسی اور کام میں لگاویں تو شائد کسی وقت اِسی کے باعث کچھ روپیہ حاصل ہو جائے دُنیا محنت کی جگہ ہے۔ کوئی ہزاروں میں سے ایک ہوتا ہے جسے بغیر محنت روپیہ اور دولت مِلجاتی ہے۔ اور اُس کے لئے بھی کبھی شاذ مفید ثابت ہوتی ہے۔

آپ کے لئے موقع ہے۔ کہ کچھ طبابت کی تحصیل کریں۔ کیا خوب شغل ہے اپنی جان کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور بندگانِ خدا کو نفع ہو سکتا ہے۔

اَور نہیں خدا نے ہر اِنسان کو بُرا بھلا آواز دیا ہے۔ اِنسان کچھ گایا کرے۔ یہ بھی تو ایک مشق کی چیز ہے۔ پھر تنہائی میں انسان کئی طرح کے روحانی کمالات حاصل کر سکتا ہے۔ میں اگلے دن ایک ہندو سادھو کی تقریر سُننے گیا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ جس شخص کو روحانیّت کا چسکا لگ جاتا ہے۔ اور اپنے دل کی صفائی کی طرف توجّہ ہو جاتی ہے۔ اُسکے دِل میں اسقدر سرُور اور خوشی ہوتی ہے۔ کہ تمام دُنیادی چیزیں۔ دولت

روپیہ وغیرہ اُسے بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ اُنکی طرف سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

پس عزیزِ من آپ زیادہ دانا بنیں۔ اور زندگی کو زیادہ بہتر طریقہ سے بسر کرنا سیکھیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں سچی محبت اور ہمدردی سے کہتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ آپ اِس پر اگر عمل کرنے کی کوشش کرینگے تو ضرور کامیاب ہونگے۔ آپ کی تصویریں نہائت ہی اچھی ہیں۔ کسی کی تصویر ایسی عمدہ نہیں۔ ماشاء اللہ چشم بددور۔ ایک خاصے بانکے سپاہی مردِ میدان کی تصویر ہے۔ مگر بھائی صاحب دل مردِ میدان کا پیدا کیجئے لوگوں سے مِلا کریں۔ مُلاقاتیں بنائیں۔ گپیں ماریں۔ اور خوش رہیں گھر آنے کو کون روکتا ہے۔ صرف قبلہ و کعبہ زیادہ یہاں رہنے سے اعتراض کرتے ہیں۔ آپ رات کو ہی دوسرے تیسرے چوتھے آجایا کریں۔

آپکا بھائی عبدالرشید چشتی

میرے پیارے۔ عزیز از جان عبدالرحمٰن

یہ خط اپنی والدہ کیطرف سے اپنے بڑے بھائی کو لکھا تھا

نہایت محبت بھرے الفاظ میں آپ کا القاب و سرنامہ شروع کرکے وہ فرماتی ہیں کہ ہماری طبیعت اب بہت اُداس ہے۔ اور بقرعید کے موقع پر آپ چھٹی لینے کے لئے نہائت کوشش کریں۔ ہماری طبیعت ابھی تک بہت درست نہیں۔ لیکن انشاء اللہ ہو جائیگی بہن رحیم النساء کے

ہاں رات لڑکا پیدا ہُوا ہے۔ اور آپا صاحبہ وہاں (یعنی چوہٹہ) گئی ہوئی ہیں۔ دیکھیں واپس آنے کا کب خیال کریں۔ غالباً آپ کے آنے پر۔ سیپ کے نہایت چھوٹے چھوٹے چترے ہوئے بٹن بھیجیں۔ آپ کی امی صاحبہ بیمار ہیں۔ ماموں صاحب بھی عرصہ سے نہیں آئے۔ آپ نے اتنے عرصہ میں کبھی کوئی خاص خط ہماری طرف نہیں بھیجا۔ محمودہ بیگم اکبری اب بنگال کی مَینا کو اپنی لسّانی اور شیریں بیانی میں کچھ نہیں سمجھتی۔ اور کہتی ہے کہ بھائی صاحب بگڑ گئے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی کہاوت جو اُن کی زبان زد ہے۔ وہ یہ ہے۔ بھائی جی گولا چیّاں بھولا۔ امّاں تابی گولی۔ بھائی جی گولے۔ میں بیبا۔ امّاں تابی سرمنّی اور گُنّی مُنّی۔ ساتھ ہی اِس کے اللہُ رَبِّیْ لَا اُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا۔ کی پاک اور مُتبرک کلام سے وہ اپنی زبان کو پاک وصاف کرلیتی ہیں۔

یہاں گوہر کا ایک کبوتر نلکہ والے کوٹھے پر آبیٹھا۔ بیچارے میں اُڑنے کی طاقت نہیں۔ عبدالمجید صاحب نے اُسے پکڑ کر خوب موج کی ہے۔ اب کبوتر اُن کے گھر دیا گیا ہے۔ ہم لوگ یہاں خربوزے خوب اڑاتے ہیں۔ آپ سُنائیں کہ خربوزے۔ آم۔ فالسے۔ آڑو۔ آلوچے وغیرہ آپ کے ہاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ متبرک انجیریں بھی۔ چُھٹّی کے لئے اب سے ہی پٹّی بنائیں۔ ہمارا خیال رات دن تمھاری طرف لگا رہتا ہے۔ جہاں تک ہو یہی کوشش کرو۔ کہ اپنے شہر آجاؤ۔ تمھارے زکام اور بخار کا سُنکر ہماری طبیعت بہت فکرمند ہوئی۔ ریشمی چھوٹے دوپٹّوں کا بھاؤ آپ سے

ا؎ سکھر۔

آگے بھی پوچھا گیا ہے۔ وہ دریافت کرکے لکھو۔

آتی دفعہ (انشاء اللہ) کھانے کی کوئی چیز ساتھ نہ لاویں۔ چنّیاں ریشمی اگر ہو سکے تو دو تین لڑکیوں کے لئے لے آویں۔ میں یہ خط لکھ ہی رہا تھا۔ کہ بڑے زور کی آندھی شمال کی طرف سے اُٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی پہاڑ پھٹ گیا ہے۔ جس سے اِس قسم کا طوفان اُٹھا ہے۔ بہت اندھیرا ہو گیا۔ اور خلقِ خدا میں وحشت و خوف کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن اَلحَمدُ لِلّٰہ کہ جلد چاندنا ہو گیا۔

راقم

لاہور۔ ۹ جون سنہ ۱۸۹۲ء روز چارشنبہ خاکسار

عبدالرشید حبشی عُفی عنہُ

خط بنام مرزا اعجاز حسین

لاہور۔ ۱۶۔ اپریل سنہ ۱۸۹۵ء

شفیق دوست

السلام علیکم۔ سوائے معافی طلب کرنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ ہم لوگوں کو جسقدر فرصت ہو۔ وتنے ہی ہم سُست اور بیکار ہو جاتے ہیں امتحان سے پہلے اگر مجھے کسی دوست کی طرف خط لکھنا ہوتا تھا۔ تو شائد وقت سے کچھ پہلے لکھ لیا کرتا تھا۔ مگر اِن دنوں میں طبیعت کسی کام پر آمادہ ہی نہیں ہوتی۔ اور خصوصاً خط لکھنے پر۔ شائد یہی حال ہمارے دوست مرزا

ایوب بیگ صاحب کا ہے۔ قادیان سے آکر ایک دن ٹھہرے تھے۔ سو ملاقات ہو گئی تھی۔ مگر کبھی جھوٹ موٹ بھی ایک خط کا پرچہ نہیں بھیجا۔ ویسے امتحان سے پہلے میں نے خود دیکھا ہے۔ ساری ساری رات خط ہی لکھتے رہتے تھے۔ آپکی طرف میرے خط نہ لکھنے کی بڑی وجہ یہ ہوئی۔ کہ آپ سے عادتاً میں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں اور بہت سے خیالات جو دل میں آجکل آتے ہیں وہ بتانا چاہتا ہوں۔ اس لئے خط کا لکھنا ایک نہایت دشوار امر نظر آتا ہے۔ اب یہ خیال کرکے کہ ویسا خط تو شائد میں ہمیشگی کی فرصت میں بھی نہ لکھ سکوں۔ دو دو باتیں کرنے پر تیار ہوا ہوں۔ آپ حیران ہونگے۔ کہ ہمیشہ انگریزی میں لکھتے لکھتے آج اردو آگئی۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ مجھے انگریزی بالکل بھول گئی ہے۔ اور خصوصاً لکھنا تو بالکل ہی فراموش ہو گیا ہے۔ امتحان کے بعد سے آج تک چند سطریں بھی کسی کافر نے لکھی ہونگی۔ علاوہ ازیں چند مکروہاتِ زمانہ بھی مجھے خط لکھنے سے روکتے رہے۔ پہلے چند روز خود بھی کچھ علیل رہا۔ پھر جلاب کیا۔ پھر والدہ بیمار رہیں۔

اوّل تو یہاں کی چند ایک خبریں لیجئے۔ ایم۔اے کا نتیجہ نکل آیا ہے پروفیسر محمدؐ علی پاس ہو گئے۔ افسوس ہے کہ خواجہ صاحب رہ گئے۔ بی۔اے کا نتیجہ آج کل نکلنے والا ہے۔ اور پھر اپنی تقدیر کا فیصلہ باقی رہ جائیگا۔

میں مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ آج کل Reynolds

کا ایک ناول Empress Eugenie's Boudoir دیکھ رہا ہوں۔ نہائت دلچسپ ناول ہے۔ اور میرے خیال میں صرف بدنفس لوگ اُسکے ناولوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اِسمیں شک نہیں۔ کہ بعض نقص اُسمیں ہیں مگر اِس سے شائد کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ شخص نیکی کا دوست اور بدی کا دشمن ہے۔

میں Phrenology اور Physiognomy میں کوئی کتاب ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کوئی سب سے عمدہ کتاب اِن مضامین پر بتائیے۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو

مسٹر محمد شاہدین نے مجھے ایک دِن بُلایا تھا۔ اور مجھے ارشاد کیا تھا کہ تمام گریجوایٹس کے ناموں کی ایک فہرست بنا کر دیجاؤ۔ وہ میں دے آیا۔ الغرض اُنہیں M. A. M. A. L. L. B. کا خیال پھر آیا ہے۔ آج کل مجھے نسبتاً زیادہ فرصت مِلتی ہے۔ کہ اپنے اور دوسروں کے Conduct کا مطالعہ کروں "اپنے اور دوسروں"۔ اِس سے آپ یہ نہ سمجھیں۔ کہ مُقابلہ کرنیگا۔ نہیں بلکہ فرداً۔ پس یہ دونوں خیال مجھے اکثر تنگ کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے آنے پر اِس پر انشاءاللہ اچھی طرح سے گفتگو کر سکیں گے آپ کو یاد ہوگا۔ کہ امتحان سے قریباً ایک مہینہ پہلے کچھ تجویز کی تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اُس کا خیال ہوگا۔ اور ہماری باتیں صرف باتوں کی غرض سے نہیں کی گئیں تھیں۔ میں خدا کا نہایت شکرگذار ہُوں۔ کہ مجھے جو رفیق اِس دُنیا میں عطا ہوئے۔ اُنمیں سے اکثر selected

اور نیک نفس لوگ ہیں۔ اگر اس عطیۂ ربّانی سے میں اپنی اصلاح کر سکوں اور اگر ممکن ہو۔ اوروں پر بھی کچھ نیک اثر ڈال سکوں۔ تو میں خیال کرونگا کہ میری زندگی کا منشاء پُورا ہو گیا ہے۔ میں آپ کو ایک خوشخبری دوں کہ مُسلمانوں میں اور بھی ایسے youths ہیں جو Reincarnation کو مانتے اور اُسے اسلام کے برخلاف خیال نہیں کرتے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک محمد عمر بی۔ اے کلاس کا ہے۔ جسے آپ غالباً جانتے ہیں۔ جہانتک میں دیکھ سکا ہُوں۔ وہ نیک نفس اور ذہین آدمی معلوم ہوتا ہے۔ میں چند روز سے اُس کے ہمراہ سیر کرنے کو جایا کرتا ہوں۔

مرزا برادرز۔ جن کی نسبت آپ نے چند ریمارک کئے ہیں۔ میں بیشک پُوری تائید کرتا ہوں۔ اور درحقیقت دونوں بھائی نہایت نیک نفس اور پُرجوش نوجوان ہیں۔ اور خصوصاً مرزا یعقوب بیگ میرے خیال میں ہر ایک صفت میں یگانہ اور ideal youth ہیں۔

اُمید ہے۔ آپ نے جناب مسیح (علیہ الصّلوٰۃ) کی نسبت اپنے دِل کی تسلّی اچھّی طرح سے کر لی ہوگی۔ اور یہاں آنے پر مجھے بھی اُس سے مُستفید کرینگے۔ علاوہ ازیں بہت سے دُرِ۔ بے بہا جو آپ جمع کرتے ہونگے اُن سے ہماری chat کے لئے بہت سا ذخیرہ ہو گیا ہوگا۔

لا اسکول کی فیس میں نے ادا کر دی تھی (برائے مارچ) عبدالحمید کو میں نے آریہ سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ سپلیمنٹری نتیجہ میں ممتحن نے اُسے پاس نہیں کیا۔

آپ کا خط میں نے بیس دفعہ اِن دنوں میں شروع کیا ہوگا۔ لیکن اِس وقت خبر نہیں کِس کی برکت سے انجام تک پہنچ گیا ہے۔ غالباً اِس کی یہ وجہ ہو کہ میں ایک ایسے دوست کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ جو نہایت محنتی اور بامحبّت آدمی ہیں۔ (مسٹر عبدالعزیز) اُمیدؔ ہے آپ اور سب بخیریت تمام ہونگے

جواب جلدی

عبدُالرّشید چشتی

خط۔ باپ بدنصیب کیطرف

پشاور۔ ۸ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ وقت صبح

قبلہ وکعبہ روحی فداہ۔ کل بوقت ظہر آپکا خط کئی دن کے انتظار کے بعد مِلا۔ پرسوں ایسا اتّفاق ہؤا۔ کہ یہاں ایک شخص کے نام جو ٹھیکہ دار ہے۔ ایک تار کہیں سے آیا اور وہ مجھسے پڑھوانے کے لئے لایا۔ شام ہوچکی تھی اور کھانے کا وقت قریب تھا۔ کہ اُس نے آکر کچھ ایسا کہا کہ لوجی یہ تمہارے لئے تار آئی ہے۔ میں اُس وقت کی کیفیت کو بیان نہیں کرسکتا۔ میں بہت ہی ڈر گیا۔

یہ محمودہ اور مسعودہ بھی عجیب چیزیں کہیں سے آگئی ہیں۔ یہ زنجیر ہیں کہ دیکھنے میں اسقدر نازک۔ مگر فولاد سے زیادہ مضبوط۔ گرہ ہیں۔ کہ دِل میں میخیں گڑی ہیں۔ اگر دُنیا میں اِس قسم کی بندشیں نہ ہوتیں تو کتنے لوگ دُنیا میں رہنا پسند کرتے۔ اور پھر کتنے اسطرح سے

ہاتھ پاؤں مارتے۔ جس طرح ہر روز ہم خود مارتے اور دوسروں کو مارتے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ راز ہیں کہ انسان سے پوشیدہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کس نے اور کیوں پوشیدہ کر رکھے ہیں۔

محمودہ کے خط کا میں نے جواب لکھا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ پڑھ لینگی۔ بلاٹنگ پیپر کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک دو دھبّہ پڑ گئے۔ کاغذ بھی عمدہ نہیں ہیں دوسری دفعہ کوشش کرونگا کہ ایک عمدہ خط لکھ کر بھیجوں۔

میں آگے لکھ چکا ہوں کہ عبدالحمید صاحب اور عبدالمجید صاحب بمعہ الف شاہ پرسوں روانہ ہوگئے اور اُمید ہے کہ بخیریّت و عافیت گھر پہنچ گئے ہونگے۔

میاں احمد جی سے میں ملا تھا پھر اتّفاق نہیں ہؤا۔ آج اُن کو بھی اور میاں سید احمد صاحب دونوں کو ملنے کا ارادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں اسقدر لوگ ہیں جنکو ملنا ملانا ہوتا ہے۔ کہ وقت نکالنا بہت دشوار ہے وقت یا صُبح کا ہوتا ہے یا تیسرے پہر کا۔ اور اگر یہ وقت ملنے ملانے میں چلا جائے تو سیر کے لئے کوئی وقت نہیں اور سیر بھی میرے لئے لازمی ہے۔ باقی سارا دِن سخت گرمی ہوتی ہے۔ کل ماسٹر عبدُاللطیف سے جو یہاں بورڈ سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں ملا تھا۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عنایتُ اللہ پسر مرزا امانُ اللہ بھی یہاں شہر کے تھانہ دار ہیں۔ کل اُن سے بھی مُلاقات ہوئی آغا لعل شاہ اور اُن کے بھائی آغا بزرگ شاہ بڑے شریف آدمی ہیں اور ہر وقت میرا خیال رکھتے ہیں۔ حتیٰ الامکان اُن کی یہی کوشش رہتی ہے۔

کہ میرا جی بہلتا ہے اور مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو پہلے تو مہمان بھی زیادہ تھے۔ اب زیادہ خاطر ہے کہ میں اب اکیلا ہوں ــــــ یہاں تمام دن رات کے دس گیارہ بجے تک جھمگٹا رہتا ہے۔ کوئی تاش کھیلتے ہیں کوئی نعتیں گاتے ہیں۔ زبانی عشق احمد کے سب دیوانے ہیں۔ جسقدر لوگ یہاں آتے ہیں سب کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں۔ اور آغا کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں صبح و شام چائے پکتی ہے۔ اور آغا خود پلاتے ہیں۔ کل قریباً آدھ سیر بالائی ڈال کر چائے پکائی گئی۔ کبھی ساتھ باقرخانیاں بھی ہوتی ہیں کبھی کلچے غرض اُن کے دن عید اور رات شب برات ہیں۔ کھانا عام طور پر سادہ کھاتے ہیں۔ بس جیسا ہمارے ہاں پکتا ہے۔ خمیری روٹی اور ساتھ ایک سالن۔ دہی اکثر کھاتے ہیں اور دہی کو یہاں چکّا کہتے ہیں۔ آغا معمولی قد کے بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ خوب معقول بدن ہے۔ تونّد مزے دار ہے۔ چہرے پر کوئی ذہانت کے آثار موجود نہیں۔ اگرچہ اچھا خاصا سمجھدار آدمی ہے ــــ باتیں کرنے پر آئیں تو باتونی بھی پورے ہیں۔ گالیوں کی چاشنی بھی پوری پوری ہے۔ باتیں جلدی جلدی کرتے ہیں۔ صاف گو سیدھا سا آدمی ہے۔ آواز بلند ہے رنگت سفیدی مائل ہے۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں۔ وضع لباس معمولی شریف پشاوریوں کی۔ کھانے میں شیر ہیں۔ سارا دن چارپائی پر بیٹھے رہتے یا لیٹ چھوڑتے ہیں۔ رات کو بستر آج کل (گرمی کی وجہ سے) کم بچھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہنچی بڑا مزہ کرو ی آ ے۔ "طبیعت صاف" ــــ ۱۱ ــــ "طبیعت صاف"

اُن کی زبان پر بہت ہے"۔ اچی چائے پی لو تو بہت سی طبیعت صافی ہے"
سب سے مدارات کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ علم سے بالکل بے بہرہ ہیں
خط بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اگرچہ فارسی تو جانتے ہیں۔ یہاں کی سوسائٹی
اور آغا صاحب گویا ایک ــــــــــــــــــــ کا اور اُسکے پریزیڈنٹ
ہیں۔

یہاں سب کی طرف سے آپ کو السّلامُ علیکم پہنچے۔ گولیاں میرے پاس
موجود ہیں۔ یہاں کنوؤں کا پانی نہایت سرد ہوتا ہے۔ مگر مجھے چند ایک
لوگوں نے منع کیا ہے۔ اور میں پائپ کا پانی اب پیتا ہوں۔ پائپ کا پانی
اگرچہ ٹھنڈا نہیں نہایت لطیف ہے۔ بارش یہاں بالکل نہیں ہوئی بادل
صبح و شام آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر بارش کی بہت خبریں ہیں۔ ہوا دو تین دن
سے اچھّی ہے۔

گھر میں سب کو سلام دنیاز۔ اُمیّد ہے سب خوش و خرّم ہونگے۔ کسی
کِسی وقت میری طبیعت کچھ اداس سی ہو جاتی ہے۔ مگر ویسے مَیں خوش
ہوں۔ خط اُمیّد ہے کہ آپ ہر روز لکھا کرینگے۔ والدہ صاحبہ اور آپا صاحبہ
کو آداب۔ بھاوجہ صاحبہ کو سلام۔ بھائی صاحب نے کوئی خط نہیں لکھّا۔

ہم بلتے چوچی صاحب کیسے ہیں۔ پیٹ کا کیا حال ہے۔ خاکسار
آپ کا رشید

خط۔ بڑے بھائی عبدالرحمٰن چغتائی کے نام۔

راولپنڈی۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۰۰ء

آخِ معظم سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السّلامُ علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ واہ رے میں۔ اور واہ رے میری ہمّت کہ اتنے دن سے ایک خط تو خیر کارڈ بھی لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہر روز ارادہ کرتا ہوں اور ہر وقت دل میں رہتا ہے۔ ایں کار از من آید و مردان چنیں کنند۔ سب سے زیادہ فکر ہمشیرہ کی طبیعت کا ہے۔ اس لئے کہ آتے ہوئے ہم انہیں بیمار چھوڑ آئے تھے۔ امید ہے کہ اب صحتِ کلّی حاصل ہو گئی ہو گی۔ قبلہ و کعبہ تو شائد ہر روز خط لکھتے رہے ہیں۔ اور آپکو ہمارے کل حالات بہ تفصیل معلوم ہونگے اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مگر دل چاہتا ہے کہ ایک مختصر سا خاکہ آج کل کی زندگی کا کھینچوں۔ کیونکہ اگرچہ وُہی ہم ہیں اور وُہی باتیں مگر پھر بھی ایک نیا سلسلہ ہے۔ کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور ہو گی۔ پہلے ہم نے جو مکان لیا تھا۔ بلکہ جس میں ہم اتارے گئے تھے وہ تو بالکل کھوسٹ سا تھا۔ گو اب جس مکان میں ہم رہتے ہیں اس کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری موجودہ حالت میں اگر ہمارا اپنا گھر ایسا ہو تو عین خاطر خواہ ہو۔ صرف یہ ہے کہ اگر سب کے سب یکجا رہیں تو اس میں چند ایک کمروں کی اور ضرورت ہے۔ اس میں چار کمرے ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم ہے جو تقریباً بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ہے۔ مگر بہت ہی عمدہ کمرہ ہے

بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چار کھڑکیاں کوچہ پر۔ اُس پر چار ہی روشندان پانچ عمدہ الماریاں کھڑکیوں کے سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو صحن میں کھلتا ہے۔ دروازوں کے دونوں جانب دو کھڑکیاں ہیں۔ جن میں سے ایک اُسی صحن میں اور ایک باورچیخانہ میں کھلتی ہے۔ یعنی اندر بیٹھے ہی باورچیخانے کی حالت بھی معلوم ہو سکتی ہے اور کھانا دانا سب کچھ وُہیں سے پکڑ سکتے ہیں۔ اِس کمرہ کے ساتھ ایک دوسرا کمرہ ہے جو اُس سے چھوٹا ہے جس میں ہم سوتے ہیں اور جس میں چار چارپائیوں کی گنجائیش ہے۔ اُس میں ایک الماری ہے اور تین کھڑکیاں ہیں کوچہ پر دو مغرب رویہ اور ایک جنوب رویہ۔ اُس میں ایک دروازہ ڈرائنگ رُوم میں اور دوسرا سیڑھیوں میں کھلتا ہے۔ جس کے مقابل میں ایک دروازہ صحن میں ہے۔ یعنی مردانہ حصّہ زنانہ سے بالکل الگ ہو سکتا ہے باورچیخانہ کے ساتھ جو صحن کے شمال رویہ ہے ایک اَور کمرہ ہے۔ جسے ہمنے سٹور بنا رکھا ہے۔ اور اُس میں بھی ایک کھڑکی ایسے باورچیخانہ سے ملاتی ہے۔ چنانچہ لکڑیاں۔ آٹا۔ دال۔ گھی سب کچھ اِسی کھڑکی سے پکڑا سکتے ہیں۔ صحن میں ایک بڑا سا ثقبہ یا نَل ہے (یاد رہے کہ یہ مکان چھت کے اوپر ہے) اِن چاروں کمروں کے اوپر ایک کوٹھا ہے۔ پاخانہ کوٹھے پر بھی ہے۔ اور پہلی چھت پر بھی۔ کوٹھے کے اوپر ایک دالان ہے خوب ہوادار جو گرمیوں کے موسم میں رات کو اور سردیوں میں دوپہر کے وقت کے لئے بہت عمدہ جگہ ہے۔ یہ ہے اُس مکان کا خاکہ جس میں ہم رہتے ہیں

پنڈی میں مکانات عموماً نئے اور خوش وضع ہیں۔ بازار بہت فراخ اور کوچے بھی اکثر صاف ہیں۔ مکان عموماً ڈبل اینٹوں کے ہیں۔ بازاروں میں اچھی رونق ہے۔ اور سب طرح کے لوگ پنجابی۔ کشمیری۔ پٹھان نظر آتے ہیں ضروریاتِ زندگی عموماً لاہور سے گراں ہیں خصوصاً ولائیتی مال وغیرہ۔ پُرانی عمارت تو یہاں ایک بھی نہیں شہر میں ایک سردار سُجان سنگھ کا باغ ہے۔ جو اچھی پُرفضا جگہ ہے۔ اُس میں ایک عالیشان کوٹھی بلکہ محل بنا ہے جس میں نہایت عمدہ سامان اور عجائبات ہیں۔ ایک کلاک ٹاور ہے جو ہر پندرہ منٹ کے بعد بولتا ہے اور اِس طرح تمام شہر کو وقت سے خبردار رکھتا ہے۔

کوہ مری کے پہاڑوں کا سلسلہ چند کوس پر واقع ہے۔ پہاڑ آج کل برف سے لدے ہوئے ہیں۔ جو آجکل ہی ہمارے آنے کے بعد پڑی۔ پانچ چھ روز سے بارش نے وہ کر رکھی ہے۔ کہ الامان تین روز متواتر دن رات پہلے برستا رہا ہے۔ پھر ایک دن کے وقفہ کے بعد موجود تھا۔ چنانچہ اِسوقت بھی برابر پڑ رہا ہے۔ اِسوقت رات کے قریباً دس بجے ہیں۔ میں فرش پر بیٹھا آپ کی طرف خط لکھ رہا ہوں۔ والد ماجد میرے پاس بیٹھے حُقہ پی رہے ہیں اور آگ سینک رہے ہیں۔ مجید جان اور غلام محی الدّین اندر جا کر سو رہے ہیں۔ یہیں فرش پر غلام جیلانی ہمارا خادم جھُرمٹ مارے سو رہا ہے۔ یہ لڑکا اسلامیہ سکول میں پڑھتا ہے اور نزدیک کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ ۲۱ر جنوری۔ رات اتنا لکھا تھا کہ تھک گیا۔ اب صُبح صُبح لحاف اوپر لئے اُسی جگہ آ بیٹھا ہوں۔ اور اگرچہ سردی کی وجہ سے ہاتھ لحاف سے باہر

نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر ساتھ ہی وقت کا خیال ہے۔ ساڑھے سات کے
قریب ہیں۔ بارش تھمی ہوئی ہے۔ مگر بادل برابر آسمان پر چھائے ہیں
معلوم نہیں لاہور میں پھر مینھ برسا ہے یا نہیں۔ میں تو اکثر پانی کے بھرے
ہوئے بادل جب آسمان پر دیکھتا ہوں تو یہ شعر پڑھا کرتا ہوں۔ یہ شہیدی
ابر سیاہ سے کہہ وہ عزیز رہتے ہیں جس جگہ۔ وہیں جا برس وہیں جا برس
وہیں جا برس۔ معلوم نہیں بادل نے میرا کہا مانا بھی ہے یا نہیں۔ اگلے خط
میں میں آپ کو کچھ اپنے نئے گھر کی نسبت بتاؤنگا۔ کہ یہاں کیا کیفیت رہتی ہے
والدہ صاحبہ بی بی محمودہ۔ اور فہمیدہ میرے خط کی منتظر ہونگی۔ میں شرمندہ
ہوں اور سب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ ہاں جو بات بہت ضروری ہے
وہ یہ ہے کہ آپ میری دوائی جلد بھیجیں نہیں تو جاڑے کا ٹٹو کھڑا ہو جائیگا
بلکہ لیٹ جائیگا۔ میں جس روز سے یہاں آیا ہوں طبیعت میں نسبتاً توانائی
ہے۔ آپ کچھ لمبے اور مفصل خط نہیں لکھتے۔ کہ گھر کا کیا حال ہے۔ ہمشیرہ
ابھی خراطی محلہ سے واپس آئیں یا نہیں۔ مولوی ممتاز علی اور سعیدہ ہمیں
یاد کرتے ہیں یا نہیں۔ مسعودہ ضرور اداس ہونگی آپ اُس کا ضرور خاص
خیال رکھیں ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں پھر بیمار ہو جائے۔ اور اُس سے پوچھیں
کہ عید پر کونسی چیز اُس کے واسطے بھیجی جاوے۔ سب بچوں کو میری طرف سے
دیدہ بوسی اور پیار۔ والدہ صاحبہ اور آپا صاحبہ کو دست بستہ سلام۔ والدہ صاحبہ اگر
کسی فرصت کے وقت اپنے رشید اور مجید کی طرف خود لکھا کریں تو کیا ہی اچھا ہو خط سب کو
سُنا دیں میرا یہ کہنا بیفائدہ ہے کہ سب میرے حق میں دُعا کریں کیونکہ سب کو میرے حال پر کرم ہے

خاکسار عبد الرشید چشتی

خط بڑے بھائی عبدالرحمٰن چشتی کیطرف

راولپنڈی۔ اوّل فروری ۱۹۰۰ء پنجشنبہ

جناب اخِ معظم۔ ہمارے سکول میں عید کے لئے چار رخصتیں ہوئی ہیں۔ اسلئے کہ ہندوؤں کے تیواروں کے لئے سکول بند نہیں کیا جاتا۔ مسلمانوں کے دنوں پر اُس نقصان کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ آج پہلی رخصت ہے صبح ایک خط مینے محمد عمر کے ہاں آپ کی طرف لکھا تھا۔ جو غالباً اس کے ساتھ ہی ملیگا۔ مگر اُس میں زیادہ تر اُس کے مطلب کی باتیں ہی تھیں۔ اسوقت عید کے موقعہ نے گھر کی یاد کو دل میں گدگدایا ہے اور جی چاہتا ہے کہ سب سے روبرو ہو کر عید کی مبارکباد ہو جائے۔ کمبخت مسافری اگر درپے نہ ہوتی۔ تو ہم کہاں رہنے والے تھے۔ آج آپ کے پاس موجود ہو جاتے۔ اور کل سب کے ساتھ مِلکر سویّاں اُڑاتے اور نمازیں پڑھتے۔ مگر خیر اِس میں بھی ایک مزہ ہے اِس دُوری میں بھی ایک لطف ہے۔ اگرچہ یہ لطف اُسی قسم کا ہے۔ جیسے زخم میں کچھ میٹھی میٹھی مزیدار خارش ہؤا کرتی ہے۔ دِل پھڑکتا ہے۔ مگر یہ خیال کہ گھر والے ہماری یاد میں ہیں اور ہم گھر والوں کی۔ ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے۔ کہ دونوں جگہ صحت و عافیت ہو۔ جس سے شامِ غربت بھی ایک طرح سے صُبحِ وطن سے اچھی ہو جاتی ہے۔ آج آسمان پر پھر کچھ بادل سے چھائے ہیں۔ جنسے کچھ بے لطفی سی ہو رہی ہے۔ میں اسوقت حُقّہ مُنھ میں لگائے ایک محویّت کے عالم میں بیٹھا یہ خط

لکھ رہا ہوں اور یہ خواہش ہے کہ خدا کرے یہ خط موقعہ پر آپ کو مل جائے اور
آپ سب کو جمع کرکے اسے پڑھ دیں۔ عبد المجید ابھی گرم پانی سے نہا چکے ہیں
غلام محی الدین سب سے پہلے فارغ ہو گئے تھے۔ قبلہ وکعبہ جیلانی کے ساتھ
بازار گئے ہیں۔ صبح سویّوں کے علاوہ پلاؤ اور کوفتے بنانے کا ارادہ ہے
اس لئے کہ ہمنے اور قبلہ وکعبہ نے تو سویاں کھانی نہیں۔ تھوڑی تھوڑی
چکھ لینگے۔ آپ آپا صاحبہ سے بیشک کہہ چھوڑیں کہ لاہور آنے پر پکانے کے
فن میں اُن سے ایک مقابلہ ہوگا۔ دیکھیں کون اچھا پکاتا ہے۔ پہلے تو کئی
روز تک اُن کے لذیذ کھانے یاد آتے رہے۔ مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمنے
اب بہت ترقّی کرلی ہے اور انواع واقسام کے کھانے پکانے میں کچھ
نہ کچھ دسترس ہوتی جاتی ہے اور جب تک ہم گھر آئیں انشاءَ اللہ ہمیڈ
خانساماں بن جائینگے۔ اور آپ سب کو پکا کر کھلائینگے۔ آپ وہ چٹخارے
لینگے کہ [illegible] کی جگہ سیر کھائیں گے۔ دو تین روز ہوئے گجریلہ کا شغل
بھی ہوا تھا۔ کدوکش تو تھا نہیں کاٹ کر پکایا۔ مگر سب خوش ہوئے
الائچئیں۔ بادام۔ دودھ سب کچھ ڈالا گیا۔ معمولی سالن وغیرہ تو اور
چند دنوں میں ہاتھ کے کھیل ہو جائینگے۔ روٹی پکانے میں ہنوز روزِ
اوّل ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بکواس کرتا چلا جاؤں۔ مگر پانی گرم ہو رہا ہے
اور مَیں نے نہانا بھی ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ خط چار بجے سے پہلے
ڈاک کے صندوق میں پڑ جائے۔ حمید جان اُمید ہے کہ آج آ گئے ہونگے
بس اکثر صبح وشام اُن کو نرڈوڑ کے اُس چھوٹے سے مکان میں بیٹھے ہوئے

اور اپنا کام کرتے ہوئے تصوّر کرتا ہوں۔ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو خوب لطف تھا۔ اُمیّد ہے کہ آج گھر میں عید کی تیاریّاں ہونگی بی بی محمودہ مسعودہ اور سعیدہ تینوں کے سر گوندے گئے ہونگے۔ کناری اور موَلی ضرور ڈالی گئی ہوگی۔ اور مہندی بھگوئی گئی ہوگی۔ فہمیدہ کہے گی کہ دیکھو میرا نام ہی نہیں۔ خیر خطا معاف۔ غرض سب نے عید کی تیاریّاں کی ہونگی۔ چوڑیاں تو اُمیّد نہیں کسی نے چڑھوائیں ہوں ہمارے گھر میں ایسے اُودھم ذرا کم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے یہ باتیں اچھّی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ایک پُرانی رسمیں ہیں۔ مگر اچھّی ہیں زندگی کا نشان ہیں اور ان سے خوشی دوبالا ہوجاتی ہے۔ مولوی ممتاز علی کو تو غالبًا اُن کے نانا میلے پڑے جائیں گے۔ ورنہ مولوی عبدالحمید اُن کو اور مسعودہ کو ضرور لے جائیں۔ ٹریم کی سَیر بھی کرائیں۔ چھ ہفتہ میں غلام محی الدّین کی نسبت سب کو خیال ہوگا کہ وہ عید پر گھر سے باہر سے۔ مگر اُمیّد ہے۔ کہ یہاں بھی انشاءَ اللہ بہُت عُمدہ عید ہوگی ہم سب کی طرف سے روزِ عید مُبارک کہدیں اور والدہ صاحبہ کے پاس بیٹھ کر بیٹھ پر میری اور عبدالمجید کیطرف سے پیار لیں۔ آپا صاحبہ کو دست بستہ سلام۔

خاکسار

عبدُالرّشید چشتی

خط دوسرے چھوٹے بھائی عبدالمجید چشتی کے نام

شملہ-۲۱-اگست ۱۹۱۶ء - روز منگل-بوقت ۵ بجے شام

مولانا مولوی عبدالمجید صاحب-السّلامُ علیکم-مجھے گھر سے آئے ہوئے آج بہت سے دن گذر گئے-اور شملہ آئے ہوئے بھی آج نواں دن ہے-مگر آپ نے ایک دن اِس عاجز کو یاد نہیں فرمایا-اُمّید ہے کہ آپ اپنی رُخصتوں کو نہایت عمدہ اور مناسب طریقہ سے گذار رہے ہیں-اور میری اُس نصیحت کو کبھی نہیں بھُولتے کہ "وقت دولت ہے" میں کئی روز سے ارادہ کر رہا تھا-کہ ایک مفصّل خط لکھوں جس میں جو جو کچھ مینے دیکھا ہے اُس کی کیفیت اِس طرح سے لکھوں کہ گھر میں ہر ایک شخص سُنکر یا پڑھ کر اُس سے کچھ حظ اور فائدہ حاصل کر سکے-آج مینے اپنے دل کو اِس کام کے واسطے آمادہ کیا ہے-اور قلم ہاتھ میں پکڑا ہے-کوشش کرونگا کہ جس قدر جلد ہو سکے اِسے ختم کروں-اور جہانتک ہو سکے جو کچھ مینے دیکھا ہے اُس میں کوئی چیز ایسی نہ رہ جائے جو قابلِ ذکر ہو مگر میری یہ خواہش ہے-کہ میری محنت رائگان نہ جائے-آپ کسی فراغت کے وقت سب کو جمع کریں خصوصاً والدہ صاحبہ-بھاوجہ صاحبہ-اور ہمشیروں کو اور پھر یہ خط باوازِ بلند آہستہ آہستہ پڑھیں-آہستہ آہستہ اِس لئے کہ آپ بہت جلد پڑھتے ہیں-اور صفائی سے نہیں پڑھتے-معاف فرمائیے-اگر آپ پھر بھی کامیاب نہ ہوں تو بھاوجہ کو دیں-اور اگر اتّفاق

سے مولوی عبدالحمید صاحب گھر پر آئے ہوں تو وہی پڑھیں۔ ممکن ہے کہ مسعودہ بیگم اپنی پیاری پیاری شوخ آنکھوں سے ہنستی ہوئی اور محمودہ بیگم اپنے بھولے سے چہرے کے ساتھ اور مولوی ممتاز علی صاحب اپنے شریفانہ مولویانہ صورت لیکر آپ کے پاس آبیٹھیں اور خط کو خاموشی اور شوق سے سُنیں۔

مگر پیشتر اِس کے کہ میں شملہ کے حالات لکھوں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیوں اِس بات کا خواہشمند ہوں کہ جو کچھ مینے دیکھا ہے۔ وہ گھر والوں کو بھی بتاؤں۔ اُمید ہے۔ کہ اِس بات کو سب غور سے سُنیں گے۔ کیونکہ خط لکھنے کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ ہم نئی نئی باتیں سیکھیں۔

اِنسان کی زندگی کو اگر ایک سفرِ دریا سمجھا جائے۔ تو ہر ایک گھر اِس دریا میں ایک کِشتی ہے۔ کہ چند لوگ اُسمیں سوار ہیں۔ لہریں کِشتی کو لئے جاتی ہیں۔ کنارہ کسی کو معلوم نہیں اور نہ کِسی کو یاد ہے۔ کہ کہاں سے چلے تھے اِس طرح وقت کے دریا میں عُمر کی کِشتی بھی چلی جاتی ہے۔ ہر ایک کو حکم ہے کہ اِس میں چل پھر کر روزی کمائے۔ کبھی کبھی دریا کی تہ میں سے ایک ہاتھ نکلتا ہے۔ اور کشتی والوں میں سے جس کو چاہتا ہے پکڑ کر لیجاتا ہے اور پھر کِسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اِسی کا نام موت ہے۔ غرض یہ سِلسِلہ نئے مسافروں کے آنے۔ اور اگلوں کا وقت بے وقت چلے جانے کا قائم ہے۔ اِس کشتی میں جو لوگ ہمسفر ہوتے ہیں اُن میں عجیب لگاؤ اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو

ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن وغیرہ کہہ کر پہچانتے اور بُلاتے ہیں۔ہاں مگر یہ ضرور نہیں کہ جینے سے لیکر مرنے تک وُہ سب ایک ہی کشتی میں بیٹھے رہیں۔نہیں بلکہ سفر کی ضرورتیں اکثر مجبور کرتی ہیں۔ کہ اُن میں سے جو قابل ہوں۔ وہ دوسری کشتیوں میں بیٹھ کر دُور یا نزدیک جا کر پیٹ بھرنے کا سامان کریں یا جن کو اسباب کی زیادہ پروا نہ ہو وہ عمر کے دریا کے عجائبات کو جا کر دیکھیں کیونکہ انسان کے لئے نئی نئی چیزیں دیکھنے میں عجیب لطف ہے۔آنکھیں ہر وقت کسی عمدہ اور نئی چیز کے دیکھنے کی مشتاق رہتی ہیں۔ اِس لگاؤ اور تعلّق کا باعث ہے جسے محبّت کہتے ہیں۔ کہ جب کشتی کا ایک مسافر کسی دوسری جگہ جاتا ہے۔ جیسا میں اور بھائیصاحب گھر سے جُدا ہو کر شملہ میں آئے ہوئے ہیں۔ تو اُس کے دل میں یہ شوق ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ مینے دیکھا ہے میرے ہمراہی بھی دیکھیں۔ یہ خواہش قدرتی ہے۔گویا جسم الگ الگ ہیں۔مگر روح آپس میں پیوستہ ہیں۔

۲۴ر اگست۔ پرسوں صرف اِس قدر لکھّا تھا۔ کہ تھک کر رہ گیا۔کل تمام دن فرصت ہی نہیں ہوئی۔ صُبح کو کالی چرن مِل گیا۔ اُس کے ساتھ سیر کرتا رہا۔ پھر شیخ عبدالقادر کو ملے۔ نوّاب محمدّ حیات خاں کے ہاں گئے جنکا مکان یہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں شام ہو گئی۔ آج تین دن کے بعد بارش ہوئی۔ اِس وقت مُوسلا دھار برس رہا ہے تقریباً ایک بجا ہوگا۔ میں یہاں برآمدے میں تنہا بیٹھا آپ سب کی صورتوں کو دل کے کمرے میں جمع کر رہا ہوں اور اپنی سرگذشتِ سیر

کوہسار کہنا چاہتا ہوں۔

غالباً ۱۸ اگست کی شام کو میں لاہور سے روانہ ہوا۔ رات بھر گاڑی میں رہا۔ صبح آٹھ بجے کے بعد انبالہ پہونچے۔ راستہ میں صبح کو خوب کیفیت تھی ہر طرف پانی اور ہریاول نہائیت کثرت سے نظر آتے تھے۔ خصوصاً پٹیالہ کی ریاست جس میں سے ریل گذرتی ہے نہایت ہی شاداب ہے۔ اُدھر علے الصباح سورج پہاڑ کے دامن سے اپنی شعاعیں بادلوں کو چیر چیر کر پھینک رہا تھا۔ اور دُنیا میں اُجالا کر رہا تھا۔ انبالہ پہونچے تو میرزا اعجاز حسین اور اُن کے چھوٹے بھائی صغیر حسین موجود تھے۔ اُنکے ساتھ آئے۔ کھانا وانا کھایا۔ اُن کے بڑے بھائی جو ضلعدار ہیں۔ اور نہائیت عمدہ طبیعت کے اور خوش خلق آدمی ہیں۔ وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ غرض گپیں وغیرہ چلتی رہیں۔ دوسرے دن مرزا جی نے مسٹر عبدالعزیز مزنگ والے کو تار دیا۔ کہ تم بھی آؤ۔ دوسرے دن شام کو وہ بھی آ گئے۔ پھر ایک دن سب نے یہ ٹھہرائی کہ کالکہ کے قریب جو ایک قدیم باغ ہے وہ چلکر دیکھیں۔ ہم پانچ آدمی صبح کو ریل پر سوار ہو ڈیڑھ گھنٹے میں کالکہ آن پہنچے۔ یہاں سے شملہ کے پہاڑ شروع ہوتے ہیں اور شملہ یہاں سے ۵۸ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ریل کا سفر یہاں ختم ہوتا ہے۔ اور یہیں سے ٹانگہ پر سوار ہو کر آگے شملہ کو جاتے ہیں۔ غرض ہم کالکا پہنچے۔ راستہ میں درختوں اور نہروں اور میدان میں سبزی کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی تھی۔ بادل آسمان پر

گھر رہے تھے۔ پہاڑ آہستہ آہستہ ہمارے قریب آتے جاتے تھے۔ اور بلند
پہاڑ جو تہ سے لیکر چوٹی تک سبزی سے ڈھپے ہوئے تھے۔ آخر کار۔ ہمارے
اسقدر نزدیک آ گئے۔ کہ چند قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ غرض ہم کالکا پہنچے
وہاں مرزا جی کا ایک واقف تھا وہاں ٹھہرے۔ بینے دودھ اور ڈبل روٹی
منگوا کر کھائی۔ انہوں نے کھانا پکوایا۔ جب سب نے کھا پی لیا تو ہم نے دو
اکے کرایہ کئے اور باغ کو جو یہاں سے تین میل کے فاصلہ پر تھا روانہ ہوئے
پتھر کی سڑک تھی اور وہ بھی ناہموار۔ اکہ کی سواری میں تکلیف بہت ہوئی
مگر وہاں جا پہنچے۔ باغ کے نزدیک ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ بستی اور باغ
سب ریاست پٹیالہ کے علاقہ میں ہیں۔ باغ دیکھا واقعی قابل دید ہے۔ لاہور
کے شالامار کی نقل ہے۔ مگر اُس سے بڑا ہے۔ اِس میں سات منزلیں یا طبقے
ہیں۔ آم اور جامن اور دوسرے میووں۔ انار۔ ناشپاتی وغیرہ کے درخت
بکثرت ہیں۔ بارہ دریاں بہت عمدہ ریختہ اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ
منزلیں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ قدرتی ہیں خود نہیں بنائی گئیں۔ اِس باغ
میں ایک خوبی یہ ہے۔ کہ بالکل تنہا جگہ ہے۔ سکوت اور خاموشی ہے۔
ریاست کے چند ملازم اور باغبان وغیرہ ہیں۔ اور باغ کو اچھی حالت
میں رکھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اِسے بھی فدائی خاں کوکہ نے بنوایا تھا۔
پہاڑ کے عین دامن میں اور اِس پُر فضا ملک میں سلطنتِ مغلیہ کی
گذشتہ شان اور عظمت کی ایک عمدہ یادگار ہے۔ باغ کی سیر کرکے
(اگرچہ میں تو تکان کی وجہ سے زیادہ تر بیٹھا ہی رہا)۔ ہم کالکا واپس آئے

یہاں عبدالعزیز اور عبدالرشید مہاس جنکا سرکاری چھپر سڑک پر ہی واقع ہے۔ مل گئے۔ اُن کے پاس بیٹھے رہے۔ اور آخر میں اور مرزاجی ریل میں سوار ہو کر انبالہ چلے آئے اور مسٹر عبدالعزیز مرزاجی کے بھائی۔ اور ایک اُنکے بہنوئی وہیں ٹھہر گئے کہ یہاں اتفاق سے آئے ہوئے ہیں۔ کسولی پہاڑ جو نو دس میل کے فاصلہ پر ہے وہ دیکھ چلیں۔ وہ رات کو وہیں کالکا ٹھہرے۔ اور دوسرے دن کسولی دیکھنے گئے۔ بارش نے اُن کی خوب دُرگت بنائی۔ یہاں انبالہ آنے پر دو روز بڑے زور شور سے بارش ہوتی رہی۔ پھر میں صبح کیوقت وہاں سے روانہ ہو کر کالکا آیا اور یہاں عبدالعزیز مہاس کے پاس دو دن ٹھہرا۔ ہوا تو یہاں خوب سرد چلتی رہتی ہے۔ عین پہاڑ کا دامن ہے۔ مگر رات کو پتھروں اور کھٹملوں نے میری خوب خبر لی۔ میں اپنی طبیعت کی کیفیت لکھنی بھول گیا۔ گیا انبالہ اور گیا کالکا مجھے دست برابر آتے رہے کبھی دو کبھی تین اور زیادہ بھی۔ مگر طبیعت ایسی گری نہیں۔ اور بباعث دوستوں کی صُحبت کے دل پرچا رہا۔ دو دن کالکا ٹھہر کر (اُسی چھپر میں جہاں یہ دونوں بھائی رہتے ہیں) تیسرے دن صُبح کو چھ بجے میں ٹانگہ میں سوار ہو کر شملہ روانہ ہُوا۔ اب راستہ کی کیفیت سُنیئے۔

یہ پہلی دفعہ تھی کہ میں ٹانگہ میں سوار ہُوا۔ ٹانگہ ایک معمولی گاڑی ہوتی ہے۔ جسے دو گھوڑے کھینچتے ہیں۔ دو آدمی سامنے بیٹھتے ہیں اور دو پیچھے اور چھت ہوتی ہے۔ آگے پیچھے سے کھُلا ہوتا ہے۔ نیچے صُندوق ہوتا ہے جس میں اسباب رکھا جاتا ہے۔ کالکا صبح چھ بجے مینے بھائی صاحب کو تار دیا

کہ چھ بجے میں روانہ ہوتا ہوں۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے ٹانگہ روانہ ہوا
اور تین بجے شملہ جا پہنچا۔ ۵۸ میل کا سفر ہے۔ راستہ میں جا بجا چوکیاں اور
منزلیں بنی ہوئی ہیں۔ ہر چار میل پر گھوڑے بدل دئے جاتے ہیں گھوڑے
نہایت عمدہ اور تیز رفتار ہوتے ہیں اور ٹانگہ کو اُڑائے لئے جاتے ہیں
جہاں چڑھائی آتی ہے وہاں بیچارے ایسے ہانپتے ہیں جیسے دھونکنی۔ شملہ کی
سڑک بہت کشادہ ہے اور شروع سے اخیر تک یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف
سڑک کے غار ہے۔ دوسری طرف پہاڑ۔ پہاڑ کئی جگہ ایسا اُبھا ہوا ہے
کہ عین سر پہ ہوتا ہے۔ اور دیکھنے سے ہیبت آتی ہے۔ اگر خدانخواستہ
ایک پتھر لُڑک پڑے۔ تو ٹانگہ گھوڑے اور سواریاں پس کر چورن ہو
جائیں۔ پہاڑ جیسا مینے پہلے بیان کیا ہے شروع سے اخیر تک درختوں
اور طرح طرح کی بوٹیوں اور گھانس سے ڈھپے ہوئے ہیں۔ غار کی طرف
جنگلہ پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ ہر میل پہ پتھر لگے ہیں جن پہ لکھا ہے کہ شملہ
اتنے میل دور ہے۔ اور کالکا اتنے۔ غار کی تہ میں پانی جاری ہے جو درختوں
پرسے شور کرتا ہوا میدانوں کی طرف بھاگتا ہے۔ جہاں پہاڑ ڈھلوان ہے
وہاں دامن میں جا بجا آبادی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بنے ہیں
پہاڑ پر آبادی عجیب وضع کی ہوتی ہے۔ دو گھر یہاں اور دو وہاں۔
وہیں پہاڑ پہ جا بجا زراعت نظر آتی ہے۔ خصوصاً مکئی ہمارے ملک میں
ابھی مکئی کو بھٹا نہیں لگا۔ مگر مینے راستے میں پہاڑ پر بہت کھیتوں میں
بھٹے دیکھے۔ بعض جگہ پہ دور سے ایسا نظر آتا ہے۔ کہ باقاعدہ بڑی

سیڑھیاں بنی ہیں اور یہ بہت بلندی تک چلی جاتی ہیں۔ یہ سیڑھیاں
دس دس بیس بیس گز چوڑی ہیں۔ اِن سب میں زراعت ہوئی ہوئی ہے
دُور سے اِن کا نظارہ نہایت عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پہاڑ
میں میوہ دار درخت بھی ہیں میں نے انار کے بہت درخت دیکھے۔ ناشپاتی
بکثرت ہوتی ہے۔ اور بہت سے درخت ہیں جن کے پتے اور شکل بالکل
آم اور جامن کے درخت سے ہیں۔ میں سمجھا یہاں آم ہوتے ہونگے۔ مگر
معلوم ہوا کہ وہ اَور درخت ہیں۔ مگر درختوں میں جس کی سب سے زیادہ
کثرت ہے وہ ایک درخت ہوتا ہے۔ جسے چیل کہتے ہیں۔ ایک شخص انہیں
دیار یا دیودار بتاتا تھا۔ یہ بالکل سیدھے اور بہت بلند ہوتے ہیں۔ انکی
شاخیں جابجا چاروں طرف چھتریوں کی طرح سے پھیلی ہوئی ہیں میں نے
اِس کی ایک تصویر بنائی ہے جو بھیجتا ہوں۔ اِن کا ایک قسم کا میوہ ہوتا ہے
جس کی شکل ایسی ہوتی ہے۔ جیسے انگریزی گوبھی کے اندر سے نکلتا ہے
اور پتھر کی طرح سے سخت ہوتا ہے۔ یہ درخت بیشمار ہیں۔ لکڑی کا باہر کا
چھلکا سیاہ ہوتا ہے۔ اور پچاس ساٹھ ساٹھ گز بلند سیدھے چلے جاتے ہیں
راستہ میں پہاڑی گاؤں کے نزدیک جابجا پہاڑی عورتیں سروں پر گھڑے
اُٹھائے چلی جاتی ہیں۔ یہ قدرتی چشموں اور آبشاروں سے پانی لاتی ہیں
جابجا پہاڑ پر سے آبشاریں یعنی پانی کی چھوٹی چھوٹی ندئیں شور کرتی
ہوئی بہہ رہی ہیں اور عجیب سماں دکھاتی ہیں۔ بعض جگہ پر بالکل وہی
کیفیت ہے جیسے شالامار میں ساون بھادوں کی کہ پانی کی ایک چادر پہاڑ

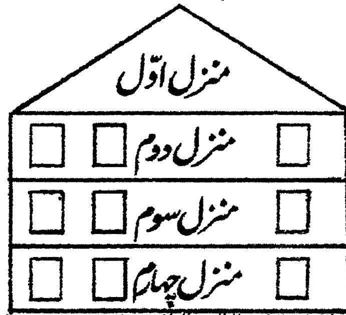
پر سے گر رہی ہے۔ جو آواز اُس کے گرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس سے
بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ زور سے مینہہ پڑ رہا ہے۔ کالکا سے شملہ تک راستہ
میں دو بڑے پڑاؤ ہیں۔ ایک سپاٹو کا دوسرا سولن۔ سپاٹو ایک بلند پہاڑ ہے
جس پر انگریزی فوج رہتی ہے۔ اور ایسے موقعہ پر ہے کہ ہر چار طرف بیسوں
کوس تک نظر پڑتی ہے۔ اِس سے مُراد یہ ہے کہ ارد گرد کے پہاڑی مُلک میں
انگریزی طاقت اور رُعب قائم رہے۔ اور شاہی سڑک جہاں سے وائسرائے
اور گورنر اور بڑے بڑے انگریز گذرتے ہیں اُس کی حفاظت رہے۔ دوسرا
پڑاؤ سولن ہے۔ یہاں بھی انگریزی فوج رہتی ہے اور ڈاک بنگلہ بنا ہے
ایک بازار بھی ہے اور ایک چھوٹی سی عمدہ جگہ ہے۔ یہاں میں نے فراغت کی اور
ڈبل روٹی جس کے میٹھے ٹوسٹ عبدالرشید نے مجھے ساتھ دے دیئے تھے وہ
کھائے۔ یہاں پر تانگہ آدھ گھنٹہ ٹھہرتا ہے۔ تاکہ مسافر کھانا وانا کھالیں
سڑک کی کیفیت دیکھنے پر منحصر ہے۔ کبھی چڑھاؤ کبھی اُتار۔ چکر کھاتی ہوئی
جاتی ہے۔ پانچ میل جا کر سڑک واپس جاتی ہے۔ اور جہاں سے چلے تھے
وہیں آجاتے ہیں۔ بیچ میں صرف ایک غار ہے۔ دو شخص آپس میں غار کے
آر پار باتیں کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں فاصلہ سڑک کا آٹھ نو میل کا
ہے۔ مگر یہ بات سمجھانے سے سمجھ میں آنی مشکل ہے۔ جہاں پہاڑ بہت بلند
ہو جاتا ہے۔ وہاں سے اِدھر اُدھر جہاں تک نظر جاتی ہے۔ اونچے نیچے پہاڑ
سبزی سے ڈھپے ہوئے نظر آتے ہیں کسی پر دھوپ ہے کسی پر چھاؤں کہیں
پہاڑوں کے درمیان غاروں کے اندر آبادیاں نظر آتی ہیں اور گائے بھینس

خاموشی سے چرتے چگتے نظر آتے ہیں۔ کہیں باغ بھی ہیں۔ کہیں کہیں انگریزوں کے بنگلے بنے ہیں۔ راستہ میں ہمنے یارقندی لوگوں کو پہاڑ کاٹتے اور اُس کے اندر وردیاں ڈالتے دیکھا۔ جو ریل کی سڑک کے لئے راستہ بنا رہے ہیں۔ مجھے پہلے اکثر یہ خیال آیا کرتا تھا کہ پہاڑ کی سڑک بعض جگہوں پر ایسی تنگ اور ایسی بلند ہوتی ہوگی۔ کہ جانیوالوں کو سخت خوف لگتا ہوگا مگر یہ سڑک جو شملہ سے کالکا تک گئی ہے ایسی صاف عُمدہ ہے۔ جیسے ہمارے شہر کی عمدہ سڑکیں۔ شملہ سے ہم ابھی چھ سات میل کے فاصلہ پر تھے کہ ٹانگہ چلانے والے نے کہا کہ وہ ہے سامنے شملہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدھ میل پر ہے۔ مگر حقیقت میں وُہی سڑک کا چکّر جس کا میں بیان کر آیا ہُوں یہاں بھی تھا۔ غرض تین بجے کے قریب بندہ درگاہ شملہ کے ٹانگہ سٹیشن پر پہنچے یہاں بھائیصاحب بمعہ اپنے آدمی شرفہ کے موجود تھے اور دیر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ کہنا کہ مجھے وہ دیکھکر خوش ہوئے۔ بیفائدہ ہے خُدا نے عجیب تعلّق پیدا کیا ہے۔ اور مَیں خاص کر اِس بات میں خوش قسمت ہوں کہ خُدا نے مجھے ایسے شفیق اور دردمند بھائی دئے ہیں۔ اُنکا چہرہ مجھے دیکھکر خوشی سے تمتماتا تھا۔ مینے خدا کا شکر کیا۔ کہ اگرچہ میں بلحاظ اپنی صحت کے ایسا نکمّا اور بدقسمت ہوں۔ میری زندگی میں میرے ہمراہی اور ہمسفر ایسے نازبردار اور میرے حال پر رحم کرنے والے ہیں۔ ابتک تو یہی ہے اور میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ تا انجامِ سفر اِس دردمندی اور شفقت میں کوئی فرق نہ آئیگا۔ بھائی صاحب نے ٹانگے والے کو آٹھ آنے بطورِ انعام کے

دئے اور مجھے گھر پر لائے۔ یہ مکان قبلہ وکعبہ دیکھ گئے ہیں۔ اور غالباً اُنہوں نے
اس کی کیفیت بیان کی ہوگی۔ اس میں ایک بڑی بھاری قباحت یہ تھی۔ کہ
کمرے کے باہر جو برآمدہ ہے وہ بہت نیچا اور سلامی۔ یعنی صرف ایک چھ سات
برس کا بچّہ سیدھا کھڑا ہو سکتا یا چل سکتا ہے اور پاخانہ بھی اسی برآمدے کے
ایک کونے میں ہے۔ غرض یہاں جب آؤ یا جاؤ کھڑے ہو کر آنا یا جانا پڑتا ہے
میرا سر بھی دو چار دفعہ یہاں ٹکرایا۔ اور قبلہ وکعبہ نے بھی دو تین دفعہ بہت
چوٹ کھائی۔ آخر اُنہوں نے اس مکان کے چھوڑنے کی شدّت سے تاکید کی
یعنی حسب معمول مکان بدلنے پر بہت زور نہ دیا تھا — پہلے سے اس کی
تجویز ہو رہی تھی۔ آخر ہمنے قریب کے ایک مکان میں دو کمرے آٹھ روپے ماہوار
پر لے لئے ہیں۔ یہ مکان نہایت عمدہ اور آسائش والا ہے۔ اور اگر یہاں
فرش وغیرہ موجود ہو تو خاصا صاحب بہادروں کے رہنے کے لائق ہے۔
اور ایک کُنبہ آسانی سے رہ سکتا ہے۔ دو بڑے بڑے کمرے ہیں آگے برآمدہ
اچھا کھُلا ہے۔ ایک چھوٹا سا باورچیخانہ اور ایک پاخانہ ہے۔ یہ مکان ایک
غار کے سرے پر واقع ہے۔ ہمارے نیچے بھی مکان ہیں اور اُس سے نیچے
بھی مکان ہیں۔ پھر اُس سے اوپر ایک بازار ہے۔ اُس کے اُوپر ایک اور
سڑک ہے اور اسی طرح سے سڑک کے اوپر سڑک چلی جاتی ہے۔ اور تقریباً دس
سڑکیں اسی طرح ایک دوسرے کے اوپر واقع ہیں۔ سب سے اوپر کی سڑکوں میں
انگریزی سوداگروں کی کوٹھیاں اور دفتر اور بینک اور ہوٹل ہیں۔ نیچے
کے بازار سے اگر اوپر جانا ہو تو ایک طرف ایک ڈھلوان چڑھائی ہے اور پر

آئیے تو اسی طرح ایک اور چڑھائی ہے جو اوپر کے بازار میں پہنچا دیتی ہے تیسری سڑک پر مارکیٹ بنی ہے۔ جہاں گوشت ترکاری۔ مرغی۔ انڈا وغیرہ بکتے ہیں اسی کے قریب ایک منڈی غلہ کی ہے۔ پہاڑ پر اسی طرح سڑکیں کھود کھود کر شہر آباد کیا ہے۔ یہاں میدان بہت کم نظر آتا ہے۔ صرف ایک جگہ ہے جسکے نزدیک بھائی صاحب کا بینک ہے۔ جہاں کچھ وسیع میدان ہے۔ بازار اچھے پُر رونق ہیں۔ سب چیزوں کی دوکانیں نظر آتی ہیں۔ اور سب طرح کے لوگ بازاروں میں پھرتے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ وائسرائے کے دفتر نہایت عالیشان بنے ہیں۔ لاہور میں ایسی عمارتیں انگریزی دفتروں وغیرہ کی کہیں بھی نہیں۔ اِنمیں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ وہاں سب مکان اور دفتر فرش زمین پر ہیں اور ایک منزل کے ہیں۔ شملہ میں عموماً دفاتر چار چار یا پانچ پانچ منزلوں کے ہیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں میدان کم ہے۔ دو تین دفتر تو اتنے بڑے ہیں کہ اُن میں بلا مبالغہ پان پانسو کمرہ ہوگا۔ انگریزی دوکانیں نہایت سجی ہوئی ہیں اور انگریزی مرد اور عورت خوب بن ٹھن کر نکلتے ہیں۔ مگر یہاں گاڑی رکھنے کی سوائے وائسرائے پنجاب کے لاٹ اور جنگی لاٹ کے اور کسی کو اجازت نہیں۔ صرف گھوڑے پر چڑھ سکتے ہیں۔ مگر انگریز عورتیں عموماً رکشا پر چڑھتی ہیں۔ رکشا چھوٹی چھوٹی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ جن میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے اور تین یا چار یا پانچ آدمی اسے کھینچتے ہیں دو آگے اور ایک یا دو یا تین پیچھے۔ امیر اور بڑے بڑے افسروں کے پیچھے تین آدمی ہوتے ہیں کہ جلو اور شان زیادہ ہو۔ اِن گاڑی کھینچنے والوں کی

وردی عموماً ایک جیسی ہوتی ہے اور سڑکوں پر ہر وقت مرد اور عورتوں کی
گاڑیاں کثرت سے دوڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کی عمدہ سڑکیں درحقیقت
بہشت کا نمونہ ہیں۔ ایک جانب عمدہ نفیس مکان بنے ہیں۔ دوسری طرف
پہاڑ ہے۔ جو قدرتی سبزی اور پھولوں اور سایہ دار درختوں سے ڈھپا ہوا
ہے۔ ہوا سرد ہے۔ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے۔ اور دھوپ کا نام
ونشان نہیں۔ جتنے دن سے میں آیا ہوں صرف ایک دن دھوپ رہی
اور اُس میں بھی بادل آتے رہے ہیں۔ ورنہ دوسرے تیسرے گھنٹہ آدھ
گھنٹہ کے بعد دھوپ نکل آتی ہے۔ ورنہ تمام دن ابر رہتا ہے۔ یہاں کے
کُل مکانات اوپر ڈھپے ہوئے ہیں اور جسے کوٹھا کہتے ہیں اُس کا نام ونشان
بھی نہیں۔ ہر ایک مکان کے آگے سلامی دار چھت ہے اور اُس پر ٹین ہے
یہ اِس لئے کہ مینہ کا پانی آسانی سے بہ جائے۔ چنانچہ مینہ کی شدّت سے یہاں
کبھی مکان نہیں گرتے۔ حالانکہ مکان بہت ہلکے پھلکے بنے ہیں۔ پھر نیچے
چونکہ ڈھلوان ہے۔ پانی سیدھا غار میں بہ جاتا ہے۔ اور اِس سے مکان



کی بُنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اوّل تو بُنیاد ہے ہی پہاڑ کی۔
جو نقشہ مینے شملہ کا کھینچا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ سب کی وہ سمجھ
میں آئے یا نہیں۔ شائد آپ اِسے اِس طرح خوب سمجھ جائیں کہ شہر کے نیچے
یعنی پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر اگر ہم شہر کی طرف دیکھیں تو ہم کو سب
بازار ایک دوسرے کے اوپر نظر آتے ہیں اور کُل مکان پیش نظر ہیں چنانچہ
اندھیری رات کو اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر اس نظّارہ کو دیکھیں تو ایک عجیب
کیفیت نظر آتی ہے۔ ہزاروں دیئے پہاڑ پر جلتے نظر آتے ہیں۔ گویا ایک بڑے قلعہ
یا پہاڑ پر چراغان ہو رہی ہے۔ یہ نظّارہ نہایت ہی دلفریب ہے۔ اور چونکہ
سوائے چراغ کی روشنی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ بالکل ایسا دکھائی
دیتا ہے۔ جیسا ستاروں بھرا آسمان ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ یا ہزاروں قندیلیں
کسی بڑی دیوار کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ یہ سماں مینے کل ہی اچھی طرح
دیکھا ہے۔ کیونکہ رات ہم آٹھ بجے میں بھائی صاحب اور منشی حبیب اللہ
خراطی محلہ والا ہم خوب دیر تک سڑکوں پر سیر کرتے رہے اور یہ کیفیت
پہلے شہر کے ایک طرف سے اور پھر دوسری طرف سے دیکھتے رہے۔ مگر
اس سے یہ نہ سمجھئے کہ شہر چھوٹا سا ہے۔ بہت دوُر دوُر تک پھیلا ہوا ہے
خصوصاً انگریزوں کی آبادی جس غار کے سرے پر ہم رہتے ہیں۔ اُس ہی
دوُر دوُر تک مکان نظر آتے ہیں اور رات کو چراغوں کی روشنی لُطف
دیتی ہے۔ ایک پہاڑ آبشار ہمارے مکان کے نزدیک ہر وقت رات دن
بہتا رہتا ہے۔ اور شاں شاں کی آواز کان میں پڑتی رہتی ہے ہمارے

ارد گرد کئی قسم کے لوگ آباد ہیں - بوچڑ۔ قصائی۔ کشمیری۔ لداخی۔ بنگالی
ہندوستانی خانسامے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ساتھ کے دو کمروں میں دو
عیسائی رہتے ہیں۔ اُن کی ایک چھوٹی سی لڑکی ہے مسعودہ کی عمر کی۔ وُہ
مدرسے جاتی ہے۔ صُبح وشام وُہ برآمدے میں کھیلتی رہتی ہے۔ اوپر ہمارے
بنگالی عیسائی رہتے ہیں۔ اُن کے دو تین چھوٹے چھوٹے کالے کالے بچّے
بھی آکر اُس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ کبھی جھُولا ڈال کر جھُولتے ہیں۔ اگر مولوی
ممتاز علی صاحب۔ اور مسعودہ اصغری ہمارے ساتھ ہوتے تو ان بچّوں سے
خوب کھیلتے۔ منشی حبیبُ اللہ کا مکان بھی ہمارے نزدیک ہے اور وہ اکثر
صبح وشام آتا ہے۔ بہُت ہی غریب المزاج۔ خوش دل اور عمدہ آدمی ہے
اور یہاں اُس کا نزدیک ہونا باعثِ اطمینان اور آرام ہے۔ مجھے ایسا
بے تکلّف غریب آدمی بہُت پسند ہے۔ باتیں بھی خوب مزے کی کرتا
ہے۔ کبھی کبھی تاش کی بازی بھی ہوتی ہے۔ اب یہاں کے موسم کا حال
سُنئے۔ کہ دن میں بعض اوقات کئی کئی دفعہ بارش ہوتی ہے۔ ہر وقت آسمان
پر بادل جمے رہتے ہیں۔ کبھی مُوسلا دھار برستا ہے۔ اور متواتر دن رات
جاری رہتا ہے۔ کبھی زور سے ایک دو گھنٹے برس جاتا ہے۔ یہاں لوگ بارش
میں باہر اندر جانے سے ایسا نہیں ڈرتے جیسے دیس میں (یہاں پہاڑ کے
علاوہ میدانی مُلک کو دیس کہتے ہیں) ہر ایک شخص کے ہاتھ چھاتا ہے۔ سقا
مشک کے علاوہ ایک چھاتا اور ایک لکڑی (سونٹا) ضرور ہاتھ میں رکھتا ہے
سونٹا چڑھائی چڑھنے اور چھاتا بارش کے لئے۔ جا بجا سڑک ڈھلوان ہے

مگر چڑھائی بہت مشکل ہے۔ میں تو ہوں ہی کم زور۔ سب لوگ چڑھائی سے کسی قدر ڈرتے ہیں۔ البتہ پہاڑی لوگوں کو کچھ ایسا معلوم نہیں ہوتا جہاں ہم رہتے ہیں وہاں سے بازار جانے تک چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ اور کم از کم ساٹھ ستر سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ ویسے ہمارے مکان میں کوئی سیڑھیاں نہیں۔ اگرچہ ہمارے نیچے ایک منزل موجود ہے۔ میں بارش اور موسم کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ بادل جو ہر وقت پرا جمائے رہتے ہیں آتے کہاں سے ہیں۔ پہاڑ کی غاروں کی تہ میں سے ایک سفید دھواں اٹھتا ہے جو تمام ہوا کو بھر دیتا ہے۔ اسقدر غبار ہو جاتا ہے کہ چند گز پر آدمی کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا اور دور کی چیزیں تو بالکل نظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ غبار مکان میں گھس آتا ہے اور تمام سڑکوں پر پھیل جاتا ہے۔ یہی جمع ہو کر بادل بنجاتا ہے اور پھر برستا ہے۔ ابھی ہوا صاف ہے اور دور دور کے پہاڑ اور درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک پل میں کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑی دیر میں پھر صاف ہو جاتا ہے۔ غرض یہی سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اور اس وقت جب میں یہ خط لکھ رہا ہوں ایک بڑا غبار میرے سامنے سے اٹھ رہا ہے۔ اور شائید ابھی یہ ہمارے مکان تک آجائیگا۔ ہمارے مکان سے ایک وسیع نظارہ نظر آتا ہے۔ جب دھوپ پڑتی ہے تو دور دور کی سبزی زمرد کی طرح سے چمکتی ہے۔ پہاڑ میں چشمے جو نظر آتے ہیں ایسے چمکتے ہیں کہ گویا نگینے جڑے ہیں۔ دور دور کی کوہستانی سڑکیں بھی سانپ کی طرح پیچ کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ابھی ذرا سی دھوپ بھی نکل آئی

اب تقریباً ساڑھے تین بجے ہونگے۔ بھائیصاحب باہر برآمدے میں بچوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس یہاں ایک دیوانی عورت رہتی ہے۔ جو کسی بڑے امیر کی جورو تھی۔ مگر اب دیوانی ہو کر گھر سے نکل آئی ہے۔ یہ عورت اسقدر بکواس کرتی ہے۔ کہ کچھ حد نہیں۔ مگر اس کی بکواس ہوتی ہے مزہ دار۔ ہم برآمدی میں کھڑے ہو کر اس کی تقریریں سنتے رہتے ہیں۔ بہت عمدہ اردو بولتی ہے (ہے کشمیرن) اور ایسے ہاتھ بناتی ہے اور آنکھیں پھاڑتی اور نقلیں کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی بڑی لکچرار کسی وسیع مضمون پر لیکچر دے رہی ہے ایک پتھر پر آبیٹھتی ہے اور شروع کر دیتی ہے۔ جس مضمون کو لیتی ہے اسی پر چلی جاتی ہے۔ اور خواہ زور سے بارش ہونے لگے وہیں بیٹھی رہتی ہے۔

ایک اور افسوسناک واقعہ آپ کو سناؤں کہ ہمارے پڑوس میں ایک لذاخی نے جو ہمارے مکان کے مالک کا لڑکا ہے اپنی جورو کو نہائیت بیرحمی سے مار ڈالا۔ یہ لڑکی تقریباً پندرہ سولہ برس کی تھی۔ ہر روز یہ شقی چرس پی کر گھر آتا اور اسے سخت مارتا۔ اکثر اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ مارتا۔ دن کو تمام دن اسے کمرے میں بند کر جاتا اور اسے بھوکا رکھتا۔ آخر اسے اگلے دن مار دیا۔ یہ کمبخت ایسا یزید پلید ہے کہ اس نے آگے دو بھائیوں کو مار ڈالا اور سنا ہے کہ ماں کو مارا۔ اس کے باپ نے اور تمام رشتہ داروں نے اسکے خلاف گواہی دی ہے۔

آج کل یہاں کا بڑا میوہ ناشپاتی ہے جو سستی بھی بہت ہے۔ کھیرا دو پیسہ کا ایک۔ ترکاریاں سب ہیں۔ مگر اکثر دو آنے ڈیڑھ آنے یا تین آنے

سیر۔ گوشت یہاں پانچ آنے یا چھ آنے سیر۔ ایک انڈا ایک آنے ڈیڑھ آنے
کا۔ چند ترکاریاں یہاں ایسی بھی ہیں جو لاہور میں نہیں ہوتیں مثلاً یہاں
ایک ترکاری ایسی ہوتی ہے۔ جیسے ککڑی اور گز بھر لمبی ہوتی ہے۔ اسے
یہاں ٹینڈے بولتے ہیں۔ گاجر۔ مولی۔ شلغم۔ مٹر۔ پالک۔ گوبھی (انگریزی)
آلو۔ بینگن سرخ اور سیاہ۔ ہری مرچ۔ پودینہ۔ ہرا دھنیا۔ اروی۔ کریلے
اور کئی اور ترکاریاں سب یہاں ملتی ہیں۔ یہاں کے حلوائی حلوے میں بیسن
ڈالتے ہیں۔ مگر دوسرا بھی ہوتا ہے۔ کشمیری کلچے کا رواج بہت عام ہے۔
پانی ہر وقت سرد و یخ۔ کنوأں میں نے تو کوئی دیکھا نہیں۔ اور نہ غالباً کوئی ہے
پانی بہت گاڑھا اور وزن دار۔ اور بعض اوقات اس میں سے دودھ سا
نکلتا ہے۔ ۲۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ء

جب میں اخیر خط لکھ رہا تھا تو کاغذ ختم ہو گئے تھے۔ پھر دو تین روز
فرصت ہی نہیں ہوئی۔ مرزا اعجاز حسین پرسوں اور کل یہاں رہے۔ کل
شام اُن کی دعوت کی۔ شیخ عبدالقادر بھی کروڑ سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کی
دعوت پچھلے اتوار اس لئے ملتوی کر دی گئی کہ شرفا ہمارا آدمی بیمار ہو گیا تھا
خیر اچھا ہوا کہ اعجاز کے آنے پر دونوں کو اکٹھا بلا لیا گیا۔ علاوہ ازیں
حاکم علی پرنسپل اسلامیہ کالج اور ایک اور لاہوری دوست ملک تاج الدین
کو بلایا گیا۔ حبیب اللہ اور اُس کے دونوں لڑکے بھی شامل تھے۔ کھانے
والے اُن کے ہاں ہی پکوائے۔

غرض نہایت عمدہ اور مکلّف دعوت ہو گئی۔ ہمارے پڑوس میں ایک

منشی دہلی کے رہنے والے (عبدالکریم نامی) رہتے ہیں اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے برتن وغیرہ دستگردان دیئے ــــــــــ
مگر خیر مہمان خوش گئے۔

ہمارے ہاں کئی دن سے ایک شخص مسمی کرم الدین جو نمک میانی ضلع شاہ پور کا رہنے والا ہے۔ بطور مہمان رہتا ہے۔ یہ شخص وہاں کا خوجہ ہے اور تجارت پیشہ ہے۔ یہاں کابل کے پُرانے ٹکٹ بیچنے کی خاطر آیا ہُوا ہے اِس سے پہلے اُس نے تین چار ہزار روپے کے ٹکٹ مَیس صاحب کے پاس بیچے ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ پوٹھوہار جوتے بھی لایا تھا۔ جس میں سے تقریباً چالیس روپے کے اُس نے یہاں دوکانداروں کے پاس فروخت کر دئے ہیں۔ ٹکٹ بھی کوئی ڈھائی سو روپے کے بیچ چکا ہے۔ یہ لوگ بُہت سیانے اور تجارت کے کاروبار سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ کئی سال یہ بمبئی رہا ہے اور آڑھت وغیرہ کا کام کرتا رہا ہے۔ یعنی سوداگروں کو وہاں سے مال بھجواتا وغیرہ رہا۔ بمبئی اور لاہور کے نرخ بُہت سی چیزوں میں زمین وآسمان کا فرق رکھتے ہیں۔ اِس کے پاس تھوڑی الائچئیں تھیں جو اُس نے اٹھارہ آنے فی پاؤ کے نرخ سے منگوائی ہیں۔ حالانکہ وَیسی الائچئیں بلکہ اُس سے خراب گوبند کی دوکان سے ڈھائی روپیہ پاؤ ہم خریدتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اِس زمانے میں صرف تجارت ہی ایک ذریعہ ہے۔ جس سے اِنسان ترقّی کر سکتا ہے۔ اور ہم مُسلمان اور خصوصاً ہم اِس سے ایسے ناآشنا ہیں کہ نہایت ہی قابلِ افسوس ہے۔ کاش پہلے سے ہمارے بزرگوں کو

یہ خیال ہوتا۔ مگر گذشتہ پر افسوس کرنا بیفائدہ ہے۔ میرے خیال میں
وقت اب ہی آیا ہے۔ کہ ہم اِس طرف توجّہ کریں۔ کاش میری صحت ایسی
ہوجائے۔ کہ تمام قوّت صرف کرکے کوئی کام استقلال سے کرسکوں۔ اور
ہمارے پاس کچھ سرمایہ بھی ہو تو مجھے اُمیّد ہے کہ ہم چند سال میں مالا
مال ہوجائیں اور ہمیں فارغ البالی حاصل ہوجائے۔

ہاں اتفاقاً مجھے یاد آگیا۔ ــــــــ

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں کچھ انعام دونگا۔ کیونکہ اُس کے میں لائق
نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے خوش ہونے کی بھی پروا کرتی ہیں
میں چونکہ یہاں بیکار ہوں۔ اور کسی قدر صحت بھی اچھّی ہوتی جاتی ہے
اکثر مختلف باتیں دل میں سوچتا رہتا ہوں۔ اور جو خیال مجھے اکثر آتا ہے
وہ ہمشیروں ـــــ کی تعلیم ہے۔ اگر اُن میں سے ایک بھی ایسی تعلیم حاصل
کرے جیسی میرے دل کی خواہش ہے تو میں اپنے آپ کو اور اپنے کنبہ کو
خوش قسمت سمجھوں گا۔ محمودہ بیگم اکبری نے مجھے ایک خط بھی نہیں بھیجا۔
جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُسے میرا ذرا خیال نہیں اور میرا گھر رہنا یا گھر سے
باہر رہنا اُس کے لئے مساوی ہے۔ یا شائد یہ خیال ہوگا۔ کہ ایسے نکمے
نکھٹو بھائی کو خط لکھنے سے فائدہ۔ غالباً ابھی اُن کا سکول بند ہوگا اور
گھر پر وہ اپنے وقت کو خوب اچھّی طرح سے گذارتی ہونگی ـــــ
ـــ اُمیّد ہے کہ میرا یہ خط سُنکر وہ اور مولوی عبدالمجید ایک مفصّل خط
لکھیں گے اور گھر کے تمام حالات کی ایک عمدہ تصویر کھینچکر بھیجیں گے۔

کل سے قبلہ وکعبہ کا خط پڑھ کر میرے دل کو ایک لمحہ کے لئے چین نہیں ہے اور دل کی جو کیفیت ہو رہی ہے میں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ اُنکے پاؤں کی چوٹ اور راستہ کی تکلیف اور تنہائی۔ خدا جانے کیسے وقت گھر سے نکلے تھے۔ مگر تقدیر سے چارہ نہیں۔ اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کل کیا ہونیوالا ہے۔ ہر حال میں راضی برضا رہنا ہی اچھا ہے۔ پھر عبدالحمید کی طبیعت کی سُستی اور علالت سے دل کو نہائیت فکر ہے۔ خدا کی قدرت نزدیک کبھی اتنا فکر نہیں ہوتا جس قدر دُوری میں ہوتا ہے۔ اے کاش ہم سب کے سب ہر سال گرمی کا موسم پہاڑ پر گذار سکیں۔ یہاں بالکل معلُوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ اگست اور ستمبر کا مہینہ ہے۔ اگست کا مہینہ نسبتاً یہاں ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر جو کیفیت لاہور میں ہوتی ہے وہ تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں نہیں دیکھی۔ موسم جیسا کھُلا ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہے مگر ایسا ہے۔ جیسا معمُولی موسم سرما ہوتا ہے۔ صرف سردی خوب چمکی ہوئی نہیں واقعی لاہور کے مقابلہ میں شملہ بہشت ہے۔

مینے عبدالحمید کے لئے اور سب کے لئے چند ہدایات جو اِس وقت میرے خیال میں آئیں لکھی تھیں۔ مگر ایک بات میں بھُول گیا۔ عبدالحمید دو گرین کی کونین کی گولیاں بنوالیں اور صبح کے وقت ضرور استعمال کیا کریں۔ گھر میں صفائی کا بُہت خیال رکھیں۔ اور بچوں کو کوئی ثقیل یا خراب چیز نہ کھانے دیں۔ میرے خیال میں کوئی میوہ کسی قسم کا ہو کھانے نہ دیں اور ترکاری بھی ایسی استعمال کریں جو چٹ پٹی ہو۔

بارشیں اب یہاں بھی کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگرچہ تھوڑی بہت روز ہی
ہورہتی ہے۔ زور سے بارش چار پانچ روز سے نہیں ہوئی۔ دھوپ
بھی اب پہلے کی نسبت زیادہ نکلتی ہے۔ یہاں ایک بڑا لطف یہ ہے کہ
کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو کیچڑ بالکل نہیں ہوتا۔ کیونکہ سب جگہیں ڈھلوان
ہیں اور کُل پانی بہ کر نیچے غاروں میں چلا جاتا ہے۔ بازار بیں موریں
(نالئیں) سب لکڑی کی بنی ہیں جن کے اندر ٹین لگا ہے۔ پانی گولی کی
طرح سے بہتا چلا جاتا ہے۔

اتوار کے روز ہمنے خوب لمبی سیر کی۔ بھائی حبیبُ اللہ ساتھ تھے۔
جس پہاڑ کی ایک طرف شہر شملہ بنا ہؤا ہے۔ اُسے جاکو کہتے ہیں۔ اِس کے
چاروں طرف ایک سڑک بنی ہے۔ ایک طرف سے چلتے ہیں۔ اور شہر کی
دوسری طرف آنکلتے ہیں۔ خوب عمدہ سڑک ہے۔ اِسے جاکو راؤنڈ (Jakko
Round) یعنی جاکو کا چکر کہتے ہیں۔ اور تقریباً چھ سات میل ہے۔ یہاں
سے خوب پہاڑ اور غاروں کی سیر ہوتی ہے۔ اِس کے راستہ میں ایک
آبادی ہے جو شملہ سے تقریباً ڈیڑھ میل ہے اِسے سنجاولی کہتے ہیں۔ یہ
اِس طرح ہے جیسا لاہور کے پاس مزنگ ہے۔ یہاں ایک ٹنل (Tunnel)
بنا ہے۔ یعنی پہاڑ کو نیچے سے کاٹ کر اُس کے اندر ایک راستہ سا بنا یا
ہؤا ہے۔ بہت بڑا ٹنل ہے اور وہاں سے گذرنے میں خوف لگتا ہے
یہ ٹنل مشوبرے کو جاتا ہے۔ جو یہاں سے سات آٹھ میل پر ہے۔ اور
ایک عمدہ پُر فضا جگہ ہے۔ وائسرائے بھی اکثر ہر ہفتہ وہاں جاتا ہے۔

لارڈ الگن جو اس سے پہلے وائسرائے تھا۔ وہ اکثر یہاں جایا کرتا تھا۔ آپا صاحبہ نے پنڈی کے راستہ میں ایک دو چھوٹے چھوٹے ٹنل دیکھے ہونگے۔ یہاں ریل پہاڑ کے اندر سے گذرتی ہے۔ بلکہ محمودہ نے بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھائی حبیب اللہ بھی نوکری سے تنگ آیا ہوا ہے۔ یہاں انگریز سے بھی کچھ اَن بَن ہے اُس نے بیچارے کی تخفیف کر رکھی ہے۔ چاہتا ہے۔ کہ یہاں سے چھوڑ کر لاہور میں کوئی دوکان کھول لے پہلے کچھ تھوڑی بہت تجارت کرتا رہا ہے۔ مگر بہت کم۔ دو تین مکان گروی لئے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں روپیہ اُس کا پھنسا ہوا ہے۔ اور فائدہ کچھ بھی نہیں اُس کا چھوٹا لڑکا عظیم اللہ کل صبح روانہ ہوکر پرسوں لاہور پہنچے گا۔ وہ چند لکڑیں (ہاتھ کی) اور کچھ اور چیزیں ہماری لے چلا ہے۔ وہاں سے منگوا لیں۔

عبدالمجید ضرور لکھیں۔ کہ بھاوجہ صاحبہ کا اب کیا حال ہے۔ بھائی صاحب کو بھی اکثر تشویش رہتی ہے۔ وہ اپنی صحت کا بہت سا خیال رکھیں۔ ۔ ۔ آپ کی بھاوجہ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہے یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ (یعنی مولوی عبدالمجید) ضرور اُسکا لکھنا پڑھنا دیکھا کریں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔۔۔۔ کا اب کیا حال ہے۔ میری طرف سے ۔۔۔۔ کو سلام محمد الدّین۔ غلام محی الدّین وغیرہ نے کبھی خط نہیں لکھا۔ اُمیّد ہے کہ سب با ضی خوشی ہونگے۔

میں اب بہت اچھا ہوں۔ پہلے چند روز میں ایک انگریزی دوا کی پُڑیاں استعمال کرتا رہا ہوں۔ جو نوّاب محمدؐ حیات خان کے لڑکے کو ڈاکٹر دیتا رہا ہے۔ پھر ایک پینے کی دوا شروع کی ہوئی ہے۔ دو تین دفعہ چکر

بھی لگا آتا ہوں۔ گھر پر کچھ پڑھ بھی لیتا ہوں۔ کھاتا پیتا بھی ہوں۔ تاش بھی کبھی کبھی کھیلتا ہوں۔ اور آپ سب لوگوں کو یاد کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ سب خوش و خرّم ہوں۔ اور جب میں واپس آؤں تو سب کو تندرست و توانا پاؤں۔ والدہ صاحبہ یقین رکھیں کہ انشاءاللہ وہ اپنے رشید کو بہت اچھا پائیں گی۔ وہ چند سطریں اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجیں۔ اور اپنی صحت کا بہت خیال رکھیں۔

قبلہ و کعبہ کے پاؤں میں جب تک ذرا بھی درد یا سوجن باقی ہو دوائی لگاتے جائیں۔ اور حرکت کم کریں اور گرم رکھیں۔ آگے سردی کا موسم آتا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو درد بیٹھ جائے۔

قبلہ و کعبہ کا کارڈ ابھی آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ عبدالحمید کی طبیعت اب اچھی ہے۔ اَلحَمدُ لِلّٰہ۔ میری طرف سے وہ آئیں تو نہایت زور سے گلے ملیں اور کہیں کہ میری طرف اکثر خط لکھیں۔ اور خدا کے لئے خوش رہا کریں اور اکڑ کر چلا کریں۔

آپ سب کا رشید

از شملہ

خط بنام عبدالحمید چشتی برادرِ خورد

شملہ - ۱۶ - ستمبر - ۱۹۰۸ء

برادر عزیزم مولوی عبدالحمید صاحب - السّلام علیکم - کل پرسوں سے یہاں موسم میں ایک نمایاں تبدیلی ہے - بارش کا موسم ہو چکا - مطلع صاف ہے - اور دھوپ نکلتی ہے - مگر یہ دھوپ دل پر ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا کرتی ہے - اور بالکل وہی سماں ہے - جو عین سرما کے موسم میں بارش کے بعد دھوپ نکلنے پر ہوا کرتا ہے - آپ شاید اس بات کو اچھی طرح سے جانچ نہ سکیں - اس وقت تنہائی میں دل پہ ایک اداسی سی چھا جاتی ہے - اور دُور سے جو کچھ بیچنے والوں کی آواز بھی آتی ہے - اس میں بھی کچھ تبدیلی ہوتی ہے - اور دھوپ کی وقت سایہ ایک خاص قسم کا ہوتا ہے - غرض وہ تمام باتیں اس میں موجود ہیں - اب دس بج چکے ہیں - اور میں یہاں مکان پر اکیلا بیٹھا ہوں - ہاں دل میں آپ سب کی یاد ہمراہ ہے - منشی حبیب اللہ ابھی آئے تھے - تھوڑی دیر بیٹھ کر دفتر چلے گئے - اس سے پہلے ایک میراسی سارنگی والا آیا تھا - اور بھائی صاحب اُسے میری تفریح کے لئے چھوڑ گئے تھے اور وہ کچھ دیر غزلیں وغیرہ سُناتا رہا - کل اتوار تھی صبح تقریباً دس بجے ہم مکان سے روانہ ہوئے - اور وائسریگل لاج کی طرف گئے - وہاں بھائی صاحب نے کسی انگریز کو ملنا تھا - اُس کا مکان بہت دِقت سے ملا - آخر

ہم بہت ہی تھک گئے۔ چڑھائی بہت جلد سب کو تھکا دیتی ہے۔ ڈیڑھ بجے
واپس آئے۔ مگر سخت کوفتہ ہو کر سیدھے جامع مسجد کو گئے۔ وہاں شیخ عبدالقادر
کا لکچر سنا۔ لکچر کے لئے تیاری کچھ ایسی نہ تھی۔ مگر خیر جو کچھ کہہ گئے خوب کہہ
گئے۔ مضمون یہ تھا "لاہور کی تاریخ کا ایک ورق" انجمن حمایت اسلام کے
کارناموں کا ذکر کرتے رہے۔ اور اُن اوہام اور اعتراضات کو لوگوں کے دلوں سے
دُور کرتے رہے۔ جو بعض لوگ یہاں پیدا کرتے رہے ہیں۔ کچھ چندہ بھی ہو گیا۔
جلسہ تو نمازِ عصر کے بعد تک رہا۔ مگر ہم چلے آئے۔ مولوی حاکم علی کی تقریر سُن
نہیں سکے۔ میں اُن سرہندوالے بزرگوں کو ابھی ملا نہیں۔ اگر وہاں میرا
بندوبست ہو گیا۔ تو خیر اُن کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ ورنہ یہاں کوئی انتظام
کر کے چند روز بعد تک میں ٹھہروں گا۔ اسوقت کچھ سردی محسوس ہو رہی
ہے۔ اور میں کپڑے پہن کر معمولی آوارہ گردی کو جاؤنگا۔ آپ نے اپنے سیرِ دریا
کی کیفیت خوب لکھی ہے۔ بس مجھ کو ہر روز ایسی باتیں لکھ چھوڑا کریں
قبلہ و کعبہ کے پاؤں کو بالکل آرام ہو جانا چاہیئے۔ کوئی ذرا سا نقص بھی باقی
رہنا ٹھیک نہیں ...... اِس کا تدارک استقلال کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ آپ
والدہ صاحبہ کی توجہ ضرور دلائیں۔ کہ وہ برابر دوائی یا مالش وغیرہ کا خیال
رکھیں۔

سُنا ہے کہ ہیضہ میں اب تخفیف ہے۔ مگر بخار صاحب لاہور میں تشریف
لے آئے ہیں۔ خدا اپنی امان میں رکھے۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے۔ مینہ نہیں برستا۔ تو قحط سے خلقِ خدا

مرتی ہے۔ مینہہ برستے ہیں تو ہیضہ صاحب تشریف لے آتے ہیں۔ پھر اُنکی جگہ بُخار آجاتا ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی مُصیبت حضرت انسان کے سر پر سوار رہتی ہے۔ کہیں مُفلسی ستاتی ہے۔ کہیں بیماری۔ کسی جگہ بد مزاجی اور بدکرداری دُوسروں کی زندگی کو تلخ اور اپنی بربادی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ جوانی کا لُطف آنے لگتا ہے تو دُنیا کے دھندے پیچھے آ لگتے ہیں۔ طلب معاش میں کشمکش کر کے کُچھ سہُولت کا سامان پیدا ہو بھی گیا۔ تو بُڑھاپا اپنی مُہیب صُورت دکھاتا ہے۔ مگر باوُجود اِن ساری باتوں کے کچھ طلسم ہے۔ کہ ہم سب اِس دارُ المحن میں رہنے کے ایسے شائق ہیں۔ اور ہر گھڑی اِس سے اُلفت ایسی بڑھتی جاتی ہے۔ کہ یہاں سے روانگی کی بات بُری معلوم ہوتی ہے۔

خیر۔ ایں چُنیں رفتست از روزِ ازل تقدیرِ ما۔ یہاں مجال دم زدنی نہیں ہے سرِہند کی نوکری سے کبھی تو دل چُراتا ہے۔ اِس لئے کہ اوّل تو بدن میں اِس قدر توانائی نہیں جیسی ہونی چاہیئے۔ دوئم گھر سے دُوری۔ دِل چڑی کا سا ہے۔ آگے ہی کُچھ اُداسی سی چھا رہی ہے۔ کبھی یہ جی چاہتا ہے۔ کہ نہیں کُچھ کرنا چاہیئے۔ اور خانہ داری کے بوجھ میں جہاں تک ہو سکے کچھ کندھا لگانا چاہیئے۔ اِس طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنا بے غیرتی ہے۔ اور گھر کی ضروریات بے شمار ہیں۔ بہرحال دیدہ باید۔ اُمیّد ہے کہ آپ جس طرح بھاوجہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ دوائی بھی دی ہوگی۔ اور وہ باقاعدہ طور پر استعمال کرتی ہونگی۔ والدہ صاحبہ کو خود خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ جب تک یہ شکائیت رفع نہ ہو جائے۔ دوائی کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔ ایسی باتوں

میں غفلت ٹھیک نہیں۔ آپ دوائی وغیرہ لا دینے کا خیال رکھیں۔ مگر پرہیز ضروری ہے۔

آپ خط ہر روز یا دوسرے تیسرے تو ضرور لکھا کریں۔ میں اس بات سے واقعی بہت خوش ہوں کہ آپ کی چھوٹی بھاوجہ کسی قدر انسانیت سے رہتی ہیں۔ اگر یہ بات واقعی ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔ اور اگر خدا کو منظور ہوا۔ تو وہ صبر کا اجر اچھا دیگا۔ اُسے کچھ پڑھنے لکھنے کا شغل ضرور رکھنا چاہیئے۔ اور قرآن اور نماز کی آپ گھر میں سب کو تاکید کیا کریں۔ مگر ایک بات یہ ہے۔ کہ جو کام نرمی اور مہربانی سے نکل سکتا ہے۔ وہ درشتی سے کبھی ممکن نہیں۔

انسان کی زندگی میں کس قدر چیزیں ایسی ہیں جو ہماری مرضی کے خلاف ہیں۔ بعض اوقات اپنی زندگی ناگوار ہوتی ہے۔ مگر شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ کہہ کر اسے انجام تک گھسیٹنا پڑتا ہے۔ اسی طرح گھر میں خواہ بھاوجہ ہو۔ اور خواہ ہمشیرہ یا پھوپھی یا کوئی یا مجھے سا نکما بھائی سب کو خدا کی داد سمجھ کر بُردباری اور دلی مہربانی کے ساتھ سلوک رکھنا چاہیئے۔

محمودہ بیگم نے کوئی خط پھر نہیں لکھا۔

محمودہ بیگم میری طرف سے مسعودہ۔ ممتاز۔ سعیدہ اور مسعود کا مُنہ چُومیں۔

آپ کا بھائی

عبدالرّشید چشتی

خط چھوٹے بھائی عبدالحمید چشتی کے نام

لاہور - ۲۳ - دسمبر ۱۹۰۰ء

جانم حمید جان - آج یہاں تھوڑی بارش ہو رہی ہے - اور سردی خوب ہے - اُس کام کے سُلجھانے کی کوشش ہو رہی ہے - دُعا کیجئے قبلہ و کعبہ کل ــــ سے ملے تھے - وہ بہت اطمینان دلاتے تھے - خود اُنکی اُس شخص کے ساتھ زیادہ مُلاقات نہیں -

دِل قوی رکھئے اور دُعا کرتے جائیے - مردوں کو ہی سب باتیں پیش آتی ہیں - اور جب اِنسان پر کوئی مُصیبت آبنے - تو پھر اُس کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے - ہم دُنیا سے الگ نہیں ہیں - اپنی طرف سے حتی الامکان ہر امر میں سعی کرنی ہے - اور وہ کی جا رہی ہے - آپ اپنے کام میں دل کو مصرُوف رکھیں - اِس سے خیال بٹا رہے گا - ایسا بھی نہ ہو کہ اِسی فکر میں کام میں غلطیاں ہو جائیں - اور پیچھے کِسی قِسم کی تکلیف ہو - اِنسان حالات کا پابند ہے - اور وُہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں - اور انسان کو جیسا چاہتے ہیں - یا جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں - اور ایک کھلونے کی طرح جہاں چاہتے ہیں پھینک دیتے ہیں - اِنسان دُنیا کے مُعاملات میں کبھی خود شکار ہوتا ہے - اور کبھی تماشا بین - تماشا بین کا یہ کام نہیں ہے کہ جو کھیل اُس کے سامنے ہو رہا ہے - اُس میں دل لگانے اور کبھی بے فائدہ خوش ہو بیٹھے - اور کبھی رونے لگے - بلکہ چُپ چاپ اُسے دیکھا کرے اور

سمجھے کہ اس کھیل کا بدلنا یا اس کھیل کا بنانا میرے اختیار سے باہر ہے۔ بلکہ
پُتلیوں کے تماشہ کی طرح پُتلیوں کی تاریں تو کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔ وُہ
جس طرح چاہتا اُن کو ہلاتا اور اُن کو نچواتا ہے۔ آپ نے اگر اس بات پر غور کیا۔ تو
یقین جانیئے کہ یہ وہ نُسخہ ہے جس سے کُل درد دُور ہو جاتے ہیں اور اگر دُور نہیں
ہوتے تو اُن کی تیزی اور چُبھن جاتی رہتی ہے۔ یہ وہ تریاق ہے کہ کوئی زہر
اُسکا مُقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہی وہ بات ہے جسکے حاصل ہونے سے لوگ ولی
اور قطب بن جاتے ہیں اور دُنیا کی بادشاہت اور فقیری اُن کی نظروں
میں یکساں ہو جاتی ہے۔ میری مُراد اِس سے یہ نہیں کہ انسان قسیُ
القلب ہو جائے۔ نہیں دیکھے کہ اس کھیل میں میرا کیا حصہ ہے۔ اور اُسے حسن
طریقہ سے پُورا کرے مگر دل میں یہی خیال رہے کہ ہے یہ کھیل اور اِسکا مطلب اور
منشاء ہماری سمجھ سے خارج۔ بڑی بڑی سلطنتیں۔ بڑے بڑے کارخانے
اور خاندان رونبتے اور بگڑتے ہیں۔ زمانہ کے حوادث اُنکو اس طرح سے اُڑاتے
ہیں جیسے آندھی جنگل میں خاک کو یا سُوکھے درختوں کے پتّوں کو۔ بُہت بے
گُناہ دار پر چڑھائے گئے۔ بُہت بےکس زندہ جلا دئے گئے۔ غرض حوادث کے
آگے کسی چیز کی حقیقت نہیں اور ہم کون ہیں کہ حوادث کی زد سے ضرور محفوظ ہی رہیں
میں یہ لکھ ہی رہا تھا۔ کہ آپکا خط مِل گیا۔ میں نے مُجملاً جواب بھی لکھدیا ہے
خدا کرے کل تک کوئی معقول بندوبست ہو جائے تو میں آپکو مُفصّل کیفیت لکھوں
یا خود آؤں ہم سب اِس دُنیا میں ایک نئی زندگی پائینگے۔ اگر یہ آفت بخیر انجام پا جائے۔
مگر بات وُہی ہے جو میں نے آپکو لکھی ہے۔ سب دُعا کہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ آپکا بھائی عبدالرشید

خط چھوٹے بھائی عبدالحمید حشتی کے نام

اعظم آباد۔ ۱۴۔ نومبر ۱۹۱۰ء

مولوی عبدالحمید صاحب۔ میں کوئی خط بھی خاص گھر نہیں لکھ سکا۔
موچی دروازے ایک بھیجا تھا۔ گھر سے بھی کوئی خط نہیں آیا۔ اُمید ہے کہ سب خیریت ہوگی۔ خدا جانے وہ وقت کب آئیگا جب ہمیں وقت کی قدر ہوگی۔
کبھی اگر انسان دس منٹ کے لئے اس بات پر غور کرے۔ کہ ہماری زندگی کیا ہے عُمر کا وقت کسقدر تھوڑا۔ دِل کی خواہشیں اور اُمنگیں کتنی ہیں۔ فرائض کس قدر وابستہ ہیں تو اُس کی زندگی گھڑی سے زیادہ باقاعدہ ہو جائے۔ میری یہ مراد نہیں ہے کہ انسان صرف زحمت یا محنت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس تھوڑے سے وقت سے اور اپنے حالات سے جہاں تک ممکن ہوسکے ہم خوشی حاصل کریں۔ اور انسان کا جسم۔ اُس کے قوے خود کہہ رہے ہیں کہ خوشی کے حاصل کرنے کے وسائل اُن قوے کا استعمال ہے۔ جہاں باغ عمدہ سے عمدہ موجود ہوں۔ کسی شخص کو فراغت نصیب ہو۔ بدن میں اِتنی سکت بھی ہو تو وہ وہاں تک نہ جائے۔ اور قدرت کے بے اندازہ کرشموں سے تمتّع حاصل نہ کرے تو یہ کس قدر کُفرانِ نعمت ہے۔ میل مُلاقات۔ واقفیت عامہ کا حاصل کرنا۔ اخبار کی سیر کرنی۔ کھُلی ہوا میں سیر کرنی۔ یا کسی کتاب کا مطالعہ یا دستکاری کا شوق یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ان میں انسان کے لئے بے حد خوشی اور راحت کے سامان موجود ہیں۔ فراغت ایک ایسی چیز ہے ہم زیادہ تو

کو اگر فراغت نصیب ہو تو اِس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھ میں بھی ایک عادت ہے۔ کہ میں اپنے آپ کو ناصح تصوّر کر کے رٹنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر چند میری مثال کسی شخص کی تقلید کے لئے کافی کیا قابل نفرت ہے۔ مگر قسمت کی بُرائی سے چارہ نہیں۔ ممکن ہے کہ صحت ہوتی تو میں بہت کام کرتا۔ مگر پھر بھی دل ہے کہ مانتا نہیں ہے۔ اور کچھ کہنے سے باز نہیں رہا جاتا۔ انسان کی تمام کوششیں بے مراد ثابت ہوں۔ عمروں کی محنت پر ایک دم میں پانی پھر جائے۔ آتش فشاں پہاڑ ایک دم میں شہر جھلس دیں۔ اور غرق کر دیں۔ مگر پھر بھی انسانی ترقی کی دوڑ جاری ہے۔ قومیں۔ مُلک اور اشخاص اِس دوڑ میں اسطرح مصروف ہیں کہ گویا دُنیا کا قیام ہر ایک کی سعی پر موقوف ہے۔ مکڑی کو جالا بنانے سے کام ہے۔ ہزار رہگذر اُسے توڑ جائیں یا آندھی اُڑا کر لے جائے۔ جب تک اُس کے دم میں دم ہے وہ اپنے کار میں لگی ہے یہاں باغ میں ایک جانور کا گھر دیکھتا ہوں جو زمین میں ہر وقت اپنے مُنہ کے لُعاب کے ساتھ تعمیر میں مصروف رہے۔ روز اُسے جاکر توڑ آؤ دوسرے دن پھر موجود۔ پھر کیا استحکام ہے۔ کیسی بانٹ ہے غرض سعی ہی انسان کے لئے غرض اور مدّعا ہونی چاہیئے۔ طلب ہی مدّعا ہے اور طلب ہی نجات ہے۔ طلب خود مطلوب ہے۔

پانچ بجنے والے ہیں۔ صرف ایک گھنٹہ یا اس سے کم دن باقی ہے جی چاہتا تھا کہ اور بھی لکھتا۔ دل میں بہت سی باتیں ہیں۔ مگر میں صبح

سے کہیں بہتر نہیں - راتیں سرد ہو گئی جاتی ہیں۔ میں تنہا اپنے کمرہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں - کپڑے درزی سے مل گئے ہونگے۔ اور آپ نے اُنہیں کسی سفید کپڑے میں لپیٹ کر صندوق میں رکھوا دیا ہو گا۔ کس قدر سلائی لی ہے؟ مرزا اسعد بیگ صاحب کا منشی سیّد میر حسن آج لاہور سے کل وہ آئیگا۔ اگر اُس نے رات کو آنا ہو تو آپ اُسے کپڑے پہنچا دیں۔ ذرا کپڑوں سے عزّت بہت ہوتی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں میں جو بہت ظاہر بین لوگ ہیں اور بانکپن کے علاوہ جنکے پاس کوئی معیارِ شرافت باقی نہیں ہے۔ امتحان کے لئے میں کچھ نہ کچھ کئے جاتا ہوں۔ کچھ اُمید تو بنتی ہے۔ دو تین دفعہ سب کتابیں ہو گئی ہیں۔ بعض زیادہ بھی گھر میں سب سے یہ وعدہ دیدیں کہ انشاءَ اللہ امتحان کے بعد اچھّی اچھّی کتابیں سُناؤں گا۔ مگر مسعودہ کو اِس شرط پر کہ وہ پڑھنا شروع کرے محمودہ کو اِس شرط پر کہ وہ روز خوب دوڑا کرے۔ فہمیدہ کو اِس شرط پر کہ وہ لکھنے میں ترقّی کرے۔ والدہ صاحبہ کو اِس شرط پر کہ اُن کی رنگت میں کچھ سُرخی آجائے۔

خاکسار

عبدُالرّشید چشتی

فصلِ ہفتم

مرحُوم کی نسبت آراءٔ

اِنسانی زندگی کو 'خواب'۔ 'حباب آسا'۔ بے ثبات چند روزہ۔ چار دن کی چاندنی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ سب زبانی باتیں۔ زبان زدِ عام فقرے ہیں۔ بہت کم دل ایسے پائے جاتے ہیں۔ جن پر اِن الفاظ کا کوئی مُستقل اثر موجود ہو۔ یہ الفاظ روز کہتے ہیں۔ روز سُنتے ہیں۔ روز اُن کا ثبوت آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر دل پر اثر معلوم۔ ہم لوگ اکثر اِس طرح جیتے ہیں کہ گویا کبھی مرنا ہی نہیں۔ دُنیا ہمیشہ کیواسطے ہماری ہے اور ہم دُنیا کے کئے ایپ۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہر ہر قدم پر ہمارے اقوال و افعال سے مردم آزاری۔ خود غرضی۔ نفس پروری ٹپکتی ہے۔ کینہ۔ بُغض و حسد۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے ہمنے اپنا شیوہ بنا رکھے ہیں۔ فلسفی۔ ہادِیان مذہب۔ اُستادانِ اخلاق و ادب تین ہزار برس سے زیادہ سے اپنی بیش بہا تعلیم ہمکو دے رہے ہیں۔ مگر یہ خوُن و گوشت کا پُتلا خون و گوشت کا پُتلا ہی رہا۔ خونخواری اور حیوانیّت نے ہماری فِطرت میں کچھ ایسا دخل پا لیا ہے۔ کہ اِس کا رفع کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مذہبی

اور اخلاقی تعلیم آج تک ایک سنگلاخ زمین پر تخم ریزی سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے دینی اور اخلاقی تعلیم کے لازوال اور روحانی اصُول کو اپنی زندگی کے لئے راہبر بنایا اور اُن کی روشنی سے ظُلمتِ ہستی کو روشن کیا۔

عبدُالرّشید مرحُوم ایسے ہی مُبارک لوگوں میں سے تھا۔ نیک زندگی کا نہایت گرانمایۂ اُصُول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے اس رُباعی میں نہائت خوبی سے ظاہر فرمایا ہے۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو　　ہمہ خنداں بُدند و تُو گریاں

ہمچناں زیں کہ وقتِ مُردنِ تو　　ہمہ گریاں بوند و تُو خنداں

اِس معیار اور اِس اصول کے مُطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبدُالرّشید مرحوم کی زندگی ایک مُبارک اور نیک زندگی تھی۔

ناظرین کو یاد ہوگا۔ کہ عبدُالرّشید کی پیدائیش پر تمام خاندان نے کیسی کیسی خوشیاں منائیں۔ اِس کی جوان موت پر جو حال اہلِ خاندان خصوصاً چاہنے والے والدین اور بہن بھائیوں کا ہُوا ہوگا وہ تو محتاج بیان نہیں مگر وہ عام اظہارِ افسوس جو مرحُوم کی وفاتِ حسرت آیات پر صُوبہ بھر کے مُستند اُردو اور انگریزی اخبارات میں کیا گیا۔ وہ دل خراش نظمیں اور مضامین جو مرحُوم کے احباب نے جملہ اطرافِ پنجاب سے لکھیں اِس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ مرحوم نے شیخ علیہ الرحمتہ کے بیش بہا نصیحت پر عمل کر دکھایا۔ اور جسطرح پیدائش کے وقت لوگوں کو ہنسایا تھا۔ اُسی قدر بلکہ اُس سے بہت زیادہ اپنی

موت پر لوگوں کو رُلوایا۔ مرحُوم کی وفات پر مفصلۂ ذیل اصحاب نے تعزیت نامے لکھے۔ اور مرحُوم جیسے ہونہار لائق نوجوان کی بیوقت موت پر کمالِ اظہارِ رنج وتاسّف فرمایا۔

آنریبل کرنل سر ڈیوڈ پارکس مَیسن وی۔ ڈی۔ اے۔ ڈی۔ سی نائیٹ۔
مینیجنگ ڈائرکٹر پنجاب بینکنگ کمپنی لمیٹیڈ لاہور۔

آنریبل مسٹر جسٹس شاہدین صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور

شیخ عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے۔ ای۔ اے۔ سی (سکنڈس) جھنگ۔

ڈبلیو والس صاحب سب ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور

ڈاکٹر میرزا یعقوب بیگ صاحب اسسٹنٹ سرجن لاہور۔

میرزا جلال الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ ازقسطنطنیہ۔

مولوی سیّد احمد کبیر صاحب۔ گورمنٹ سکول لاہور

میرزا اصغر بیگ بی۔ اے وکیل لاہور۔

سیّد نیاز قطب صاحب ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانجات جہلم۔

میرزا مہدی حسن صاحب داروغۂ نزول لاہور۔

منشی گل محمد صاحب نائب میر منشی گورمنٹ پنجاب لاہور۔

لالہ ہربھگوانداس صاحب سول ناظر عدالت ڈسٹرکٹ جج صاحب لائیلپور

منشی محبُوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور۔

سیّد فیض الحسن صاحب بی۔ اے مترجم۔ دفتر سول سیکرٹیریٹ لاہور۔

شیخ نیاز محمد صاحب ٹھیکہ دار بٹھنڈا۔

لالہ امرناتھ صاحب چوپڑہ۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی لاہور۔
شیخ غلام محی الدین صاحب ہیڈ ٹرینز کلارک دفتر صاحب ڈسٹرکٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ۔ راولپنڈی۔
شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔
شیخ نجم الدین صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر سنڈیمن ہائی سکول کوئیٹہ۔
شیخ فضل الٰہی صاحب بیرسٹرایٹ لا کیمبرج۔
ماسٹر جیا رام صاحب (مرحوم) پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
شیخ نیاز علی صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر اوف سکولز لدھیانہ
مسٹر شنکر ناتھ ایم۔ اے (مغفور) بیرسٹرایٹ لا۔ دہلی۔
منشی صادق علی خان صاحب اکونٹنٹ ریاستی ریلوے جموں۔
منشی میراں بخش صاحب اورسیئر۔ پانی پت۔
مولوی ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔ مشیر تعلیم ریاست خیرپور سندھ۔
مس ایم بوس صاحبہ لیڈی سپرنٹنڈنٹ گرل سکول لاہور۔
منشی عبدالعزیز صاحب (مرحوم) وکیل گوجرانوالہ۔
شیخ الٰہی بخش صاحب وکیل ہوشیار پور۔
سید میر حسن صاحب رئیس اعظم ملتان۔
کرم الٰہی صاحب اسسٹنٹ کیرج اگزیمنر داناپور
سید لعل شاہ و بزرگ شاہ صاحبان قادری پشاور۔
شیخ حبیب اللہ صاحب سکشن ہولڈر گورنمنٹ پریس شملہ حال پنشنر۔

میاں عبدالحمید صاحب - بی اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر - ملتان

شیخ عبدالحق صاحب - بی - اے وکیل ملتان

سید غلام بھیک صاحب بی اے آنرز وکیل - انبالہ -

ڈاکٹر عبدالرشید صاحب منہاس - گوجرانوالہ -

شیخ تاج الدین صاحب اپیل نویس درجہ اوّل - گوجرانوالہ -

اِن میں سے چند اصحاب کی تحریرات کا اس جگہ درج کرنا بیجا نہ ہوگا

آنریبل مسٹر جسٹس محمد شاہدین اُن نامور بزرگوں میں سے ہیں جن کی ذاتِ والا صفات پر مسلمانانِ پنجاب کو خصوصاً اور مسلمانانِ ھند کو عموماً ناز ہے۔

مرحوم عبدالرشید کو ینگ مینز ایسوسی ایشن لاہور سے عرصہ تک تعلق رہا جس کے آنریبل موصوف پریسیڈنٹ تھے۔ ایسے مردم شناس - دقیقہ رس - بزرگِ قوم کی رائے ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ شیخ نجم الدین صاحب مرحوم کے اوائل عمر کے دوست تھے اور جس قدر مرحوم کی زندگی سے شیخ نجم الدین صاحب کی ظاہر و باطن واقفیت رہی ہے۔ شائد کسی اور شخص کو کم ہو - مولوی احمد کبیر صاحب کی رائے بھی خاص وزن رکھتی ہے - کیونکہ مرحوم نے ایام طالب علمی میں مدرسہ میں مولوی صاحب موصوف سے تعلیم حاصل کی تھی - اور شفقتِ استادی کی وجہ سے ہمیشہ مولوی صاحب موصوف اپنے رشید شاگرد کی زندگی سے دلچسپی رکھتے تھے - اسی طرح زمانۂ تعلیم کالج کے دوست [illegible] ایم اے [illegible]

بیرسٹرایٹ لا۔ ایسے اصحاب ہیں جن کی نیک رائے نہایت قابلِ قدر ہے مرحوم کی وفات پر جو دردانگیز نظمیں اُن کے احباب نے لکھی ہیں اُن سے کسی قدر اُس دِلی رنج کا اندازہ ہوسکے گا جو مرحوم کی وفات سے اُن کے دوستوں کو ہُوا ہے۔ یہ نظمیں بھی اِس تذکرہ میں درج کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ مفصلۂ ذیل اُردو اور انگریزی اخبارات نے بھی مرحوم کی وفات پر اظہارِ تاسّف کیا اور اُن کی وفات کو قومی نقصان قرار دیکر نہایت رنج کے ساتھ اِس حادثہ کا ذکر کیا۔ پیسہ اخبار کی تحریر شائع کیجاتی ہیں۔

(۱) پیسہ اخبار لاہور
(۲) چودھویں صدی راولپنڈی
(۳) وطن۔ لاہور
(۴) وکیل۔ امرت سر
(۵) راجپوتانہ گزٹ۔ اجمیر
(۶) گلزار ہند۔ لاہور
(۷) وفادار دہلی پنچ۔ لاہور
(۸) رفیق ہند۔ ״
(۹) سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور
(۱۰) آبزرور۔ لاہور
(۱۱) اِتفاق۔ ساڈھورہ

رائے جناب خان بہادر مولوی میاں محمد شاہدین صاحب جج چیف کورٹ پنجاب



بہ حیثیت پریسیڈنٹ ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن مجھے عبدالرشید چشتی مرحوم سے مُلاقات کا موقع اکثر ملتا تھا۔ کیونکہ مرحوم ایسوسی ایشن مذکور کے نہائت سرگرم اور سربرآوردہ ممبر تھے۔ اور کچھ عرصہ تک سکرٹری کا کام بھی انجام دیتے رہے تھے۔ جوں جوں مرحوم سے میری واقفیت بڑھتی گئی۔ مرحوم کے دل و دماغ کے بہت سی خوبیوں اور قومی کاموں میں جانفشانی کے ساتھ حصّہ لینے کی وجہ سے مرحوم کی قدر میرے دل میں بڑھتی گئی۔ مرحوم کا یقین تھا کہ قومی زندگی میں سچی ترقی کی اوّل بُنیاد خودغرضی کو ترک کرکے ادائے فرض میں مصروف رہنا ہے۔ اور اِس یقین کو وہ ہمیشہ اپنے عمل میں ظاہر کرتے رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی صفت مرحوم کی ذات میں تھی جس کی مَیں دل سے عزّت کرتا تھا مرحوم کی ذات میں اعلےٰ درجہ کے خصائل موجود تھے۔ افسوس ہے کہ ایسے اعلےٰ درجہ کے لوگ اُن نوجوانوں میں جو سال بسال ہمارے کالجوں سے بکثرت نکلتے ہیں۔ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ پاکیزہ چال چلن۔ اعلےٰ درجہ کے خصائل ایسی خوبی ہے جس کی مَیں بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ بہ نسبت محض ایک دماغی تیزی اور جگمگاہٹ کے جو شائد آنکھیں چوندھیا دیتی ہے۔ مگر دِل کو تسخیر نہیں کر سکتی۔ عبدالرشید وسعت نظر۔ رائے صائب اور ترقّی کے اسباب کی پُوری

سمجھ اور اخلاقی مضبوطی رکھتے تھے اور اگر وہ زندہ رہتے تو ملکِ خیال و عمل میں اپنے ہمجنسوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتے۔ ایسے نوجوانوں کی موت محض خانگی مصیبت ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قومی نقصان ہے کیونکہ موت نے قبل از وقت ایک ایسا شعلہ بجھا دیا جس کی روشنی روز افزوں ہونیوالی تھی۔ اور جس کی تجلّی بہت سے مقامات کو منوّر کرتی جو اب تاریکی میں پنہاں رہینگے۔ مولوی حامد علی صاحب چشتی نے مجھسے خواہش کی ہے کہ اُن کے مرحوم فرزند کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کروں۔ اور یہ میں نہایت ارادت سے کرتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح مجھے ایک موقعہ ملا ہے۔ کہ اُن اخلاقی صفات کی تصدیق اور قدر کرسکوں۔ جن کی قدر کرنا ہر حال اور ہر وقت میں ہمارا فرض ہے۔ اور نیز اِس وجہ سے بھی کہ عرصۂ دراز کے بعد اُس سوسائٹی کے بہترین زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ جو ہمیشہ میرے دل میں جاگزیں رہے گی ❖

مرحوم عبد الرشید چشتی غفر اللہ

مرحوم سے میرا تعارف ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ اور اِس تعارف کے بڑھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم اپنا مکان جس میں پہلے رہتے تھے چھوڑ کر اُس مکان میں جو مرحوم کے مکان سے بالکل دیوار بدیوار ہے۔ آ گئے ہیں۔ اور چونکہ میرے والد مرحوم کی پہلے سے واقفیت مرحوم کے خاندان سے تھی۔ اِس لیے اُنہوں نے

مجھے مولوی محمد علی صاحب کے پاس جو کہ مرحوم کے دادا کے شاگرد تھے بٹھا دیا
جن سے مینے کچھ عرصہ پڑھا۔ چونکہ میں اور مرحوم اور اُن کا بڑا بھائی آپس
میں قریباً ہم عمر تھے۔ اس لئے ہم سب اکٹھا ملکر پڑھا کرتے تھے۔ اور اکٹھے ہی
کھیلا کرتے تھے۔ میں خود اس وقت لوئر پرائمری کی دوسری جماعت میں
پڑھتا تھا۔ مرحوم اُس وقت کسی سکول میں داخل نہ تھے۔ لیکن گھر پر
اُن کے والد اُن کو تعلیم دیتے تھے۔ اس بچپن کے زمانہ میں مرحوم
کے والد ہم کو اِملا بہت زیادہ لکھوایا کرتے تھے۔ اور اِملا لکھنے اور پڑھنے
کے بعد ہم کو گھر میں یا باہر جاکر کھیلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ مرحوم کا دستخط
اُسی وقت سے صاف اور اپنے والد کے دستخط سے ملتا جلتا تھا۔ کھیلوں میں
جن کو مرحوم پسند کرتے تھے۔ جھولا جھولنا تھا۔ یہ جھولا پرانے مکان سے وسطی
دالان پر لگایا ہوا تھا۔ اور جھولا جھولنے کے وقت مرحوم کچھ گیت ہمیشہ
گایا کرتے تھے۔ جو کہ مجھکو یاد نہیں۔ لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ کُنبے کے
کسی نہ کسی دوسرے ممبر کو ضرور یاد ہوگا۔ کیونکہ کئی ایک کو اس وقت یاد
تھا۔ دوسری کھیل جو مرحوم کو پسند تھی وہ کرکٹ تھی۔ اور اگرچہ اس کھیل
میں مرحوم نے کوئی خاص مہارت ظاہر نہیں کی لیکن وہ
اس سے بالکل بے بہرہ نہ تھے۔ شام کے وقت گرمی کے ایام میں مرحوم اور
اُن کا بڑا بھائی چوبارہ پر اکثر فارسی اور اردو کے شعر بلند آواز میں
یاد کرتے سنائی دیتے تھے جس عادت نے آخر میں خود مرحوم کو شعر کہنے پر آمادہ کردیا
مرحوم کو بچپن میں صاف اور ستھرے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ چنانچہ مجھ کو

ایک دن کا واقعہ یاد ہے۔ کہ میں پرانے مکان میں مرحوم کے والد اور والدہ اور بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ مرحوم کی والدہ نے پوچھا کہ عبدالرشید کہاں ہے۔ تو بھائی نے یا کسی دوسرے شخص نے جواب دیا کہ وہ کپڑے پہن کر سیر کرنے گیا ہے۔ جس کے جواب میں مرحوم کی والدہ نے کہا کہ میرا یہ لڑکا بڑا بانکا ہو گا۔ اگرچہ مرحوم نے اپنی آخری عمر میں بہت زیادہ توجہ اپنے لباس کی طرف ظاہر نہیں کی۔ لیکن وہ کم از کم بہت ستھرا اور صاف رہتا تھا۔ اور اس کا لباس ہمیشہ سادہ۔ باوضع اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ ایک اور بات جسکا کہ مرحوم کو بچپن میں بہت شوق تھا وہ تقریر کرنے کا شوق تھا۔ اور یہ شوق ہمیشہ تک اُن کے ساتھ رہا۔ اور اگر عُمر وفا کرتی تو وہ ضرور ایک نہ ایکدن بڑا زبردست تقریر کرنیوالا اپنے آپ کو ثابت کر دکھاتا۔ انہی بچپن کے دنوں میں مجھے یاد ہے کہ مرحوم نے اپنے ہم عمر دس بارہ لڑکوں کو جمع کیا اور اُنکو کھانا کھلانیکے بعد تقریریں کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ کمرہ جس میں ہم سب لڑکے جمع ہوئے تھے وہ پرانے مکان میں جنوبی بالا خانہ کا کمرہ تھا۔ اُن لڑکوں میں سے جو حاضر تھے مجھے صرف یہ نام یاد ہیں منشی خیرالدین (جو مرحوم کے دوست تھے) اور اُنکا باپ چوہٹہ کے بازار کے قریب نسوار وغیرہ بیچا کرتا تھا۔ (اور جو صاحب کہ اب شائد ریل کے کسی دفتر میں نوکر ہیں) منشی بشیر احمد (جو مرحوم کے والد کے دوست کے فرزند تھے) ۔ مرحوم کا چھوٹا بھائی۔ بڑا بھائی۔ مرحوم شیخ عبدالرحمٰن اور راقم حروف۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد علی چشتی بھی آئے جو کہ

میر مجلس قرار دئے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوائے مُحترم علی چشتی
کے مرحوم کی تقریر ہم سب میں سے اچھی تھی۔ وہ بالکل بغیر کسی رُکاوٹ یا
شرم کے بولتا رہا۔ اِس کے بعد مرحوم گورنمنٹ سکول کی لوئر پرائمری کی برانچ
کی تیسری جماعت میں میرے ساتھ داخل ہوئے اُسوقت اُن کو اکثر یہ شوق
رہتا تھا۔ کہ وہ کاپیوں وغیرہ پر پھول وغیرہ یا نقش بنایا کرتے تھے۔ اور اگرچہ
بعد ازاں بھی اُنہوں نے ڈرائنگ سیکھنے کی کوشش کی اور بُہت کچھ سیکھ بھی
لیا۔ لیکن کالج کی پڑھائی کی وجہ سے اُس کی طرف پُوری پُوری توجّہ نہ
ہو سکی اور اِس لئے پُوری کامیابی بھی اُس میں حاصل نہ ہوئی۔ اِس کے
بعد پاس کرنے۔ بلکہ مڈل کی دوسری جماعت تک مرحوم گورنمنٹ
سکول میں تعلیم پاتے رہے لیکن سوائے اِس بات کے کہ وہ حساب میں عموماً کمزور
اور جواب مضمون لکھنے اور زباندانی میں اکثر اچھا رہتے تھے اور کوئی خاص
قابلِ ذکر واقعہ مجھے یاد نہیں۔ ساتویں جماعت سے مرحوم اِسلامیہ سکول میں
چلے گئے اور اِس لئے اُس کے بعد انٹرنس کے پاس کرنے تک ہمارا کوئی بُہت
زیادہ ملنا نہ ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی امتحان کے موقع پر۔ مرحوم اور مرحوم
شیخ عبدالرحمٰن اکثر اِکٹھا پڑھا کرتے تھے۔ ہم تینوں نے اِکٹھا ۱۹۱۸ء میں
مڈل پاس کیا اور اُسکے بعد انٹرنس میں پڑھتے رہے۔ مرحوم اور شیخ
عبدالرحمٰن مرحوم اِسلامیہ سکول میں اور میں گورنمنٹ سکول میں۔ اُس
وقت بھی مرحوم کا تقریر کا شوق کم نہ ہوا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ وہ اسلامیہ
سکول کی ایک کمیٹی میں جو ایک طرح کی ڈیبیٹنگ کلب تھی بُہت سرگرم

حصّہ لیا کرتے تھے۔ مجھے خود اس میں ایک دو دفعہ مرحوم کے ساتھ جانے اور دیکھنے کا اِتفاق ہوُا۔ انٹرنس کے امتحان کے دِنوں میں ہم تینوں دوست مرحوم شیخ عبدالرحمٰن کے مکان پر پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت دیر تک پڑھنے کے بعد اکثر باتیں کرتے رہا کرتے تھے۔ اور وہیں سو بھی رہتے تھے۔ اُس موقعہ پر مجھے یاد ہے۔ کہ میں اور مرحوم شیخ عبدالرحمٰن کو اکثر نصیحت کرتے تھے کہ وہ اپنی حالت کو تبدیل کرے۔ کیونکہ وہ پڑھتے پڑھتے کچھ ایسے خیالات میں محو ہوجایا کرتا تھا۔ کہ اُسے بالکل یاد نہ رہتا تھا۔ کہ وہ کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔ ہم چونکہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ بچپن کی حالت میں اور امتحان کے قریب اِس قدر اُداس ہو۔ اِسواسطے اُس کی اکثر دِل دہی کیا کرتے تھے۔ اور تسلّی و تشفّی کی باتیں کرتے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں ہم تینوں امتحان انٹرنس میں شامل ہوئے۔ لیکن بیچارہ غریب عبدالرحمٰن مرحوم فیل ہوگیا۔ جس کا ہمیں نہایت ہی رنج ہوُا۔ اور جسکا باعث ہم اُس کی وہی اُداسی اور محویّت سمجھتے تھے۔ ہم دونوں سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ امتحان پاس کرنے کے بعد میں محض مرحوم کی ترغیب سے اسلامیہ کالج میں جو نیا ہی کُھلا تھا داخل ہوُا اور مرحوم نے بھی داخل ہونے کا وعدہ کیا۔ لیکن نہ معلوم کس وجہ سے وہ مشن کالج میں داخل ہوگئے۔ اِس طرح اگرچہ ہم پھر جُدا ہوگئے۔ لیکن ہم گھر پر اِکٹھے پڑھنے کے لئے اکثر مِلا کرتے تھے۔ اِنہی دِنوں میں مجھے مرحوم کے ساتھ سکھر جانے کا اِتفاق ہوُا۔ مرحوم کے بڑے بھائی وہاں نوکر تھے اور گرمی کی

رخصتیں وہاں بسر کرنیکی تجویز ہوئی۔
سکھر کے راستہ میں جب ہم صبح کو بہاولپور کی ریاست میں سے گذر رہے تھے۔ تو ہم سب اُس کے ویران اور غیر آباد ہونے پر افسوس کرتے تھے۔ مرحوم نے ذکر کیا کہ نواب کو شکار کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ بہت اچھا نشانہ لگا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ پالکی میں بیٹھا ہوا بھی جارہا ہو تو ٹھیک نشانہ لگا لیتا ہے۔ لیکن اُس کو مُلک کی آبادی کی طرف کچھ خیال نہیں۔ وہ اگر خیال کرے تو بُہت کچھ اُس کا مُلک سرسبز ہو سکتا ہے۔
جسوقت ہم سکھر سٹیشن پر پہنچے تو مرحوم کے بھائی ہمکو لینے کے لئے آئے ہوئے تھے اور ہم سب وہاں سے سوار ہو کر مکان کو گئے اور چونکہ سفر کی تکان سے بُہت تھکے ہوئے تھے۔ ہم کھانا کھاتے ہی فوراً سو گئے۔ اُن ایّام میں ہم اکثر رات کو اور صبح کو دریا کے کنارے پر سیر کے لئے جایا کرتے تھے اور مرحوم اکثر رات کے وقت اشعار یا قرآن شریف کی آیات کنارے پر بیٹھکر دریا کی لہروں کے شور میں پڑھا کرتے تھے اور مجھے بھی ترغیب دیتے تھے۔ کہ میں بھی کچھ پڑھوں۔ مرحوم اور میں بُہت دیر تک ایک جگہ کھڑے رہتے تھے کہ جو کچھ دو سندھی آپس میں بول رہے ہوں وہ سُنیں اور سمجھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ ہم کوئی پچیس[۲۵] یا ستائیس[۲۷] دن وہاں رہے اور پھر چونکہ ہم بیمار ہو گئے۔ اِس واسطے ہم وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ بیماری کا سبب یہ تھا۔ کہ سکھر میں کھجور بُہت عمدہ اور مزیدار ہوتی ہے۔ اور ہم ضرور ہر روز بُہت بُہت لیکر کھایا کرتے تھے۔ اور

چونکہ گرمی کا موسم تھا۔ اِس واسطے ہم کو تپ آنا شروع ہوا۔ مرحوم گو سکھر
میں بیمار نہیں ہوئے۔ لیکن لاہور پہنچکر وہ بہت سخت بیمار ہو گئے اور ہم سب سے
زیادہ دیر تک بیمار رہے جس سے اُن کی پڑھائی میں بہت ہرج ہوا۔ واپس
آنے کے وقت چونکہ میں تپ کی وجہ سے گاڑی میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔
اِس واسطے مجھے کوئی واقعہ یاد نہیں۔ اُنہی ایّام میں مرحوم نے ینگ مینز
ایسوسی ایشن میں جانا شروع کیا۔ اور اُس میں بڑی سرگرمی سے حصّہ
لینا شروع کیا۔ اور آخر میں وہ اُس سوسائٹی کے سکرٹری قرار دئے گئے ۱۸۹۴ء
کے اختتام پر ہم دونوں ایف۔ اے کے امتحان میں شامل ہوئے لیکن دونو
ناکامیاب رہے۔ اور دونوں ہی حساب میں فیل ہوئے۔ کیونکہ ہم دونوں
اُسی میں کمزور تھے۔ اُس کے بعد ہم دونوں گورنمنٹ کالج میں اِکٹھے داخل ہوئے
اور باقاعدہ اپنی پڑھائی شروع کی۔ لیکن مرحوم چونکہ پھر بیمار ہو گئے۔ اِس
لئے اُن کو دوسرے سال بھی ناکامیابی رہی۔ اگرچہ اُن کے والد
نے مجھکو یہہ یقین دلایا۔ کہ اُنہوں نے اچھّی طرح سے محنت کی تھی۔ لیکن پہلی
کمی کو وہ پُورا نہ کر سکے

دوسرے سال کے امتحان میں وہ کامیاب ہو گئے یعنی ۱۸۹۶ء میں۔ اور
بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے۔ اُنہی ایّام میں مرحوم نے ینگ مینز ایسوسی
ایشن کا سالانہ جلسہ اونر ورد پرلیس کے مکان میں بڑی محنت و سرگرمی
سے منعقد کیا۔ اور بڑی رونق سے جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اِس جلسہ
میں مرحوم کے دوست مرحوم نوازش علیخان نے انگریزی نظم کی طرز پر

ایک دولتمند اور اُس کی موت کا قصہ لکھا تھا جس کو سنکر سامعین بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ مرحوم نوازش علی خاں کے ساتھ مل کر مرحوم نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ سفر نامۂ ابن بطوطہ اور بینی سیریز کے بہت سی کتابیں پیسہ اخبار کے لئے ترجمہ کیں۔ چونکہ ہم جماعت میں اب پھر الگ الگ ہو گئے تھے۔ اِس لئے مرحوم کی منشی عبدالعزیز و مرزا محمد ایوب بیگ مرحوم اور اور طالب علموں کیساتھ زیادہ تعارف ہو گیا۔ اور وہ اکثر اُن کے ساتھ شام کو سیر کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ بھی مرحوم کے مذاق کے تھے۔ اِس لئے وہ اکثر مختلف مضامین پر بحث کرتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ میں اُن کے ساتھ شامل نہ تھا۔ اِسلئے مجھکو کوئی خاص مضمون یاد نہیں کہ وہ کس پر بحث کیا کرتے تھے۔ اِسی سال مرحوم کی شادی کا بندوبست ہوا۔ اور اگرچہ مرحوم خود اُسجگہ شادی کرنے پر راضی نہ تھے۔ لیکن اپنے نانا کے کہنے سے اُنہوں نے اُس کو قبول کیا۔ شادی کے بعد مرحوم کو اُن کے انتخاب پر کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بالکل خوش تھے اور آپس میں اُن کی بہت محبّت تھی اُن کو صرف اتنی شکائت تھی۔ کہ وہ اکثر بیمار رہتی ہے۔ شادی کے بعد شائد ایک سال تک مرحوم تندرست رہے لیکن اِس عرصہ میں اُن کو کالج سے اکثر غیر حاضر رہنا پڑتا تھا اور ایک وقت میں تو مجھکو خیال ہو گیا تھا کہ مرحوم شائد اب آگے نہ پڑھینگے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے پھر تعلیم کی طرف توجّہ کی۔ اور باقاعدہ پڑھنا شروع کیا

اُس کے بعد اُنکو بیماری سے سخت تکلیف اُٹھانی پڑی اور اسی بیماری سے انتقال ہوا۔

وُہ اُن دنوں قانون کی جماعتوں میں بھی داخل ہوئے۔ اور ایک دفعہ ابتدائی اِمتحان میں شامل بھی ہوئے لیکن صحت کے درست نہ رہنے کی وجہ سے مرحوم کو کامیابی نہ ہوئی۔ اُنہی دنوں میں مرحوم نے نوازش علی خاں کے ساتھ ملکر مولانا احمدی کی غزلوں کو مرتب کرکے ایک کتاب چھپوائی تھی۔ جس میں اُن کی اکثر مشہور اور اخلاقی عمدہ نظمیں شامل تھیں۔ میں نے ۱۸۹۷ء میں بی اے پاس کرلیا۔ اور اُس کے بعد مینے کالج چھوڑ دیا اور کشمیر میں نوکر ہوکر چلا گیا۔ مینے مرحوم کو راستہ کی سینری وغیرہ و دیگر حالات کے خط لکھے۔ جس کے جواب میں اُنہوں نے مجھے لکھا کہ تمہاری قوّت بیانیہ نہایت بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواہ یہ درست تھا یا نہیں لیکن کم ازکم مرحوم نے انسانیّت سے بعید جانا کہ وہ ایک دوست کی جس نے اُن کے لئے یہ سب باتیں لکھی تھیں۔ کچھ نہ کچھ تعریف نہ کریں۔

غالباً فروری ۱۸۹۸ء میں مَیں اپنی شادی کے لئے لاہور واپس آیا۔ مرحوم میری شادی میں شامل ہوئے اور برات کے وقت وہ میرے ساتھ رہے چونکہ میں نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور مرحوم نے اپنی شادی کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ یار تم سے تو مَیں ہی بہتر دُولہا معلوم ہوتا ہوں تمنے کیوں کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ مینے کہا

کہ یہ اپنی اپنی پسند ہے۔

شادی کے تھوڑے سے عرصہ بعد مرحوم کا بی۔ اے کا امتحان قریب تھا ان دنوں بھی مرحوم بیمار رہتے تھے۔ چنانچہ جس دن اُنہوں نے انگریزی کا امتحان دیا۔ اُنکو بخار چڑھا ہوا تھا۔ جس دن صبح فلسفہ کا امتحان تھا وہ رات کو مجھ کو بُلانے آئے۔ کیونکہ وہ خود بہت کمزور ہو رہے تھے اور اُن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود کتاب کو دیکھ سکیں۔ اِس لئے وہ میرے پاس آئے کہ میرے مکان پر چلو اور اُس کے مسائل میرے سامنے دُہراؤ۔ چونکہ میں نے بھی خود فلسفہ لیا ہوا تھا۔ اِس لئے مجھے ایسا کرنے میں کچھ دقت نہ تھی۔ چنانچہ میں مرحوم کے ساتھ اُن کے مکان پر آیا۔ ہم دونوں پرانے مکان کے اُس بالاخانے میں بیٹھے جس میں کھڑکیاں نکالی گئی ہیں۔ اور میں اُن کے سامنے سائیکولوجی (علم النفس) اور منطق کی کتاب پڑھتا رہا اور اُن کو سناتا رہا۔ بہت دیر کے بعد جب ہم لیٹے تو اُنہوں نے خانگی معاملات کی بابت ذکر شروع کیا اور مجھ سے کہا کہ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں لیکن ہمکو ایک دوسرے سے conjugal range ہونا چاہیے اور اُسی رات اُنہوں نے اپنے معاملات کی بابت بھی ذکر کیا جس کو میں پہلے لکھ آیا ہوں۔ خدا کی مہربانی سے وہ امتحان میں پاس ہو گئے اور اب اُنہیں کچھ کمانے کی فکر ہوئی۔

مرحوم کو ہمیشہ اِس بات کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کہ اُنکے والد پر بہت بوجھ

پڑا ہوا تھا۔ اور یہ کہ وہ اُن کی کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ خرچ کو کم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ گھر والوں کو اسی طرح کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اسلئے اُن سے جہاں تک ممکن ہوسکا اُنہوں نے اپنی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ کمانے کی کوشش کی تاکہ کم از کم اُنکا بوجھ تو اُن کے والدِ مکرّم کے سر سے ہلکا ہو۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو پرائیویٹ طور پر تعلیم دی۔ اُستاد بنکر سکول میں کام کیا۔ اگرچہ یہ کام بالکل اُن کی طبع کے برخلاف تھے لیکن محض اس سبب کہ اِس سے کچھ نہ کچھ اور ملجائیگا اختیار کئے۔ ایک اور کام جسکے کہ مرحوم اُن دنوں میں بہت شائق ہو گئے تھے۔ وہ یہ تھا۔ کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی دکان کھولنا چاہتے تھے اور مجھسے اکثر کہتے تھے۔ کہ یار کچھ تم جمع کرو اور کچھ مَیں جمع کروں اور مِل کر ایک پریس کھولیں یا کتابوں کی ایک دُکان کھولیں۔ کیونکہ پریس میں بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ نولکشور کی طرف دیکھو کہ وُہ کیسا مالدار ہوگیا ہے۔ وہ ایک معمولی آدمی تھا۔ اُنہوں نے ایک دفعہ کتابوں کا ایک بُک سٹال انارکلی میں کھول بھی دیا۔ لیکن چونکہ کوئی معتبر آدمی وہاں بیٹھنے کے لئے نہ ملا۔ اِس لئے اُس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور وہ آخر کو اُٹھا لینا پڑا۔ امتحان پاس کرنے کے ایک سال یا شائد دو سال بعد وہ ابزرور میں منیجر ہوئے اور اُسجگہ اُنکو اپنے زندگی کے شوق کے پُورا کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ اخبار میں اکثر مضامین اپنی قلم سے لکھتے رہے اور اپنی نوکری کے پچھلے ایام میں اُنہوں نے مجھسے بیان کیا کہ اُنہوں نے ایسی سر توڑ محنت لکھنے اور اخبار نویسی میں کی کہ اُن کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔ میں جب

موسم گرما میں رخصت لے کر لاہور واپس آیا اُس وقت
مرحوم بہت ہی سخت بیمار تھے۔ اور اُس وقت بھی اُن کے بچنے کی اُمید نہ تھی
ایک دن میں اور مرحوم شیخ عبدالرحمٰن جو اُن دنوں میں گرمی کی رخصتوں میں
علی گڈھ کالج سے آئے ہوئے تھے اُنہیں ملنے گئے اُنکا جسم دیکھ کر ہم دونوں
ڈر گئے کیونکہ وہ سخت دُبلے اور مشتِ اُستخوان ہو رہے تھے۔ اور ہمارے
دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوُا کہ مرحوم ہمارا دلی اور سچّا دوست شاید تھوڑے
عرصے میں ہم سے جُدا ہو جائیگا۔ لیکن اُسدفعہ خداوند تعالےٰ نے مہربانی کی اور
مرحوم پھر تندرست ہوگئے۔ الّا بیماری بالکل دور نہ ہوئی۔ وہ مجھ سے ہمیشہ
کہا کرتے تھے۔ کہ یار تم میں شرم حد درجہ سے بڑھ گئی ہے۔ تم بالکل دلیری
نہیں کرتے۔ اگر میری صحت اچھی رہے اور مجھکو موقعہ ملے تو تم دیکھو کہ میں
دُنیا میں کتنی ترقّی کروں۔ اگست ۱۹۰۱ء میں میری کوئیٹہ تبدیلی ہوئی اور
میں جب مرحوم سے ملنے گیا۔ تو اُنہوں نے مجھکو مُبارک دی اور کہا خوف نہیں
خدا کو اگر منظور ہوُا تو تم وہاں بہت ترقّی کروگے اور اُن کے والد نے بھی
مجھ سے ایسی ہی تشفّی کے الفاظ کہے۔ نومبر ۱۹۰۱ء میں میرے جوان بھائی نے
وفات کی۔ مرحوم اُس وقت لاہور میں نہ تھے۔ لیکن جب وہ واپس آئے تو اُنہوں نے
مجھے ایک نہایت ہی عُمدہ خط لکھا۔ جو ہمدردی سے بھرا ہوُا تھا جس میں
فلسفیانہ اور عقلمندانہ نصیحت تھی عبارت کے لحاظ سے بھی وہ خط کچھ کم
زور سے نہیں لکھا ہوُا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں میرے لاہور واپس آنے پر
اُنہوں نے پھر میرے ساتھ میرے بھائی کا افسوس کیا۔ اور اُن کے والد نے مجھ کو

مرحوم کے سامنے نصیحت کی۔ کہ چونکہ میں اب کنبہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں اُسی ہمت اور مردانگی سے اپنے بھائی کے کنبہ کی پرورش کروں جیساکہ اُس نے میری کی تھی۔

مرحوم کی اُن دنوں میں بھی صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ اور اُنہوں نے مجھ سے اس بات کی شکایت کی۔ کہ میں نے اُس کو خط کیوں نہیں لکھا اور جب میں نے کہا کہ تم بھی تو نہیں لکھتے تو اُنہوں نے بیماری کا عذر کیا۔ ۱۹۰۲ء میں اُنہوں نے کوئی خط مجھکو نہیں لکھا۔ اور نہ ہی شائد میں نے اُنکو کوئی لکھا۔ مرحوم اس سارے عرصہ میں بیمار رہے اور شائد کوئی کام نہیں کر سکے۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں میں پھر لاہور واپس آیا اور مرحوم سے ملا۔ مرحوم اُسوقت بھی بیمار تھے اور سخت دُبلے ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب اُنہی دنوں میں اُنہوں نے ایک دفعہ میری دعوت کی تو اُن کو اپنا پرہیزی کھانا کھانا پڑا۔ وہ مجھ سے یہی شکایت کرتے رہے۔ کہ میں نے اِس سال اخبار نویسی میں بہت محنت کی ہے اور اپنے آپ کو پِیس ڈالا ہے (آخیری لفظ مرحوم کے ہیں) اور اس لئے میری صحت بالکل خراب ہو گئی ہے۔ ایک دن میں انارکلی میں مرحوم کو اُنکے بھائی کی دوکان پر مِلا۔ اثنائے گفتگو میں مرحوم نے نہایت ہی اُداس کر دینے والی مُسکراہٹ سے کہا۔ کہ لوگ مجھکو بھی ایک عجوبہ خیال کرتے ہیں کہ پانچ چھ ماہ کے بعد میں شکل دکھاتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں خدا تُم کو تندرستی جلدی عطا کردیگا۔ اور تم بالکل صحیح وسالم ہو جاؤ گے۔ دُکان سے میں گاڑی پر سوار ہو کر مرحوم کے ساتھ شہر میں آیا۔ اور شائد یہ

آخری بار تھی۔ جب میں نے کوئیٹہ آنے سے پہلے مرحوم کو دیکھا۔
اپریل کے مہینے میں سکول میں ایک دن کرکٹ میچ کھیل رہا تھا۔ کہ ڈاک میں سے مرحوم کے بڑے بھائی کا خط مجھکو ملا۔ اگرچہ الفاظ بہت ہی کم تھے لیکن ہر ایک لفظ بجائے خود ایک کتاب تھا۔ میری زندگی بھر کا دوست۔ خیرخواہ اور بھائی اِس جہاں سے کوچ کر گیا۔ ایک کنپ کپی میرے تمام بدن سے بجلی کی طرح گذر گئی اور میرا دل بالکل مایوس ہو گیا۔ اور میں وہاں سے گھر چلا گیا۔ خداوند تعالےٰ اُس نیک دوست کو جنّت نصیب کرے۔ اور اُس کے والدین کو صبرِ جمیل عطا فرماوے۔ میرے ساتھ اُس کی قریباً بیس اکیس برس دوستی رہی۔ لیکن کبھی کوئی غصّہ والا لفظ تک بھی آپس میں نہیں بولا گیا۔ ایسے قابل قدر دوست کا جس قدر رنج ہو تھوڑا ہے۔ لیکن خدا کی مرضی کے سامنے چارہ نہیں۔ اور ہم کو اُس کی رضا پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ خداوند تعالےٰ اُس کو بخشے اور ہم کو توفیق دے کہ اُس کی نیک باتوں پر چلنے کی کوشش کریں۔

کیریکٹر

مرحوم ایک وجیہہ اور اچھے مضبوط بدن کے تھے۔ لیکن بیماری نے اُن کو دُبلا کر دیا تھا۔ اُن کی عادات نہایت عمدہ شریفانہ اور سیدھی سادی تھیں۔ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں نہایت ہی پاکیزہ اور بے لوث چال چلن رکھتے تھے۔ اور اگرچہ وہ عام طور پر مذہبی فرائض ادا نہ

کرتے تھے۔ لیکن اُن کے چال چلن کی پاکیزگی کی وجہ سے میں ہمیشہ اُنکو اپنے سے اور اپنے جیسے بہت سے بہتر جانتا تھا۔ وہ خوش خلق اور ملنسار تھے اور جب اُن کو کسی کے ساتھ ملنے کا اتفّاق ہوتا تھا۔ تو وہ اُسکے دِل پر ایک ایسا اثر چھوڑ جاتے تھے۔ کہ وہ پھر کبھی نہ بھُولتا تھا۔ وہ ایک مطیع فرمانبردار اور نیک بیٹا تھا۔ بامحبّت اور خیر خواہ بھائی تھا۔ باوفا۔ سچّا اور دِل میں گھر کر لینے والا قابل قدر دوست تھا۔ اور بہُت ہی عمدہ شریف اور محبّت کرنے والا شوہر تھا۔ لائق۔ فصیح اور مفید سوسائٹی کا ممبر تھا۔

اُن کے خیالات

مرحوم جہانتک مجھے اُن کے کیرکٹر سے واقفیّت حاصل ہے پولٹیکل معاملات کی نسبت سوشیل معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔

وہ نہایت ہی آزاد اور ترقّی یافتہ خیالات اختیار کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اُن رسموں کو بالکل چھوڑ دیں جو اُن کے خیالات میں ترقّی سے مانع ہیں۔ ایک رسم اُنہیں سے پردہ کی تھی جس کے وہ مخالف تھے۔ ایک موقعہ پر جب اُنھوں نے کچھ ہندو لیڈیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ ایک کھُلی گاڑی میں اپرمال پر شام کو سیر کرتے ہوئے دیکھا تو اُنھوں نے کہا I take it as a good and hopeful sign for India

لیکن چونکہ میں خود اِس بارےمیں اُنسے مُتفق نہ تھا اِسلئے بحث زیادہ نہ کی گئی اور مضمُون چھوڑ دیا گیا۔ پوشاک اور خاصکر مستورات کی پوشاک کے بارے

میں بھی اُن کے خیالات آزادی پسند تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے وہ سرسید کے اکثر خیالات میں پیرو تھے جیسے کہ اکثر تعلیم یافتہ نوجوان آجکل ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے ساتھ کانفرنس میں جب وہ لاہور میں منعقد ہوئی تھی بہت بڑا حصّہ لیا۔

مذہب میں وہ اختصار کو بہت پسند کرتی تھے۔ مثلاً جیسے نماز میں سنّتوں کی تعداد کو کم کرنا یا اور رسُومات کو جو اصل میں مذہب سے نہیں ہیں ترک کر دینا۔ تعلیم کے بارہ میں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح انکا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو اگر ذلت سے نکالنے والی کوئی چیز ہے تو تعلیم ہی ہے۔

Anjuman ...

مکرمی مولٰینا حامد علی صاحب

وفقک اللّٰہ صبراً جمیلا

السّلام علیکم۔ مرزا اعجاز حسین صاحب کی سرکیولر لیٹر اِس وقت میرے سامنے رکھی ہے اور عبدالرشید مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ دل پر جو صدمہ گذر رہا ہے بیان نہیں ہو سکتا۔ اپنے اِس صدمہ سے آپ کے صدمہ کا خیال آتا ہے تو مجھپر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ افسوس ایک وُہ خوش نصیبی کہ خدا نے ایسا خلفِ رشید اور فخرِ خاندان آپکو عنایت کیا۔ اور ایک یہ بدنصیبی کہ ایسا گوہرِ بے بہا ہاتھوں سے دیکھتے دیکھتے

چھن گیا۔ بچپن کا زمانہ پرورش میں گذرا۔ ہوش پکڑا تو اُس کی تعلیم و تربیت اور آئندہ کی خوش کن اُمیدوں میں بسر کی۔ جب پڑھ کر لائق ہؤا۔ اور عمر بھر کی محنتوں اور مشقتوں کے پھل پانے کا زمانہ آیا۔ تو موت کی دست برد نے یہ کوہِ ستم ڈھایا۔ سب اُمیدوں کو مرنے والے کے ساتھ خاک میں ملا دیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ مولٰینا مشیت ایزدی میں مجالِ دم زدن نہیں۔ خدا آپکو رشید کی مُفارقت کے امتحان میں ثباتِ قلب اور صبرِ جمیل عطا فرما کر مستحقِ اجرِ جزیل کرے۔ عبدُ الرّشید مرحوم ایک جوان رشید آپکا فرزند رشید اور میرا شاگرد رشید تھا۔ یہ رشادت کچھُ تو خاندانی تھی۔ جو اضافی ہونے کے سبب چنداں قابل مدح نہیں۔ البتّہ ذاتی اور جبلّی رشادت جو وُہ مرحوم اپنی طینت میں لایا تھا۔ وہ ایسی خوبی تھی جو اِس زمانہ میں کیمیا اور پارس کی طرح عدیمُ الوجود ہے مجھکو سرکاری ملازمت میں تقریباً ستائیس برس گذرے ہیں اور اِس سے پہلے بھی پنج کے طور پر تعلیم کے سلسلہ میں مشغول رہا۔ میں بلا مُبالغہ کہتا ہوں کہ اِس عرصہ میں رشید مرحوم کی طبیعت اور صلاحیت کا لڑکا میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ذکیّ الطبع لڑکے کچھ شوخ اور بے باک ہوتے ہیں۔ مگر رشید مرحوم نہایت مُؤدّب۔ سلیم اور باحیا لڑکا تھا۔ کم گو تھا۔ مگر خوش بیان۔ آزاد منش مگر نہایت خلیق اور ملنسار۔ متین و سنجیدہ مگر بے تکلُّف۔ لڑکے اکثر ذرا ذرا سی بات پر باہم لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ رشید نے مجھُ سے کسی کی شکایت کی ہو۔ بلکہ حیرانی ہے کہ اُس کی جماعت کے لڑکوں میں کسی نے اُس کی شکایت مجھُ سے نہیں کی۔ اِس کامیابی کا راز اِس کے سواء

اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس مرحوم کے برتاؤ سب کیساتھ برادرانہ اور مُشفقانہ تھے سب کی مُشکلات میں کام آتا تھا۔ اور موجباتِ شکایت سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ ہمدردِ انسان اور صاحبِ مُروّت تھا۔ غرض جو خُوبیاں ایک نیک طالبعلم میں ہونی چاہئیں۔ وہ سب اُس میں جمع تھیں۔ رشید نہ رہا اور ہم اُس کی خوبیاں یاد کرنے کو رہ گئے۔ خوبیوں والا اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ زندہ رہتا تو اُس سے ابنائے جنس کو کیا کچھ فائدے نہ پُہنچتے۔ خود اپنی محنتوں کا ثمرہ اُٹھاتا۔ خاندان اور اہلِ خاندان کی عزّت اور مسرّت کو بڑھاتا۔ اوروں کے لئے ترقّی اور تہذیب کا ایک عُمدہ نظیر بنتا۔ اے ماں۔ باپ کے مضطرب دلوں کی نیم شبی اور سحری دُعاؤ۔ تُمہاری رسائی بابِ اجابت تک کیوں نہ ہوئی۔ اے لُقمانی تشخیص والوں کی حکمی تجویز کردہ دواؤ تُمہاری تاثیر کو کیا ہُوا ہ رشید حُصُولِ صحت پر کیوں نہ کامیاب ہُوا۔ ماں۔ باپ۔ عزیز و اقارب۔ دوست و احباب کسی کی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ رشید سب کی آرزوؤں کو خاک میں ملاگیا۔ اور کُنجِ لحد میں جاسویا۔ حق یہ ہے۔ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُم لَا يَستَاخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَستَقدِمُونَ کا مضمون پُورا ہوتا تھا۔ دُعا اور دوا کیا اثر کرتی۔ ہماری یہ بیقراری و جزع فزع محض ضُعفِ بشریّت کا نتیجہ ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی آفرینش سے موت بلا استثناء سب کو پیش آتی رہی ہے صالح و طالح۔ امیر و غریب کوئی اِس سے نہیں بچتا۔ اور یہ خالق کی مشیّت یا مصلحت ہے کہ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ تو اب تسلیم و رضا بہترین مُسلک ہے۔ خوشحال اُس بندہ کا جو اپنے مالک کی مرضی پر راضی رہے۔ اور صبر و رضا کا سِلسِلہ ہاتھ سے

نہ دے۔ مولینا عادۃ اللہ یوُنہیں جاری ہے کہ اپنے نیک بندوں کا اِمتحان اِبتلا سے کرے اور اُن کے اجرو ثواب کو عظیم کرے۔ کیونکہ بے اِبتلا اجرو ثواب کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔ اور اِس سے زیادہ اِبتلا اور سخت امتحان کیا ہو سکتا ہے کہ باپ ایسے فرزند کا داغ اُٹھائے جس پر دُنیا کی تمام خوشیوں اور ساری اُمیدوں کا مدار ہو۔ پس مالک کے اِس انتخابی اِبتلا پر جو آپ نے صبر و رضا سے کام لیا ہے۔ وہ ضرور اجرِ جزیل اور ثوابِ عظیم کا مورث ہے۔ خدا سب کو اِس صبر کی توفیق دے۔ ؎

یارب تیری بندہ پروری کے قربان　　افزوں ہیں کہیں حصر سے تیرے احسان
غم دیکے ہمیں صبر کی بخشی توفیق　　خود کر دئے اجر کے مُہیّا سامان

آپ کا ہمدرد اور جگر کباب دُعاگو
سیّد احمد کبیر۔ ۱۷۔ اگست ۱۹۰۵ء

عبد الرشید چشتی مرحوم و مغفور

۱۸۹۴ء کا موسمِ گرما تھا۔ کہ عبد العزیز (جو اب اسلامیہ کالج کے وائس پرنسپل ہیں) اور مَیں گورنمنٹ کالج کے فسٹ ئیر میں داخل ہوئے۔ ہمارے نام ایک ہی وقت میں درج رجسٹر کئے گئے۔ اور اُس وقت سے ساری زندگی کے لئے ہمارے نام "پرائمس اور سیکنڈس" پڑ گئے۔ میں اِس لئے اِس کا ذکر کرتا ہوں۔ کہ جب کلرک حاضری بُلاتا تھا اور اُس بے باکی کے باعث جو ہم مسٹر بیل کے

ہمیشہ یاد رہنے والے لکچروں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ہم دونوں
کی طرف کچھ کم توجہ نہیں ہوتی تھی۔ مسٹر بیل اُس وقت پرنسپل تھے اور
وڈسٹ اور سیکنڈ ہیڈ کو لونگ مینز سکول کو میوزیشن اور ٹریچ کے پراوربز
پڑھاتے تھے۔ بڑی جماعتوں کے طالب علموں کے سامنے ہمارے دل
نہ ہارنے یا جھجکنے نے ہمیں مشہور کر دیا۔ مگر اس کے سوائے اور بھی وجہ
تھی۔ ہم ہمیشہ اچھی طرح پڑھنے میں فوقیت رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔
اور اکثر اس میں کامیاب ہوتے تھے۔ عبدالرّشید مرحوم شائد اس بات
کا خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ نہایت ہی فصاحت سے پڑھتے تھے۔ وہ اس لئے
پہلے پرائمس اور بعدازاں مجھ پر نہایت مہربانی کرنے لگے۔ میں یہ فوراً ماننے
کو تیار رہوں کہ پرائمس جماعت میں مجھ سے ہمیشہ بہتر رہے۔ علاوہ ازیں میں
بہت کم عمر اور ڈرپوک تھا۔ اور اُن جیسا ہر دلعزیز ہونے کیلئے موزون نہ تھا۔
پہلا سال تو جلد گذر گیا۔ اور انجام پر ہمیں یہ سُنکر نہایت افسوس
ہُوا۔ کہ ہمارے دوست عبدالرّشید فیل ہو گئے۔ اب تک جو بے تکلفی پرائمس
اور عبدالرّشید میں پیدا ہوئی تھی وہ چند وجوہ سے دوُر کی تھی۔ اوّل تو
عبدالرّشید موسمِ سرما میں زیادہ تر اپنی تعلیم میں مصروف رہے۔ اور دوئم
پرائمس ان قسم کی باتوں میں ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ لیکن اس کا ایک
تیسرا بھی سبب تھا۔ اُن دنوں میں پرائمس اور میں بڑے مذہبی خیال
والے تھے۔ اور ہمارا یہہ خیال تھا۔ کہ مسلمانوں کا تنزل اُن کے اپنے
مذہب کے سچّے راستے سے انحراف کرنے کے باعث ہے۔ مگر عبدالرّشید

کم از کم ہمارے خیال میں سر سیّد کے عقائد میں بہت رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ ہماری دیندار آنکھوں میں کوئی بھلائی نہیں معلوم دیتی تھی۔ اس لئے ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء کے موسم سرما میں عبدالرشید کا پرائمیس اور مجھ سے میل جول ایسا گاڑھا نہ تھا۔ جیساکہ ایک روح کی دوسرے روح کے ساتھ بے تکلفی ہونے سے دوستی کو زندگی کا نہایت ہی قیمتی زیور بنا دیتا ہے۔ لیکن ۱۸۹۵ء کے موسم بہار میں دو اہم واقعات ہوئے۔ ایک کا ذکر آگے ہو چکا ہے۔ یعنی عبدالرشید کا فیل ہونا اور دوسرے پرائمیس اور سیکنڈس کا فیل ہونا۔ خواہ کتنا ہی وقت گذر جائے میں اس وقت کی روح کی یکجہتی کو نہیں بھول سکتا۔ جب ہم میں سے ہر ایک نے اپنی دگنی ناکامی کو ایک ہی حادثہ سمجھا۔ یہ اس طرح سے ہوا کہ تمام موسم سرما میں مسٹر جی۔ این چیٹرجی ٹرگنومیٹری پڑھاتے رہے اور بہت سے دیگر ذہین طالب علموں کی طرح پرائمیس اور میں نے کتاب کو بالکل نہ دیکھا۔ مارچ میں سالانہ امتحان آیا۔ پرائمس نے ایک بہادر لڑکے کی طرح تھوڑا بہت جو وہ کر بھی سکتے تھے نہ کیا اور صفر نمبر ملا۔ چند ایک سوالوں پر میں نے ہنر آزمائی کی اور ۱۹ نمبر حاصل کئے۔ مجھے یاد نہیں کہ نمبروں کی میزان ایک سو تھی یا ایک سو پچاس۔ لیکن سخت شرمندگی کا نظارہ اسوقت تھا جبکہ ہم کو پرنسپل کے حکم سے اُس کے کمرہ میں جمع کیا گیا۔ اور ہم سے پوچھا گیا کہ کیوں ہم ایک اور سال کے لئے فسٹ ئیر میں نہ رکھے جائیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں جماعت میں روتا رہا اور کچھ جھوٹ بکا۔ یہ نظارہ

پرائیس کے لئے بھی ویسا ہی دلخراش تھا۔ جس بات سے ہمیں سب سے
زیادہ رنج ہُوا وہ یہ تھا۔ کہ حالانکہ ہم امتحان میں کچھ تو دل لگی کے باعث
فیل ہوئے اور کچھ اِس سبب سے کہ مسٹر چیٹرجی اپنے لکچر بہت جلد جلد
دیتے تھے۔ مگر باقی جماعت یہ خیال کرنے لگی کہ پرائیس اور سیکنڈس صرف
انگریزی میں ہوشیار ہیں اور حساب میں بڑا خفش ہیں۔ یہہ نہایت رنج
دِہ تھا اور خاص کر جبکہ مسٹر اَختر بھی اِسی خیال کی تائید کرتے معلوم ہوتے
تھے۔ آخرِ کار ہم کو دُوسری جماعت میں ترقّی دی گئی اور عبدُالرّشید بھی
اُس میں جلد داخل ہو گئے۔ اصل میں یہ ہماری گہری دوستی کا اصل آغاز
تھا۔ اُن دنوں میں مرزا اعجاز حسین (وکیل انبالہ) تھرڈ ئیر میں داخل ہوئے
مرحوم و مغفور عبدالرّشید چشتی بہت بڑی قابلیتوں والے شریف انسان
تھے۔ میں اُن کی نسبت جیسا میں اُنھیں جانتا تھا لکھتا ہوں۔ اور اُن
بہت سے امُور پر بحث کرتا ہوں جن سے اُن کی سرگرمی ظاہر ہوتی تھی۔
بہ حیثیت ایک دوست کے جن کی وہ وقعت کرتے تھے اُن کے نہایت
ہی ہمدرد تھے۔ اور اِس بات کا خیال کرنا ناممکن ہے کہ وُہ کبھی کوئی سخت
یا غیر متین لفظ مُنہ سے نکالتے تھے۔ اصل میں اُن کی تمام روش اُس حُسن
کی ایک مثال تھی جو زندگی کے ضروری پہلو سے تعلّق رکھتی ہے۔
لوگ عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ مُستعد اور سوچ والے انسان زندگی
کا لُطف نہیں اُٹھاتے۔ بجائے اِس کے یہ بالکل سچ ہے۔ کہ عبدالرّشید
اپنی صحت کی حالت میں متانت اور ساکن ہنسی کے ایک اعلےٰ نمونہ تھے۔

کبھی کوئی لغو بات ہنسانے کے لئے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنے شریفانہ طریقہ میں بہت کامیاب ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو بالکل اُن کا خاصہ تھا۔ بعض وقت وہ مولوی نذیر احمد۔ چوہدری خوشی محمد اور مسٹر آرنلڈ وغیرہ کی ایسے کامل مذاق اور کامیابی سے نقل اُتارتے تھے کہ بڑے سے بڑے ایکٹر اُن پر رشک کرتے۔ لیکن یہ زندہ دلی کبھی زیادہ عرصہ نہیں رہتی تھی۔ اور ہمیشہ مسلمانوں کے معاملات کے مختلف پہلوؤں پر بحثوں کو ختم کرتے تھے۔ اُن کو اپنی جماعت کے مستقبل میں بڑی دلچسپی اور وہ گھنٹوں قومی تباہی کے قریباً یقینی قرائن پر آہِ سرد بھرتے تھے۔ مگر وہ بہت سرگرم تھے اور اگر وہ زندہ رہتے تو اپنی تمام طاقت سے کام کرتے۔ اور اپنی جانفشانیوں کے لئے کبھی معاوضہ کی ادعا نہ کرتے۔ اس طرح وہ اپنے دوستوں کے حلقہ میں "دانا آدمی" کہلانے لگے تھے۔ یہ ایک حقیقی امتیاز تھا۔ کیونکہ باقی دوست مثلاً میرزا اعجاز حسین اور دیگر رفیق کسی طرح سے بھی صیابتِ رائے یا خیالات کی پختگی میں ناقص نہ تھے۔ لیکن عبدالرشید کی متانت اور وقار گویا ذاتی تھے۔

میں اُنھیں اب بھی اپنے دل کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ گو وہ ایک سال اور تیرہ دِن سے قبر میں سوتے ہیں۔ وہ اپنے خاموشانہ طریق سے کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ——— "عبدالعزیز" اُس کام کو نہ بھولنا جس نے ایّامِ گذشتہ میں ہمیں نیک کوششوں کی تحریک کی۔ اُس کے لئے محنت کرو۔ اُس کے لئے زندہ رہو۔ اُس کے لئے مرو۔ خواہ کچھ ہو اُسے ترقی دو

ہلئے ہیں ۔ وہ شخص سچ مچ دوست تھا ۔ ایسا دوست جو کہ کامل ہیرا تھا ۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم اُس کا خیال کریں ۔ اور اُس افسوسناک اور دلشکن حادثہ پر جو کہ ہم سب کو ہوا ہے آنسو نہ بہائیں ۔

بہ لحاظ متخیل ہونے کے وہ ہرگز محض وہمی نہ تھے ۔ گو وہ پردہ کے نہائیت ہی مخالف تھے ۔ پھر بھی وہ ہمیشہ مانتے تھے کہ اس رسم کی آہستہ ہی ترمیم ہو سکتی ہے ۔ اور یہ کام تدریج سے ہی ہونا چاہیئے نہ دفعتاً ۔ انہوں نے ہماری مستورات کی حالت کی اصلاح کی بہت سی تجویزیں سوچی تھیں وہ عورتوں کے جلسوں کے بڑے مؤید تھے ۔ جب وہ اُن بے شمار فوائد کو بیان کرتے تھے جو سوسائیٹی کو ایک زیادہ صحیح رسم کے اختیار کرنے سے حاصل ہو تو گویا ضیافتِ طبع ہوتی تھی

وہ بچوں کی تعلیم میں بھی نہائیت دلچسپی رکھتے تھے ۔ اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ بچوں کی پرورش کے طریقہ پر کامل غور و فکر درکار ہے ۔ وہ بید لگانے کے طریقہ کو بڑی نفرت سے دیکھتے تھے ۔ اور اُس کے سخت ہی مخالف تھے ۔

آریا لوگ جس ہمت سے اپنے سماج کے لئے محنت کرتے ہیں اُسکی نسبت اُن کی نہائیت اعلےٰ رائے تھی اور اکثر افسوس کرتے تھے ۔ کہ ہم لوگوں میں ایسی گرمجوشی دکھائی نہیں دیتی ۔

اُن سب دوستوں میں سے جن کے ساتھ وہ نہائیت بے تکلفی سے ملتے تھے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ بلحاظ ضروری مضامین پر لمبی گفتگوئیں کرنیکے

وہ مجھ پر سب سے زیادہ شفقت کرتے تھے۔ ایک ماہ تک شملہ میں اور نصف ماہ تک راولپنڈی میں اور ہمیشہ جب وہ اچھّے ہوتے تھے اور لاہور میں ہوں۔ ہم لمبی سیریں اور گفتگوئیں کرتے تھے۔ اور ہمارے مضامین زیادہ تعلیم کے متعلّق ہوتے تھے۔ یہ بالکل شاذ و نادر تھا۔ کہ ہمنے کسی نکمّی بات پر بحث کی ہو۔

میرے دوست نظّارہ ہائے قدرت کے بڑے مدّاح تھے۔ پہاڑ یا میدان کے قدرتی نظّاروں کی ایسی خوبیوں کی طرف توجّہ منعطف کرنے سے جو سینکڑوں لوگ بغیر محسوس کئے گذر جاتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ ہم دونوں ملکر اکثر دریائے راوی پر جایا کرتے تھے اور نہاتے تھے۔ جب وہ اچھّی صحت میں ہوتے تھے تو نہانا ایک معجزہ کا کام دیتا تھا۔ جوں ہی وہ نہا چکتے تھے وہ اعلےٰ خیالات سے سرشار ہو جاتے تھے۔ اور گویا منظوم گفتگو کرتے تھے۔ ایسی زندگی تھی جو ہم بسر کیا کرتے تھے۔ وہ محبّت سے بھرے ہوئے اور شفیق تھے۔

اِس زندگی میں اِنسان کے فرائض کی نسبت اُن کا بڑا اعلےٰ خیال تھا اور یہی وجہ ہے۔ کہ حُبّ الوطنی کا احساس اُن میں بہت تیز تھا کسی قومی کام کو ترقّی دینے کے لئے وہ ہمیشہ اوّل ہوتے تھے۔ اُن کو سرسیّد سے محبّت تھی اور اپنی گرمجوشی سے اثر ڈالتے تھے۔ جو مضامین اُنکے قلم سے آبزرور میں نکلے ہیں اُن روح کے ہلا دینے والے الفاظ کی ایک زندہ تصدیق ہیں جو اُن جلسوں میں وہ بولا کرتے تھے جو سرسیّد کی یاد کو زندہ رکھنے

کے لئے ہُوا کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ عبدُالرّشید ایک نہایت اعلےٰ درجہ کے روشن ستارے تھے۔ ہماری بدقسمتی سے وہ بہُت جلد غُروب ہو گئے۔

عبدُالعزیز (ایم۔اے۔اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

۱۹۔مارچ ۱۹۰۴ء

لنڈن

۳۰۔جُون ۱۹۰۴ء

مَیں عبدُالرّشید چشتی بی۔اے مرحُوم کو بحیثیت ایک دلی دوست کے کوئی دس سال سے جانتا تھا۔ جن کی تیز فہمی سے مجھے مسرّت ہوتی تھی۔ پیشتر اِس کے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔ وہ ایک نہایت متیں اور ہمدرد طبیعت رکھتے تھے۔ جو فوراً ہمدردی اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اور اُن کے تعلّقات اپنے دوستوں سے نہائت اعلےٰ درجے کے تھے۔ جب مَیں لاہور میں کالج میں پڑھتا تھا تو کوئی دو سال تک اُن کے مکان کے قریب ایک مکان میں رہا۔ جہاں میری اُن کے بڑے بھائی عبدُالرّحمٰن سے واقفیّت ہوئی۔ اُن کے والد مولوی حامد علی چشتی کی نسبت جو بباعث ا[illegible] اخلاق کے

شہر لاہور میں ایک نہایت معزز و معروف آدمی ہیں۔ میں قدرتاً بہت
کچھ سنا کرتا تھا اور اُن سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ گو یہ خواہش بہت
عرصہ کے بعد پوری ہوئی۔ عبدالرشید سے میری ملاقات اگر میں غلطی
نہیں کرتا تو ہمارے مشترک دوست مرزا اعجاز حسین کے مکان پر ہوئی
میرزا صاحب کا مکان اُن دنوں میں بہت سے لائق نوجوانوں کا مرجع تھا۔
جن کی زندگیاں بعد میں مجھ سے نجی یا پبلک حیثیت میں نہایت عجیب
تعلقات میں وابستہ ہوتی تھیں۔ شیخ عبدالعزیز جو اب میری جگہ "آبزرور"
کے اڈیٹر ہیں۔ عبدالعزیز ایم اے جو اب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔
صادق علی خان جو اب مخزن کے لگاتار معاون ہیں۔ اُن میں سے تھے
جن کی ملاقات وہاں ہوتی تھی علاوہ خود مرزا صاحب کے جو اب میرے
ایک نہایت دلی اور قابل اعتبار دوست ہیں اور چشتی صاحب مرحوم
جو بعد میں ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن کے سکرٹری۔ آبزرور کے
اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مخزن کے نہایت قابل قدر معاون تھے جسقدر
مرحوم چشتی صاحب سے میری ملاقات زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر میں نے
اُن کی قدر کی اور بے تکلفی بجائے اِس کے کہ نفرت پیدا کرے جیساکہ
ضرب المثل ہے ہمارے تعلقات کو زیادہ گاڑھا کرتی گئی۔ مجھے معلوم
ہُوا کہ شیخ عبدالرحمٰن جو میرے ایک نہایت پیارے عزیز تھے۔ وُہ بھی
فوت ہوگئے ہیں۔ رشید مرحوم کے بڑے یار غار تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہُوا
ہے۔ کہ اُن کے والد اور میرے چچا زاد بھائی شیخ نظام الدین کا آپسمیں

تعلق ہمسائیگی بھی رہا ہے۔ میری اُن کے والد سے ملاقات ہوئی۔ جو ہمیشہ اپنے بیٹوں کے سب دوستوں سے مہربانی کرتے ہیں۔ اور جنہیں وُہ غیر معمولی مضبوطی سے محبت کرتے ہیں اور جن کی عُمدہ اور با احتیاط تربیت میں وُہ ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ پس اِن بے شُمار تعلقات سے ملکر ہماری زندگیاں ایک ہی راستہ پر جارہی تھیں۔ کہ موت اُن کے علیحدہ کرنیکو آگئی۔ بڑی لمبی بیماری کے بعد جسکو رشید نے بڑی ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ جھیلا۔ اُنھوں نے ٦۔ مارچ ۱۹۰۳ء کو رحلت کی۔ وہ اپنے خاندانی گورستان گھوڑے شاہ میں سوتے ہیں اور جوان بیوہ۔ ضعیف والدین۔ بھائی اور بے شُمار دوست اپنی جدائی کے ماتم میں چھوڑ گئے ہیں +

عبدالقادر

شذر

وفاتِ عبدالرشید چشتی بی اے مرحوم مغفور

(از سید حیدر حسن صاحب مدرّس گوہانہ ضلع رہتک)

اذا انت مت اھلك الحلم والحجی + فیا لیتنی اعرضت بعدك للردی

جسوقت تو فوت ہوا حلم و حزم فوت ہوگئے + اے کاش تیرے بعد میں معرضِ ہلاکت میں آتا

فواللہ ما انسانی الدھر خلتك + ولا وجھك البسام ارجوه ان اری

بخدا کہ زمانہ نے مجھے تیری دوستی نہیں بھلائی + اور نہ تیرا مسکراتا ہوا چہرہ جسکے دیکھنے کی مجھے آرزو ہے

تصدّعَ قلبی من ھواک تصدُّعا + فمالیَ ذاک الحُرّ اجفانی الکریٰ
تیری محبت سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا + اور اس آگ نے میری آنکھوں سے نیند کو دور کردیا

سَئلتُ اباکَ عنک وھو مُحیّرٌ + ولکن اجابتنی الدّمُوع لہٗ جریٰ
مینے تیرا حال تیرے باپ سے پوچھا اور وہ حیران تھے + لیکن انکی آنسوؤں نے جو جاری ہوئے مجھے جواب دیا

اَتَیتُ مکاناً کُنتَ فیھا مُجالسی + ولکنّھا لولا مُحبّوک قد خلیٰ
میں اُس مکان میں آیا جہاں تو میرے ساتھ بیٹھتا تھا + مگر وہ خالی تھا اگر تیرے مُحب وہاں ہوتے

ولو ادخلتک الرّمس ایدی احبتک + ففی عینھم والقلب منّی لک البقیٰ
اگرچہ تیرے دوستوں کے ہاتھوں نے تجھے قبر میں داخل کیا + پس انکی ذات اور میرے قلب میں تیرے لئے زندگی ہے

تخلّتِ ضریبَ النّحل مرّاً حلیلتی + لئن ذقتِ یوماً من ضریبتہٖ الامرا
اے میری زوجہ تو شہد مگس کو کڑوا خیال کرتی + اگر کسی روز تو اسکی طبیعت کی شہد کو چھکتی

خلیلی لئن اُخّرتَ عامین اَوکذا + فلم تخل من توصیفک القومُ والقریٰ

اے دوست اگر تو دو چار برس اور زندہ رہتا
تو تیری توصیف سے کوئی گروہ اور کوئی قریہ خالی نہوتا

ترجمۂ مرثیۂ مندرجۂ بالا مُصنّفۂ جناب مولوی سیّد حیدر حسن صاحب

از منشی صادق علی خاں صاحب اکاؤنٹنٹ سری نگر کشمیر۔

ہوگیا قتل تیرے مرجانے سے حلم و عقل کا
کاش موت آتی مجھے میں کس لئے زندہ رہا

دوستی تیری زمانے کو ابھی بھولی نہیں + آرزوئے دید ہے وہ عارضِ تاباں تیرا
آتشِ سوزِ دروں سے جل گئی آنکھوں میں نیند
تیری الفت سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا
جا کے پوچھا حال تیرا تیرے والد سے مگر + صورتِ دیوار حیرانی کی وہ تصویر تھا
کچھ نہ کھلتا گر نہ ہوتے آنکھ سے آنسو رواں۔
کاروانِ اشک نے احوالِ دل بتلا دیا +
جس جگہ مل کر رہا کرتے تھے ہم دیکھا وہ گھر
وہ بھی خالی تھا نہ ہوتے گر تمہارے اقربا +
گو لِٹا آئے لحد میں ۔ زندگانی کا تیرے
ہے امانت دار لیکن اُن کا قلب اور دل میرا +
شہدِ خالص کچھ مزا دیتا نہ تجھ کو ہم نشیں
اُس کے شہدِ خُلق کا چھکتے اگر تم ذائقا +
اور زندہ رہتے گر اے دوست تم دو چار سال
قریہ قریہ تیری توصیف و ثنا سے گونجتا +

رسالۂ مخزن بابت ماہ مئی ۱۹۰۳ء جلد ۵ نمبر ۲

دیدۂ گریاں

(قطعہ بر وفاتِ حسرت آیاتِ عبد الرشید چشتی مرحوم)

دِل کوئی ایسا بھی یارب بے سر و ساماں نہو
قطرہ خوں جس میں برائے دیدۂ حیراں نہو

چل دیا کل رختِ ہستی چھوڑ کر عبد الرشید
آکے اِس حسرت کدہ میں دل کوئی شاداں نہو

تیرِ پیکانِ اجل سے ہو گیا دل چاک چاک
خُوں فشاں کیونکر ہمارا دیدۂ گریاں نہ ہو

جس کے مرجانے سے غیروں کی بھی حالت غیر ہے
کس طرح سے اُسکے غم میں خونِ دل خونبشان نہو

سینہ پھٹ جائے نہ ہو ماتم میں جو تیرے فگار
آنکھ وہ پھُوٹے جو تیرے غم میں خون افشاں نہو

ہم کو ہرگز بے وفائی کی نہ تھی تم سے اُمید
دوستی کا دوستوں سے اب کوئی جویاں نہ ہو

ایسی چلنے کی بھی کیا جلدی پڑی تھی اے رشید
ہائے تم جیسا بھی کوئی تابعِ فرمان نہ ہو

دیکھ لینے دے ہمیں صورت نہ یوں منھ ہم سے موڑ
دِل سے تو اوجھل نہیں پر آنکھ سے پنہاں نہ ہو

ٹمٹما کر بجھ گئی آخر وہ شمعِ انجمن
کس طرح برہم عزیزان محفلِ یاراں نہ ہو

اُس مرض کا ہائے کیا چارہ نہ ہو جس کا علاج
کیا دوا اُس درد کی جس درد کا درماں نہ ہو

یہ نہیں وہ دُکھ کہ جس کا ہو مداوا اے طبیب
میرے بالیں سے سرک اے چارہ گر الجھاں نہ ہو

کِس طرح ٹھہرے مُسافر ہو چکا عزمِ وطن
تو گریباں گیرِ مہماں اے دلِ ناداں نہ ہو۔

کھا لئے ہیں اِس زمین نے کیسے کیسے نونہال
باغِ عالم کی ہوا میں گُل کوئی خنداں نہ ہو

تازہ رکھنی ہے ہمیں صادق گُلِ رعنا کی یاد
اُس کی تربت کے گُلوں پر دیدہ کیوں گریاں نہ ہو

المرقوم
صادق علی خاں

مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء جلد ۶ نمبر ۱

نوحہ رشید

۲۰ ستمبر ۱۹۰۳ء کی شام کو بعدِ غروبِ آفتاب راقم جوان مرگ عبدالرشید چشتی بی۔ اے مرحوم کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اُسوقت جن جذبات نے دل پہ ہجوم کیا اُن کی عکسی تصویر ذیل کے چند شعروں میں کھینچی گئی ہے چونکہ مرحوم کا مخزن سے خاص تعلق تھا جسکو مرحوم کی بیوقت موت نے عین ابتدا میں قطع کر دیا۔ اِس لئے اِن سطروں کا مخزن میں جگہ پانا بے موزون نہ ہوگا۔ (نیرنگ)

نظم

اشکِ حسرت تیرے مدفن پہ بہانے آیا
تونے جو داغ دیا تجھکو دکھانے آیا۔

مرضُ الموت میں بھیجا تھا جسے عید کا کارڈ
وہ تیرے بسترِ خاکی کے سرہانے آیا

جس کے شعروں کو بہت شوق سے تو سنتا تھا
آج وہ تجھ کو تیرا نوحہ سنانے آیا

رات اندھیری ہے طبیعت نہ پریشاں ہو تیری
شعلۂ آہ کی ایک شمع جلانے آیا

چھوڑ احباب کو سوتا ہے پڑا چین سے تو
نعرۂ درد سے میں تجھکو جگانے آیا

ہائے جسکے لئے صد دولت بیدار تھا تو
وہ پدر خود تجھے مرقد میں سُلانے آیا

جیتے جی پھُول سے تھی تجھ کو بہت کچھ نسبت
میں تیرے ڈھیر پہ بھی پھُول چڑھانے آیا

ملتی جلتی تھی بہت پھول سے خصلت تیری
سیرِ گلزار سے کچھ کم نہ تھی صحبت تیری

بوئے گل جیسے کہ پھیلاتی ہے ہر سمت نسیم
اس طرح پھیلی تھی اخلاق کی نکہت تیری

یار و اغیار میں کچھ فرق نہ تو کرتا تھا
مسکراہٹ تیرے ہونٹوں پہ تھی طینت تیری

تجھ کو کینے سے تعلق نہ تعصب سے لگاؤ
وسعتِ تامہ رکھتی تھی محبت تیری

جس طرح پھول ہے دو روز میں کملا جاتا
اس طرح تھوڑی سی تھی عمر کی مدت تیری

تھی خوشی تیری عزیزوں کو ملائے رکھنا
بہجتِ خاطر احباب مسرت تیری

تو وہ تھا جس کو پیمبر نے کہا ہے مومن[1]
ہاتھ سے بول سے ایذا نہ تھی عادت تیری

گردشِ چنبرِ دوار نے جینے نہ دیا
کچھ تو ارمان عزیزوں کے نکلنے لے کاش

ایک جان اُس پہ یہ دیرات ہجوم آلام
تو تو رکھتا تھا آزار کسی کا بھی روا

جبن سے تجھ کو ستمگار نے جینے نہ دیا
چار دن بھی تجھے خونخوار نے جینے نہ دیا

کثرتِ مجمعِ افکار نے جینے نہ دیا
ہائے تجھکو تیرے آزار نے جینے نہ دیا

[1] حدیث نبوی ہے المومن من یسلم المرء من یدہ ولسانہ مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے انسان بچا رہے

تھا جسِ آئین کے نکتوں میں تعمق تجھکو
شاہدِ ران کے جلوے کا جو تھا تو مشتاق

اُسی آئینِ پُر اسرار نے جینے نہ دیا
ہاں اُسی حسرتِ دیدار نے جینے نہ دیا

سخت جانی سے ہے تیرنگ بھی آخر زندہ
تجھکو کیوں موتِ جفا کار نے جینے نہ دیا

(تیرنگ)

روزانہ پلیسہ اخبار۔ مطبوعہ ۱۸۔فروری ۱۹۰۴ء

پس از مرگِ جوانان گل مسا ناد
دگر اندر چمن بلبل مخواناد

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلاگئے * حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھاگئے

دیدۂ گریان

نوحۂ وفاتِ مولوی عبدالرشید چشتی بی۔اے مرحوم۔از
منشی صادق علی خانصاحب اکاؤنٹنٹ جموں ریاسی ریلوے سروے

تاریخِ انتقال عبدالرشید چشتی ۶ مارچ ۱۹۰۳ء

سر ہے دھننے اور آنکھ آنسو بہانے کیلئے
ہے سبق اوروں کو اپنی زندگی کی سرگذشت

دِل ہے غم کھانیکو اور غم دِل کے کھانے کیلئے
ہے ہماری داستان عبرت زمانے کیلئے

بارور ہونے نہیں پاتا کبھی نخلِ مراد
آتی ہے آندھی کوئی جڑ سے اُکھاڑنے کیلئے

باغ میں کھلتا ہے جب تازہ گُلِ رعنا کوئی
چُن کے لیجاتے ہیں گلدستہ سجانے کے لئے

آسمان خونِ جگر کا گھونٹ دیتا ہے پلاء
کھولتا ہے غنچہ گر لب مسکرانے کے لئے

دانہ دانہ لاکے ہم کرتے رہیں خرمن بہم
آسماں ہے منتظر بجلی گرانے کے لئے

ہے ازل سے اپنا چرخِ پیر سے شاید یہ عہد
تُو ستایا کر۔ رہیں ہم جور اُٹھانے کیلئے

آشیاں سے چوکتی ہے گر نگہ صیّاد کی
بجلیاں بیتاب ہوتی ہیں جلانے کیلئے

دل مرا وقفِ رضائے خاطرِ جلّاد ہے
میں وہ ہوں جسنے کہ بوسے تازیانے کیلئے

کون سُنتا ہے بھلا ہم دل جلوں کی داستان
لکھیئے اب احوالِ دل کس کو سُنانے کیلئے

سینہ میں آہنگِ شورِ نالہ و فریاد ہے
عالمِ ہستی بھی کیا ہے عالمِ بیداد ہے

رات دن چُنتے ہیں تنکے آشیانے کیلئے
آپہنچتی ہے کوئی بجلی جلانے کے لئے

مولوی حامد علی کو دے صبا جاکر سلام
سر تھا اپنا وقف جسکے آستانے کے لئے

کر ادب سے عرض ہم بھی تیرے غم میں ہیں شریک
چاہیئے پتھر کا دل جسکو اُٹھانے کے لئے

کہتے ہیں ہوتا ہے رونا صدمۂ دل کا علاج
ہیں کھڑے کیونکر لگی دل کی بجھانے کیلئے

ضبط کر گریہ کو بھی کیونکر کھڑوں جب خوف مجھے
دیدہ و دل متّفق ہیں خوں رُلانے کیلئے

وائے ناکامی کہ رحلت کر گیا عبدالرشید
مُستعد ہیں دیدہ و دل خوں بہانے کیلئے

آنکھ کُھلتے ہی تمہاری دولتِ بیدار کو
موت آئی تھپکیاں دیکر سُلانے کیلئے

تجھپہ اے چرخِ ستمگر حیف ہے صد حیف ہے
کیوں بنا تھا تُو ہمیں ظالم ستانے کیلئے

مخملی تکیوں پہ جنکی نیند ہوتی تھی حرام
دیتا ہے خشتِ لحد اُنکو سرہانے کے لئے

اُنکی مسند ہے بنانا گور کی دو گز زمین
دیتا تعویذ گراں ہے شامیانے کے لئے

ایسی تصویروں کے چُن چُن کر مٹاتا ہے نشان
جنکے نقشے ہیں میرے آئینۂ دل میں نہاں

دل کوئی ایسا بھی یارب بے سروساماں نہو
قطرہ خون جسمیں برائے دیدۂ حیراں نہ ہو

چل دیا کل رختِ ہستی چھوڑ کر عبدالرشید
آکے اس حسرت کدہ میں دل کوئی شاداں نہو

تیرِ پیکانِ اجل سے ہو گیا دل چاک چاک
خوں فشاں کیونکہ ہمارا دیدۂ گریاں نہو

جسکے مرجانیسے غیروں کی بھی حالت غیر ہے
کس طرح سے اسکے غم میں خرمنِ دلِ خویشاں نہو

سینہ پھٹ جائے نہ ہو ماتم میں تیرے جو فگار
آنکھ وہ پھوٹے جو تیرے غم میں خوں افشاں نہو

ہمکو ہرگز بیوفائی کی نہ تھی تجھ سے اُمید
دوستی کا دوستوں سے اب کوئی خواہاں نہو

ایسے چلنے کی بھی کیا جلدی پڑی تھی اے رشید
ہائے تم جیسا بھی کوئی تابعِ فرماں نہ ہو

دیکھ لینے دے ہمیں صورت نہ یوں مُنھ ہمسے موڑ
دل سے تو اوجھل نہیں پر آنکھ سے پنہاں نہو

ٹمٹما کر بجھ گئی آخر وہ شمعِ انجمن
کس طرح برہم عزیزاں محفلِ یاراں نہو

اُس مرض کا ہائے کیا چارہ نہو جسکا علاج
کیا دوا اُس درد کی جس درد کا درماں نہو

یہ نہیں وہ دکھ کہ جسکا ہو مداوا اے طبیب
میرے بالیں سے سرک اے چارہ گر انجان نہو

کس طرح ٹھہرے مسافر ہو چکا عزمِ وطن
تو گریباں گیر مہماں اے دلِ ناداں نہو

کھائے ہیں اس زمیں نے کیسے کیسے نونہال
باغِ عالم کی ہوا میں گل کوئی خنداں نہو

تازہ رکھنی ہے ہمیں صادق گلِ رعنائی کی یاد
اسکی تربت کے گلوں پر دیدہ کیوں گریاں نہو

آب میرے پیشِ نظر ہے اک پرانی انجمن
مجمعِ اربابِ یکدل بزمِ یارانِ کہن

تھے اچھلنے کودنے اور کھیلنے کھانے کے دن
سب کے سب یعنی سرورِ نوجوانی میں مگن

اے نوازش[1] یاد آئی ہے تیری زندہ دلی
وہ ہنسی وہ چہل وہ زندہ دلی وہ چھیڑ چھاڑ
یاد ہے وہ شیخ[2] صادق بندۂ رحمانِ پاک
کی یہ ہمت خدمتِ خلقِ خدا میں جان دی
ہم نہیں بھولے تہجد خوانیاں ایوب[3] کی
اسقدر صبر اور استقلال وہ زہد و ورع
اے ہمایوں[4] پھر سنا کچھ قصۂ مرگِ مجید[5]
اسپہ طوفاں ہے وصالِ چشتیٔ عبد الرشید

ہے بجا تجھکو کہیں گر ہم شہیدِ علم و فن
وہ مذاق اور وہ لطیفے اور وہ شعر و سخن
جس کے قرآن کی صدا سے بولتا تھا کوہ بن
گونجتا ہے تیرے اوصافِ حمیدہ سے وطن
اسپہ طبعی کا بھی سچ مچ تھا وہ شیدائے زمن
تھا جوانوں کیلئے ضرب المثل اسکا چلن
وہ جوانِ خوش قبا وہ سروِ رنگیں پیرہن
ہو گئے تازہ ہمارے پھوٹ کر زخمِ کہن

آگیا اس گلشنِ رنگین میں گلچین قضاء
اچھے اچھے پھول سارے چمن کے ظالم لے اڑا

ہے خزاں میں بھی دلِ بلبل میں یادِ چمن
کیسی شالامار کی اسوقت شیریں تھی ہوا

جوں اندھیرے میں چراغِ ماہ کی کوئی کرن
اسکی نہرِ صاف تھی اپنے لئے نہرِ لبن

۱؎ منشی نوازش علی خان مرحوم * ۲؎ شیخ عبد الرحمن بی۔اے مغفور طالب علم علیگڈھ کالج جو تحصیلدار مقرر ہو کر کالرا کیمپ میں ڈیوٹی پر بھیجے گئے تھے اور دو تین ہفتے کے بعد ہی وہاں رحلت کر گئے * ۳؎ مرزا محمد ایوب بیگ مرحوم برادرِ خورد ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب ایل۔ایم۔ایس اسسٹنٹ سرجن لاہور *
۴؎ تخلص آنریبل میاں محمد شاہدین صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لاء
۵؎ میاں عبد المجید بی۔اے مغفور فرزند میاں نظام الدین صاحب ڈسٹرکٹ جج۔پنشنر۔رئیس باغبان پورہ *

کسقدر شیریں ہُوا کرتی تھی سیرِ صبح شام ۔۔۔ جب پھرا کرتے تھے ہم آزاد مثلِ کوہ کن
سچ کہو تم کسقدر تھے چلبلے عبدُالعزیز[1] ۔۔۔ یاد ہیں جو مضمون سنا دیتے تھے تم از برمن
یاد ہے تجھکو کہ تو عبدُالرشید اور خاکسار ۔۔۔ کسطرح جاتے تھے پڑھنے ملکے برطرفِ چمن
کیسے وُہ رٹتے تھے منطق ہم سرِ شاخِ درخت ۔۔۔ سبزۂ تر پر کیا کرتے تھے کیا مشقِ سخن
اور وہ تشریح کلامِ غالبِ معجز بیاں ۔۔۔ یاد ہے اعجاز[2] جب ہوتا تھا تو گرمِ سخن
اے عزیز[3] و کیا کہوں اُس چھیڑ خوانی کے مزے ۔۔۔ چھیڑتے تھے مجھکو اکثر جان کر جب بیوطن
اپنے سب جلسوں میں لیکن عادِ اعظم تھا رشید ۔۔۔ کرتا تھا ہر ایک قربان اُس پر اپنا جان و تن
تھا یقین کس کو کہ وہ تصویر ہنستی بولتی ۔۔۔ ہو گئی یوں خاموش مثلِ شعلۂ شمعِ لگن

اُس کے مرجانیسے دُوبھر زندگانی ہوگئی
زندگانی کی حقیقت بھی کہانی ہوگئی

اب زمانہ بھر میں تُم سا آشنا کوئی نہیں ۔۔۔ ہم سخن کوئی نہیں اور ہم نوا کوئی نہیں
مہربانوں کا عزیز اور دوستوں کا قدرداں ۔۔۔ یار کا یار آشنا کا آشنا کوئی نہیں
دردمند خوش سخن صاحبدل و شیریں کلام ۔۔۔ عالم و کم گو جوان و باحیا کوئی نہیں۔
دیکھتے ہم تجھ سا اے بحرِ محبت کے غریق ۔۔۔ قوم کی اُلفت میں اب ڈُوبا ہوا کوئی نہیں
یاد رہ رہ کر نہ آئیں کیوں تیری دلداریاں ۔۔۔ دلبر ایسا جس سے ہو چشمِ وفا کوئی نہیں

۱؎ منشی عبدالعزیز منہاس ساکن گوجرانوالہ مختار عدالت سرسہ حال وکیل گوجرانوالہ
۲؎ مرزا اعجاز حسین صاحب بی۔اے پلیڈر۔ وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی انبالہ
۳؎ حافظ عبدالعزیز صاحب ایم۔اے۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جھنگ۔ حال پرسنل اسسٹنٹ ریونیو کمشنر فرانٹیئر پراونس پشاور۔

آپ شکستہ پر و رُسوائی بے بازو ہوئے
اور پُرساں ہاں کے دل کے حال کا کوئی نہیں

پیاری بہنیں تیری ہی اور وہ[عہ] بے زبان پردہ نشین
دیکھ آئے دلسوز۔ اُن سا دل جلا کوئی نہیں

اُس مریضِ لادوا کی ہائے مایوسی نہ پوچھ
اپنوں کو بھی جسکی اُمیدِ شفا کوئی نہیں

کر نشانہ اب بھی ہے حاضر میرا دل اور جگر
تیرے ترکش میں مگر تیر آئے قضا کوئی نہیں

دردِ دل کی داستان کیونکر تجھے کوئی سُنائے
نامہ بر اپنا جز آہِ نارسا کوئی نہیں

صبحدم چوں بر دمد آہنگِ ہُو و ہائے من
آسماں صحنِ قیامت گردد از غوغائے من

اے کہ تو آزادِ غم اور فارغِ آلام ہے
اے کہ تو خوابِ ابد میں مائلِ آرام ہے

اے کہ دُنیا اور مافیہا سے لاپروا ہے تو
کچھ غمِ ہستی نہ فکرِ گردشِ ایّام ہے

اے کہ تو اوشا کے مخمصوں سے ہے الگ
اے کہ تو بیگانہ تفریقِ صبح و شام ہے

حیف دُنیا میں نہ تجھکو کام کی فرصت ملی
ورنہ جو تو نے کیا سب لائقِ انعام ہے

زیست کے ناٹک سے ایسا جلد تو اُکتا گیا
اِس تماشا گاہ کا آخر یہی انجام ہے

اِک نہ اِک دن پہنچنا ہے منزلِ مقصود پر
جتنا پہلے جو چلا اُتنا وہ خوش فرجام ہے

کیسے کیسے ہو گئے اِس خاک میں گوہر نہاں
دِل غریقِ موجۂ بحرِ غم و آلام ہے

ہو رہا ہے آج کُنجِ گور میں عزلت گزیں
نام جسکا دہر میں مشہورِ خاص و عام ہے

عالمِ عقبیٰ سے گر آتی نہیں تیری خبر
زندگانی کا ہمارے بھی لبالب جام ہے

طائرانِ گلشنِ امکاں کا ہے تو ہم نفس
اے رشید اب یہ تمنّائے دلِ ناکام ہے

ابرِ نیساں تیری تُربت پر سدا گریاں رہے
اور ہمیشہ تیرے مرقد کا چمن خنداں رہے

عہ بیوۂ بدقسمت۔

قطعاتِ تاریخ

وفاتِ حسرت آیاتِ مولوی عبدالرشید صاحبِ چشتی بی۔ اے مرحوم مغفور

دریغا کہ عبدالرشیدِ رشید
بچیدہ ز باغِ جوانی گلے

شرارے فروریخت از برقِ غیب
برآن دلستانے برآن گلبنے

چنیں نیک کردار و شیریں روان
چناں نغز گوئے سخن پرورے

نشستے گرہ بر زبان عندلیب
بہ محفل بگفتار چوں آمدے

چمن گشت پامالِ بادِ خزان
نہ بلبل نہ گل ماند و نے گلشنے

چو روحش سوئے دارِ جنت پرید
ندا زد "بباغِ ارم بلبلے"

۱۳۲۰ ھجری

ناگہ بہ شہرِ خاموشاں گذر فتاد
دیدیم خاکِ تازۂ آں تازہ تر گلے

نہ شگفتہ و قضاش بہ بادِ فنا سپرد
نشنیدہ بوئے دامنش اے وائے بلبلے

عبدالرشید چشتئ مرحوم پاک زاد
کز عالمِ شباب نصیبش نشد ملے

مسکیں بہ کنجِ صحنِ چمن آرمیدہ بود
گل رفت و برد از دلِ بلبل تحملے

دل ریش از جدائیِ آں یارِ حق شناس
گشتم در آں حدیقہ برآوردہ غلغلے

هر گل در آں چمن که ز موجِ صبا دمید | جامه دریده بر سرِ بالینِ آں گلے
روشن ضمیر و پاک دل و پاک دامنے | نکشیده گردِ عارضِ او خطِّ سُنبلے
شیریں زبان و فاضل و آزاد و فلسفی | رنگیں بیان و صاف دل و بے تجمّلے
بحنا خلیق و خوش دل و خوش وضع و خوش مذاق | پُر مغز و نغز گو و چو کوه تحمّلے
بر لوحِ تربتش چو نظر ناگهاں فتاد | خواندیم سالِ مرگ بغیر از تأمّلے
هاتف چو نامۂ عملش نمود سطے | چیزے در آں نیافت بغیر از تفضّلے ۱۳۲۰

چشتی چو سوئے فردوس بگذاشت ایں جہاں را | برباد داد ایں را آباد ساخت آں را
آیا چه دید کز ما آں ماه رخ بپوشید | بگذاشت دوستاں را بنواخت دشمناں را
کو کاغذ و سلامے کو نامه و پیامے | پیریم در غمِ تو که رساند آں جواں را
ما را جنونِ عشقش رسوائے عالمے کرد | سوزِ غمِ فراقش بگداخت مغزِ جاں را
درد و غمِ جہانے بنوشت در حسابم | تا چند بار محنت ایں جانِ ناتواں را
هر راحتے و رنجے گویند امتحانیست | آخر کشیم تا چند ایں بارِ امتحاں را
برسد هر آں چه از دوست باید بر آں صبوری | با میزباں نشاید پرخاش میہماں را
باید رضاش جوئم و ز راه صلح پوئیم | تغییر نیست ایدل فرمانِ آسماں را
از زندگیِّ آں یار باید سبق بخوانیم | چوں پیشِ حکمِ حاکم بدرود کارواں را
دریائے علم و فن را بود دستِ دُرِّ یکتا | با خاک چوں سپردند آں گنجِ شائگاں را
صادق ز روئے ماتم (۴۰) بنوشت سالِ وصلش | عبدُالرشید چشتی (۱۳۳۴) تسلیم کرد جاں را

عبدالرشید چشتی ۱۳۳۴ + ۴۰ (ماتم کا میم) - (منفی) ۵۴ (جان) یعنی ۱۳۷۴-۵۴
= ۱۳۲۰

ہفتہ وار پیسہ اخبار لاہور۔ بابت ۲۱۔ مارچ ۱۹۰۳ء

عبدالرشید چشتی مرحوم

مرحوم عبدالرشید چشتی جو لاہور کے مشہور اور قدیم علم دوست خاندان کے چشم وچراغ تھے ان کے افسوسناک انتقال کی خبر پچھلے پیسہ اخبار میں درج ہو چکی ہے عبدالرشید چشتی کے انتقالِ پُر ملال سے نہ صرف اُنکے بزرگ باپ اور بھائیوں کو صدمہ ہُوا ہے بلکہ ملک اور قوم کو بھی اُنکے نقصان سے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ نہ صرف اسلئے کہ وہ ایک ہونہار اور لائق گریجوایٹ تھے۔ نہ اسلئے کہ وہ انگریزی اور خصوصاً اُردو میں بڑے قابل مضمون نگار تھے۔ بلکہ زیادہ تر اسلئے کہ وہ نہائت نیک بخت نیکدل اور نیک نیت نوجوان تھے۔ جو اپنے ہمعصر تعلیم یافتہ نوجوانوں کیلئے سلامت روی اور سعادتمندی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ مرحوم نے کچھ عرصہ پشاور اور گوجرانوالہ کے اسلامیہ سکولوں میں ہیڈ ماسٹری کی اور کچھ مدت آبزرور کے دفتر میں منیجری اور سب ایڈیٹری کی۔ مگر اِن کاموں سے اُنکی لیاقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ موت نے مرحوم کو مہلت نہ دی کہ اپنی طبیعت کے خداداد جوہروں کو ظاہر کرے۔ ہرچند کہ مولوی حامد علی صاحب چشتی کو ایسے لائق نورِ نظر کے فراق سے سخت صدمہ پہنچا ہوگا۔ لیکن اُن کی سچی عالمانہ اور فلسفانہ طبیعت سے اُمید ہے کہ وہ اِس مصیبت کا مردانگی سے مقابلہ کرینگے اور صبر و شکیبائی سے کام لینگے ✦

ایضاً

عبدالرشید چشتی مرحوم

نمیدانم حدیثِ نامہ چون است ٭ ہمیدانم کہ عنوانش بخون است

یارِ غمگسار مولوی عبدالرشید صاحب چشتی مرحوم کی رحلت کی خبر سن کر پہنچی۔ جگر پاش پاش ہے۔ ہائے آخری زیارت بھی نصیب نہ ہوئی ؎ وقتِ رخصت بندہ پرور یاد فرمایا نہ کیوں۔

عازمِ دیدار تھا یہ بندۂ احسان ترا

چشتی صاحب چل دیئے۔ دوستوں کے مخلص دوست۔ بھائیوں کے مہربان بھائی۔ والدین کے سعادت مند فرزند۔ بیوی کے قابل شوہر اور عزیزوں کے عزیز نہ رہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہماری قوم میں ایسے لوگ کثرت سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اور اگر ہوتے ہیں تو خدا جانے انہیں نظرِ بد کھا جاتی ہے ٭

ہیرا جس انگوٹھی میں ہوتا ہے اُس کو کھا جاتا ہے۔ اِسی طرح نیک رُوح جس بدن میں ہوتی ہے۔ اُس کو کھا جاتی ہے۔ اور یہی حالت ہمارے رشید مرحوم کی تھی ٭

آپ لاہور کے خاندانِ چشتیہ کے رُکنِ اعلیٰ مولوی حامد علی صاحب چشتی کے دُوسرے فرزند تھے۔ اور خاندان بھر میں بے نظیر گوہر اسمیں

شک نہیں کہ مخدومی مولوی حامد علی صاحب جیسے لائق بزرگ کی تربیت نے پیارے چشتی مرحوم کے اخلاق پر سونے پر سہاگہ کا کام دیا تھا۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اُن کی ذات میں ایک خداداد ملکہ تھا جو بنائے نہیں بنتا ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

مولوی حامد علی صاحب چشتی اپنے ذاتی تجربے سے فرماتے تھے کہ آپ کے شاگردوں میں شمس الدین شائق کو سبق دوسری دفعہ بہت کم اٹکتا۔ محرّم علی چشتی کو پہلی دفعہ ہی یاد ہو جاتا۔ مگر مولوی عبد الرشید مرحوم کا حافظہ بچپن میں ان سب بچوں سے ارفع اور اعلےٰ تھا۔ کسی اور بچے کو سبق ملا اور انہیں یاد ہو گیا۔ کوئی دس سال کی عمر میں مرحوم گھر کی سیڑھیوں سے گر گئے جس سے دماغ کو صدمہ پہنچا اور نسبتاً کمزور ہو گیا۔ مگر پھر بھی خدا نے وہ دل اور دماغ عطا کیا تھا۔ جس کی کوئی خواہش کر سکتا ہے۔

آپ کی وفات سے چند روز پہلے مجھے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ تو آپ نے چند شعر تصنیف کئے تھے۔ جن میں سے چار مجھے یاد ہیں جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

نازک ہے بہت دلوں کا رشتہ
جھنجلا کے اِسے نہ توڑ دینا

دیکھو کہیں دو لڑے ہوئے دل!
اُلفت سے تم اپنی جوڑ دینا

جس جام میں پاؤ دُردِ کلفت
اُس کو سرِ راہ پھوڑ دینا

دِل کو نہ بنانا گھر حسد کا۔
آجائے تو در سے موڑ دینا

ہائے قلم میں تاب نہیں کہ اور لکھے۔ سوائے اِسکے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس

میں جگہ دے اور قبلہ چشتی صاحب مرحوم کے بھائیوں۔ دوستوں اور عزیزوں کو صبرِ جمیل عطا فرما دے۔

راقمہ خاکسار عبدالعزیز مختارِ عدالت سرسہ

رسالۂ مخزن بابت ماہ فروری ۱۹۰۸ء جلد ۱۴ نمبر ۲

یادِ رشید

موت محبت کو فنا نہیں کر سکتی۔ عبدالرشید چشتی مرحوم کو مرے پانچ برس ہونے کو آئے۔ مرحوم کے حلقۂ احباب میں کئی اہلِ سخن تھے۔ سب اپنے اپنے انداز میں دلی رنج کا اظہار کر چکے ہیں۔ نیرنگ نے مرحوم کی قبر کو دیکھ کر نالۂ موزون کھینچا۔ صادق نے اِس صدمۂ جانکاہ پر اپنی فریادِ دل خراش بلند کی۔ اِس اچانک صدمہ نے اعجاز کو آج تک دم بخود رکھا۔ مگر دل کی بھڑاس کب تک رکی رہتی۔ جذباتِ دل زبان تک آئے بغیر نہ رہے۔ غم و اندوہ دبی آگ کی طرح۔ آہستہ آہستہ سلگتا رہا۔ آخر مندرجہ ذیل نظم میں ایک شعلۂ فغان بن کر بھڑک اٹھا۔ (نیرنگ)

نہ رہ جائے کوئی رنج و الم کی داستاں باقی
ابھی تو ہے دلِ پُر درد میں تابِ فغاں باقی

نفس کی آمد و شد مدّ و جزرِ دردِ فرقت ہے
یہ تن میں جان باقی ہے کہ یادِ رفتگان باقی

کسی کا کاروانِ زیست مدت کا عدم پہنچا
نگاہِ شوق میں اب تک ہے گردِ کارواں باقی

عدم کے جانیوالو ہم تو فرقت میں تڑپتے ہیں
بتاؤ تم کو بھی ہے اُلفتِ پسماندگاں باقی

رشید باوفا تم تو سراپا مہر و الفت تھے — دکھاؤ گے مگر دیرینہ الفت کا نشاں باقی

کہو کچھ اپنی اور میری سنو۔ یہ نامناسب ہے — حجابِ خامشی ہو دوستوں کے درمیاں باقی

تمہیں بن شبنم صفت تھا عشق اک خورشیدِ انور[1] کا — کہو محبوب سے اب تو نہیں فرقِ مکاں باقی

نوازش[2] ہائے ہمدم کو بہت تم یاد کرتے تھے — کہو اب تو نہیں ہیں ہجر کی بے تابیاں باقی

لو اب تو آملا تم سے تمہارا ہم جماعت[3] بھی۔ — رہے گی اب ولایت کی نہ کوئی داستاں باقی

ہوئے تھے چارہ گر عاجز وہ کیسی شدتِ تپ تھی — نہ چھوڑا جس نے تم میں ایک مشتِ استخواں باقی

گھلا ڈالا۔ جلا ڈالا جوان تم سا مٹا ڈالا — مٹا ڈالا نہ رکھا اتحادِ جسم و جاں باقی

یقیں ہے امن میں ہو اب عناصر کی کشاکش سے — نہیں امراض کی تکلیف کوئی میری جاں باقی

ذرا اعجاز سے پوچھو کہ اس پر کیا گذرتی ہے — نہ اسکا کوئی ہمدم ہے نہ کوئی ہمزباں باقی

وطن میں بے وطن ہے کچھ عجب بے یار و بیکس ہے — کوئی غمخوار باقی ہے نہ یارِ مہرباں باقی۔

متاعِ صبر و ہمت پہلی منزل میں لٹا بیٹھے — کرے طے راہِ ہستی۔ اتنی طاقت ہی کہاں باقی

تلاشِ کارواں میں یکہ و تنہا ہے سرگرداں — تسلی کو ہے اک داغِ فراقِ ہمرہاں باقی

تمہارے بعد اس مہجور کو کیا لطف جینے میں — بہارِ زیست آخر ہو گئی۔ اب ہی خزاں باقی

تمہارا خاص شیوہ دردمندی رہنمائی تھا — یہ جوہر روح کے ہیں تم میں ہونگے بیگماں باقی

عدم کا راستہ دیکھا ہوا ہے پہلے آئے ہو — پھر آجاؤ کہ ہے کہ نیکو کار یک جہاں باقی۔

تمہارے منتظر ہیں باپ ماں بھائی بہن سارے — تمہیں کب تک رہیگا شوقِ گلگشتِ جناں باقی

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو — تمہاری نیکیاں زندہ۔ تمہاری خوبیاں باقی

---

[1] سید خورشید انور بی۔ اے مرحوم۔ رشید مرحوم کے استاد تھے۔ جن سے مرحوم کو خاص انس تھا۔ اُن کی طرف اشارہ ہے +

[2] نوازش علی خان مرحوم رشید کے دوست تھے۔ مرحوم سے پہلے انتقال کر گئے تھے +

[3] مسٹر شنکر ناتھ ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء مرحوم کی طرف اشارہ ہے +

فصل ہشتم

ماحصل

زمانہ کی ریگِ روان پر راہروانِ عرصۂ ہستی کے نقشِ قدم غور پسند مُسافروں کے لئے سنگِ نشان کا کام دیتے ہیں۔ اِس دشت کا ذرہ ذرہ آفتابِ ہدایت بنکر چمکتا ہے۔ البتہ طبع غور پسند اور چشم بینا کی ضرورت ہے جس طرح کھوجی اور سُراغ رسان خفیف سے خفیف نشان سے اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ اور ایک نشان کو دُوسرے نشان سے تمیز کر سکتے ہیں۔ گو عوامُ النّاس کو کوئی وجۂ امتیاز محسوس نہ ہوتی ہو۔ اُسی طرح غور پسند طبیعتیں اور بصیرت نصیب آنکھیں سالکانِ منزلِ ہستی کے غیر مرعی نقوشِ پا زمانہ کی ریگِ روان پر شناخت کر سکتے ہیں۔ اُن کے انواع اور اقسام قائم کر سکتے ہیں۔ اور دریافت کر سکتے ہیں کہ کوئی مسافر کس طرف گیا ہے۔ کہاں پہونچا ہے۔ راہ میں کیا کیا کام کئے اور انجام کیا ہُوا۔ آؤ خلوصِ دل اور غور کی دُوربین سے ہم بھی اس میدانی ذخّار پر نظر ڈالیں اور شوقِ صادق کی رہنمائی سے طالبِ ہدائیت ہوں دیکھیں اس میدان کے سبق آموز نشان ہمکو کیا بتا سکتے ہیں۔

دیکھو! یہ مُتبرّک نقشِ قدم کن بزرگوں کے ہیں جنکے ہر پہلو سے

تقدّس اور نیکی کی شعاعیں دنیا کے ہر گوشہ کو منوّر کر رہی ہیں۔ جنکے
اور سچائی اور پرہیزگاری کے خوش نما پھول اپنی دائمی بہار دکھا رہے ہیں
اِن پھولوں کی مہک دل کو سکون اور طمانیت بخشتی ہے۔ خوش اعتقاد
لوگ اِن پھولوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ سر پر رکھتے ہیں آنکھوں سے لگاتے
ہیں اور دامن بھر بھر کر لئے جاتے ہیں۔ مگر پھولوں کے انبار باوجود
صدیوں کے گذر جانیکے۔ باوجود روزمرّہ کی دست بُرد کے ویسے ہی
شاداب اور تروتازہ ہرے بھرے نظر آتے ہیں۔ کسی طرح کم ہونیمیں
نہیں آتے۔ البتّہ مادی علوم کی گرم ہوا نے چند روز سے کچھ پژمردگی
کے آثار پیدا کر دئے ہیں۔ مگر عقیدتمندی کی تازگی بخش ہوا کے سامنے
سمومِ تحقیق کے پاؤں جمتے دکھائی نہیں دیتے۔ جس منزلِ مقصود پر یہ
بزرگ پہنچے ہیں اُس پر بھی ایک نظر ڈالنی ضرور ہے۔ نیک اعمال اور
نیک تربیت کے خوش نماء مضبوط پتّھروں کا نیک نیتّی کے چونہ گچہہ
کے ساتھ جو عالیشان قصر بنا ہؤا ہے۔ یہی تو اِن نامور بزرگوں کا ابدی
آرام گاہ ہے۔ جس کے ہر طرف مندر مسجدیں۔ گرجے اور کلیسا اپنے اپنے
بُلند میناروں اور کلسوں سے بنی نوعِ انسان کو صراطِ مُستقیم پر آنے
کے لئے اشارے کر رہے ہیں۔ اہلِ دانش سمجھہ گئے ہونگے کہ جن بزرگوں
کے یہ نقشِ پا ہیں۔ جنکے آرام گاہ یہہ قصر ہیں۔ جن کی یادگار یہ عبادت
خانے ہیں۔ وہ ہادیانِ دین اور بانیانِ مذہب کے سوا اور کون ہو سکتے
ہیں۔ مُبارک ہیں وُہ آنکھیں جنکو اِن مُتبرّک اور مُقدّس بزرگوں کے

نقشِ قدم کی زیارت نصیب ہو۔ مُبارک ہیں وُہ دل جنہیں اُنکی پیروی اور تقلید کی توفیق اور طاقت ہو۔ مُبارک ہیں وُہ دماغ جنکو اِن بزرگوں کے آفتابِ ہدایت کی روشنی مُنوّر کر رہی ہو +

ہاں یہ دوسرے قسم کے نقشِ پا کن لوگوں کے ہیں ؟ اِن کی عظمت اور ہیبت دوُر ہی سے دِل کو ڈرائے دیتی ہے۔ ہر نقشِ قدم سے خون کا فوّارہ جاری ہے۔ اِن کے دونوں طرف بیشمار لوگوں کا ہجوُم ہے۔ کہیں بیوائیں ہیں۔ جو اپنے خاوندوں کو رو رہی ہیں کہیں بُڑھیا مائیں ہیں جو جوان بیٹوں کا ماتم کر رہی ہیں۔ کہیں یتیم بچّے ہیں جو اپنے سرپرست کے رنج جُدائی سے بیتاب ہیں۔ یہ نقشِ قدم بھی ایک عالیشان بارگاہ تک پہُنچتے ہیں۔ مگر یہ عمارت انسان کے ہڈّیوں کی اینٹوں اور انسانی خُون کے گارے سے تعمیر ہوئی ہے۔ اِن کی بَدبُو دماغ کو پریشان کئے دیتی ہے۔ اور چیلوں گِدّوں اور کوّؤں کے جُھنڈ کے جُھنڈ اِس عالیشان سربفلک عمارت کے چوٹیوں پر بڑے شوق کیساتھ جمے بیٹھے ہیں۔ سونے اور چاندی کے انبار جابجا لگے ہیں۔ غلاموں اور لونڈیوں کی جماعتیں دست لبستہ کھڑی ہیں۔ مگر مظلوموں اور یتیموں کی آہ و زاری کے باعث اِس مکان کے مکین دم بھر بھی چین و آرام سے بسر نہیں کر سکتے۔

اہلِ بینش تاڑ گئے ہونگے کہ یہ نقشِ قدم اور یہ مکان اُن نامور جرنیلوں۔ سپہ سالاروں۔ فتح پسند بادشاہوں اور غریب کُش امیروں

کے ہیں۔ جنکو مال و دولت۔ حکومت اور مُلک گیری کی حرص نے اندہا کیا ہؤا تھا۔ جنھوں نے اپنی ذاتی اغراض اور ذاتی شوق پورا کرنے کے لئے بندگانِ خدا کا خون پانی کیطرح بہایا۔ جنھوں نے ناموری حاصل کرنیمیں درست اور نادرست۔ جائز اور ناجائز۔ حق اور ناحق۔ نیک و بد کا امتیاز بالائے طاق رکھدیا۔ یہ لوگ حکومت و مال کے غرور اور خود غرضی کے نشہ میں ایسے چوُر ہوئے۔ کہ اپنے عیش و آرام اور اپنے چند روزہ نام کے لئے تمام دُنیا کے عیش و آرام اور مخلوقِ خدا کے نام و نشان مٹا دینے میں ذرا بھی مضائقہ نہ کیا۔ اِس خوفناک منظر پہ ہم نفرت کے ساتھ پردہ ڈالے دیتے ہیں۔ گو تاریخ عالم کے اوراق ایسے ناخدا ترس اور بے رحم لوگوں کو ہمیشہ بنی نوعِ انسان کی لعنت کا نشانہ بنائے رہینگے۔ ایسی عظمت اور شہرت کو حقارت کے ساتھ پاؤں کے تلے روندنا چاہیئے۔ ایسی ناموری سے گمنامی۔ ایسی ناجائز امیری سے دیانتداری کی غریبی۔ ایسی ظالمانہ مُلک گیری سے بیکسی کی گوشہ نشینی ہزار درجہ بہتر اور افضل ہے۔

ہاں کچھ نقشِ قدم اور بھی دکھائی دیتے ہیں جو اپنی خصوصیت کے لحاظ سے دِل کو اپنی طرف کھینچے لیتے ہیں۔ آؤ اِن کا بھی پتہ نکالیں۔ اِن کے قریب دورویہ نوشت و خواند۔ تصنیف و تالیف کے نشانات ہُویدا ہیں۔ کہیں کتابوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ کہیں چند چھوٹی چھوٹی کتابیں رکھی ہیں۔ کہیں چند اوراقِ پر نشان ہی

دکھائی دیتے ہیں۔ ٹوٹی قلمیں شکستہ دواتیں بہت سی پڑی ہوئی ہیں
جابجا روشنائی کے دھبّے اپنی روشنی دکھا رہے ہیں۔ یہ اہلِ قلم اہلِ علم
اہلِ حکمت اور اہلِ تحقیق کے نقشِ پا ہیں۔ یہ وُہ نیک روحیں ہیں جنہوں
نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے نیک کام میں صرف کی ہے جنہوں
نے خدمتِ خلق کو اپنا فرض سمجھا جنہوں نے خود تکلیف گوارا کر کے دُوسروں
کے آرام و خوشی کا سامان فراہم کیا۔ یہ وُہ لوگ ہیں جنہوں نے لختِ دل
کھایا اور خونِ جگر پیا۔ تاکہ اپنے ہم جنسوں کے لئے روحانی اور دماغی غذا
کا خوانِ یغما تیار کر سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے لگاتار کوشش
کر کے بنی نوعِ انسان کی ترقی میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ وہ لوگ
ہیں جنہوں نے اپنے ہمجنسوں کی آسائش اور بہبودی کے لئے اپنی آسائش
اور ذاتی بہبودی کو قربان کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی فردی
زندگی کو قومی زندگی کے لئے نیست و نابود کر کے جان نثاری کا ثبوت
دیا اور سچی شہادت کا درجہ حاصل کیا۔ اُن لوگوں میں سے اکثروں نے
خود عسرت اور تنگ دستی میں اوقات بسر کی۔ مگر ہزارہا امیروں کے
نام محض اُن کی بدولت آج تک یادگار ہیں۔ اِن نیک بندوں کیوجہ
سے انسانی دل و دماغ کی روشنی روز افزوں ہے۔ اِنسان کی جسمانی
بیماریوں۔ اخلاقی کمزوریوں اور تمدّنی خرابیوں کا علاج اُن ہی نیک
مردوں کے ہاتھ سے ہُوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اُن کے ہر قدم سے فیض
اور برکت کے چشمے جاری ہیں۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو اُن چشموں سے

سیراب ہوتے ہیں۔ اور اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

اِسی مُعزّز اور مُفتخر سِلسلے میں اِک نوجوان کے نقش کس مپرسی کی حالت میں ایک گوشہ کیجانب خفیف خفیف سے دکھائی دیتے ہیں صرف چند اوراقِ پریشان جن پر کچھ اُردُو مضامین۔ چند خطوط اور چند ترجمے تحریر ہیں آس پاس پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے اِس جوانمرگ لکھنے والے کو اِسقدر فرصت نہ دی کہ کوئی معقول ذخیرہ تصنیف و تالیف کا اپنی یادگار چھوڑتا۔ اور وہ شُہرت ناموری اور قبولِ عام حاصل کرتا جسکے آثار قریب قریب کے دیگر رہ نوردوں کے نقشِ قدم سے ہویدا ہیں۔ یہ چند اوراقِ پریشان جو اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ مشاہیر اہلِ قلم کے زُمرہ میں شامل کرنے کے لئے کافی نہیں البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چلنے والا ٹھیک راستہ پر جا رہا تھا اور اگر عُمر وفا کرتی تو شہرت اور ناموری بھی ضرور حاصل کرتا۔ اِن اوراق کو پڑھکر اِس تذکرہ کے مُطالعہ کرنیوالوں پر مُنکشف ہو جاویگا۔ کہ یہ نوجوان جسکے خفیف سے نقشِ قدم اُن کے زیرِ نظر ہیں۔ عبدُ الرّشید مرحُوم ہی ہے۔ دیکھنا یہہ ہے کہ انجامِ کار یہ نقشِ قدم کہاں پہنچے۔ وہ عالیشان محل جس میں جابجا رنگا رنگ مضامین کے گرانقدر جواہرات اور موتیوں سے میناکاری کی گئی ہے۔ اِس مسلک کے سالکوں کی دائمی قیام گاہ ہے عبدُالرّشید مرحوم بھی اُسی محل کے مکیں ہیں۔ شہرت اور ناموری کے ظاہری قیود کو اُس محل کے آئین میں دخل نہیں رہا۔

یہاں اجر بلحاظِ نیّت ملتا ہے۔ اُس محل کے مکین خود غرضی سے مُبرّا ہیں۔
جو ہم پیشہ و ہم مسلک یہاں پہنچتا ہے۔ بلا لحاظ اِس امر کے کہ نمود پرست
اہلِ دُنیا کی نظر میں اُس نے کس درجہ ناموری حاصل کی ہے اور کیا کام کیا ہے۔
محض اُس کی نیت کا اندازہ کر کے اور یارِ طریقت سمجھ کر اُس محل میں حصّۂ
برادرانہ کا مُستحق سمجھا جاتا ہے۔ ادنےٰ اور اعلےٰ کا امتیاز اُس محل کے
رسم و آئین کے خلاف ہے۔ ہر مکین کا کمرہ جُدا جُدا ہے۔ سامانِ آسائش
سب میں برابر ہے۔ اگر فرق ہے۔ تو صرف اِسقدر کہ اہلِ دُنیا کے تحسین و
مرحبا کے نعرے ہر ایک مکین کے کمرے میں الگ الگ گونج رہے ہیں کسی
کمرہ میں یہ گونج زیادہ ہے کسی میں کم۔ عبدُالرّشید مرحوم کے کمرہ میں
نسبتاً خاموشی ہے۔ سوائے چند دوستوں کی تحسین و آفرین کی آوازوں یا
والدین کے دعاؤں کی دل خوش کُن صداؤں کے اور آوازیں اُس کمرہ کی
سکون بخش خاموشی میں سُنائی نہیں دیتیں۔

ایک ایسے شخص کی زندگی کو جسنے واقعی طور پر ماں باپ کی دعائیں۔ اور
احباب کی تحسین و آفرین حاصل کی ہو۔ ناکامیاب زندگی ہرگز نہیں کہہ
سکتے۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کر کے انکی
دُعائیں حاصل کریں۔ مُبارک ہیں وہ لوگ جو محبّت ہمدردی خوش اطواری
اور خوش اخلاقی کیوجہ سے اپنے احباب کی نیک رائے حاصل کریں مُبارک
ہیں وہ لوگ جو اپنے دل و دماغ اپنے وقت اور قُوّت کو تصنیف و تالیف
کے نیک مشغلہ میں صرف کر کے خدمتِ قوم و خلقِ خدا بجا لائیں۔ ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیان

اگر دردِ دل سے کام لینا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ تو اِس مقصد میں عبدُالرشید کو پُوری کامیابی حاصل ہوئی اور ہر ایک انسان کو اگر وہ صدقِ دل سے کوشش کرے اور اِس اعلےٰ مقصد کو سمجھے تو اُس کے لئے کامیابی دُشوار نہیں۔ مگر کتنے شخص ہیں جو اِس مقصد کو سمجھتے ہیں۔ اور اِس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صدقِ دل سے کوشش کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اخلاقی ذمّہ داری کا خیال آج کل بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ بہت لوگ جو ظاہرا بہت کچھ کامیابی اور ناموری حاصل کر لیتے ہیں۔ جن کی شہرت کا ڈنکا بہت زور شور سے چار دانگِ عالم میں بجتا ہے۔ در اصل اخلاقی خوبیوں سے مُعرّا ہوتے ہیں۔ محض طرّاری۔ ریاکاری اور وقت کی غلامی کر کے دکھاوے کی ہمدردیِ قوم اور خیر خواہیِ ملک ظاہر کر کے اعلےٰ مراتب اور شہرت عوامُ النّاس میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اِس بے معنی اور بیہودہ کامیابی کا اثر قوم اور مُلک کی اخلاقی زندگی پر نہائیت خراب ہوتا ہے۔ قوم اور اہلِ مُلک کے اخلاق روز بروز گرتے جاتے ہیں۔ اور اخلاقی مضبوطی کو لوگ بیکار اور فضول سمجھنے لگتے ہیں۔ بلکہ بخیالِ خود یہ سمجھکر کہ اخلاقی مضبوطی کامیابی میں ہارج ہوتی ہے اِس کو ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے طریقِ عمل سے خارج اور نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کی ترقی کی بُنیاد نیک اخلاقی کی مضبوط چٹان پر نہ ہو وہ بُہت جلد تباہ اور برباد ہو جائیگی

پس اِس خطرہ سے مُلک کو بچانا ہر ایک اہلِ عقل کا پہلا فرض ہونا چاہیئے
پبلک کی نگاہِ غلط انداز اور نامعقول طرزِ قدردانی اِس تباہ کُن غلطی
کی بُہت کچھ ذمہ وار ہے۔ اگر پبلک ذرا بھی عقل اور امتیاز سے کام لے۔
اور صرف اُنہی لوگوں کی قدر و عزت کرے جو دراصل اُسکے مستحق ہیں اگر
پبلک محض تیز طبع ہونے کی وجہ سے کسی شخص پر دالہ و شیدانہ ہوجائے
اگر پبلک ریاکار مدعیانِ حُبُّ الوطن کے فریب میں نہ آجائے۔ اگر پبلک
اعلےٰ درجہ کے اخلاقی اُصول کی نگہداشت کرنا اور اُن اُصول کی فروگذاشت
کی سخت حقارت کرنا اپنا فرض سمجھ لے تو پھر اِس خرابی کا بُہت کچھ انسداد
ہوجائے۔ جبتک ہم مُلمع اور اصل سونے میں تمیز کرنا نہ سیکھیں گے سونے
کی بجائے مُلمع ہمکو دیا جائیگا۔ نیک اخلاق اور نیک خصائل ہمکو قدردانی
کے لیئے معیار مقرر کرنے چاہئیں۔

جس شخص نے قبولِ عام کا تاج نیکی کے اُصولوں کو نظرانداز کر کے
حاصل کیا ہے وہ دراصل غاصب اور دشمنِ نوعِ انسان ہے جسقدر
جلد یہ جھوٹا تاج اُس کے سر پر سے اُتار کر پاؤں میں روندا جائے بہتر ہے۔
کاش پبلک کو سچی قدردانی کرنیکا اور مُلمع اور سونے میں تمیز کرنیکا سلیقہ
آجائے۔

پبلک لائف میں فریب اور ریاکاری کی شکائیت کچھ ہندوستان ہی
ہی نہیں ہے۔ یہ شکائیت عالمگیر ہے۔ امریکہ کے پریسیڈنٹ روزویلٹ
اِس شکائیت کی نسبت لکھتے ہیں۔

آج کل جو زمانہ کا یہ میلان ہو رہا ہے۔ کہ محض تیز طبعی کو گو وہ اخلاقی ذمہ واری کے خیال سے مُعرّا ہی کیوں نہ ہو بے انتہا قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نہائیت درجہ مُضر اور نامناسب ہے ہم اپنے ملک کو کبھی حسب دلخواہ نہیں بنا سکتے۔ تاوقتیکہ بحیثیتِ قوم ہم اِس اُصُول کو پُوری طرح نہ سمجھ لیں اور اِس پر عمل نہ کریں۔ کہ وہ کامیابی جو اُصُولِ اخلاق کو قُربان کر کے حاصل کیجائے نہائیت قابلِ نفرت ہے۔

وُہ کامیاب شخص جس نے تجارت یا سیاست میں کامیابی حاصل کرنے میں اپنے ہمسائیوں سے دغا کی ہے۔ یا فریب یا مکّاری یا بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ وہ ایک خوفناک جنگلی خونخوار جانور سے بدتر ہے۔ وُہ کمینہ اور خوشامدانہ تعریف اور مدح سرائی جو ایسے شخص کی زندگی کی نسبت بے سمجھ یا کج فہم لوگوں میں کیجاتی ہے۔ اِس قسم کی کامیابی کو ایک ایسا اثر بنا دیتی ہے۔ جس سے ہماری قومی زندگی نہائت درجہ معرضِ خطر میں ہے۔ ہمارا پبلک اور پرائیویٹ طرزِ عمل اور رویّہ کا معیار کبھی اُونچا نہ ہو سکے گا۔ تاوقتیکہ ہم اُس شخص کو جو اخلاقی اُصُول نظرانداز کر کے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ یہ نہ جتا دیں کہ پبلک کی رائے میں وہ ایک ایسے بدمعاش بدخصلت شخص سے بھی بدتر ہے کہ جسکو کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں نیک نہاد نیک خصلت نوجوان

دکھائی دیں تو ہمکو چاہیئے کہ ایسے نوجوانوں کی جیسا کہ عبدالرشید مرحوم تھا۔ قدر افزائی کریں۔ تاکہ دیگر نوجوانوں کو حسنِ اخلاق پیدا کرنیکی ترغیب و تحریص ہو۔ عبدالرشید مرحوم تو اَب وہاں پہنچ گئے جہاں شائد ہماری قدردانی کی اُنہیں پرواہ باقی نہیں۔ مگر اُن کی قدر کرنا۔ نیک دلی۔ صدق۔ دردمندی اور خلوصِ نیّت کی قدر کرنا ہے گویا اُن تمام اخلاقی خوبیوں کی قدر کرنا ہے جن سے وُہ مُتّصف تھے۔ اور اُن خوبیوں کی قدر کرنا اُن کے اکتساب اور اشاعت کے لئے ایک پُر زور تحریک کرنا ہے۔ خدا کے نیک بندے جس طرح زندگی میں باعثِ برکت ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعدِ مُردن بھی اُنکا نامِ نیک ضرور فیض پُہنچاتا ہے۔ اِس تذکرے کے پڑھنے والوں میں سے اگر ایک مُتنفّس کے دِل میں بھی نیکی کی محبّت پیدا ہو جائے یا زیادہ راسخ ہو جائے تو میں سمجھُونگا۔ کہ اِس تذکرہ کی تالیف کا مقصد پُورا ہو گیا۔

یہ مختصر سا تذکرہ اب ختم ہوتا ہے۔ دِنوں کا کام برسوں میں ہُوا۔ مگر ہو گیا۔ محبّت کیش دوست کا آخری کام تھا۔ اِس پیارے کام کے تمام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ غنیمت تھا کہ اِس کام کی وجہ سے یادِ دوست دِل میں تازہ رہتی تھی۔ دوست کا کام دوست کی بجائے تسلّی دیتا تھا۔ اب کام چھُوٹتا ہے۔ گویا دوست چھُوٹتا ہے +

رنجِ جدائی اِس وقت ازسرِ نو تازہ ہو گیا۔ دِل بھر آتا ہے کیونکر سمجھاؤں۔ جوششِ طوفان کو کس طرح روکوں! اچھا مرحوم کے لئے

دُعائے مغفرت ہی مانگ لو۔ ناظرینِ تذکرہ کو بھی اللہ حافظ کہکر رُخصت کرو۔ اور چلتے وقت یہ مشہور قطعہ بھی گوش گذار کردو ؎

ے
نامِ نیکِ رفتگان ضائع مکُن
تا بماند نامِ نیکت برقرار
نامِ نیکو گر بماند ز آدمی
بہ کہ زو ماند سرائے زرنگار



تمام شد



ضمیمہ نمبر (۱)

حامد علی چشتی نے جو سند صاحب پنجاب اینڈ دہلی ریلوے میں ایکاؤنٹنٹ ہیں مجھسے
درخواست کی ہے۔ کہ جو کچھ مجھے اُن کے تایا نور احمد چشتی مرحوم کی نسبت علم ہے
اُنہیں چند سطور لکھ کر دوں۔

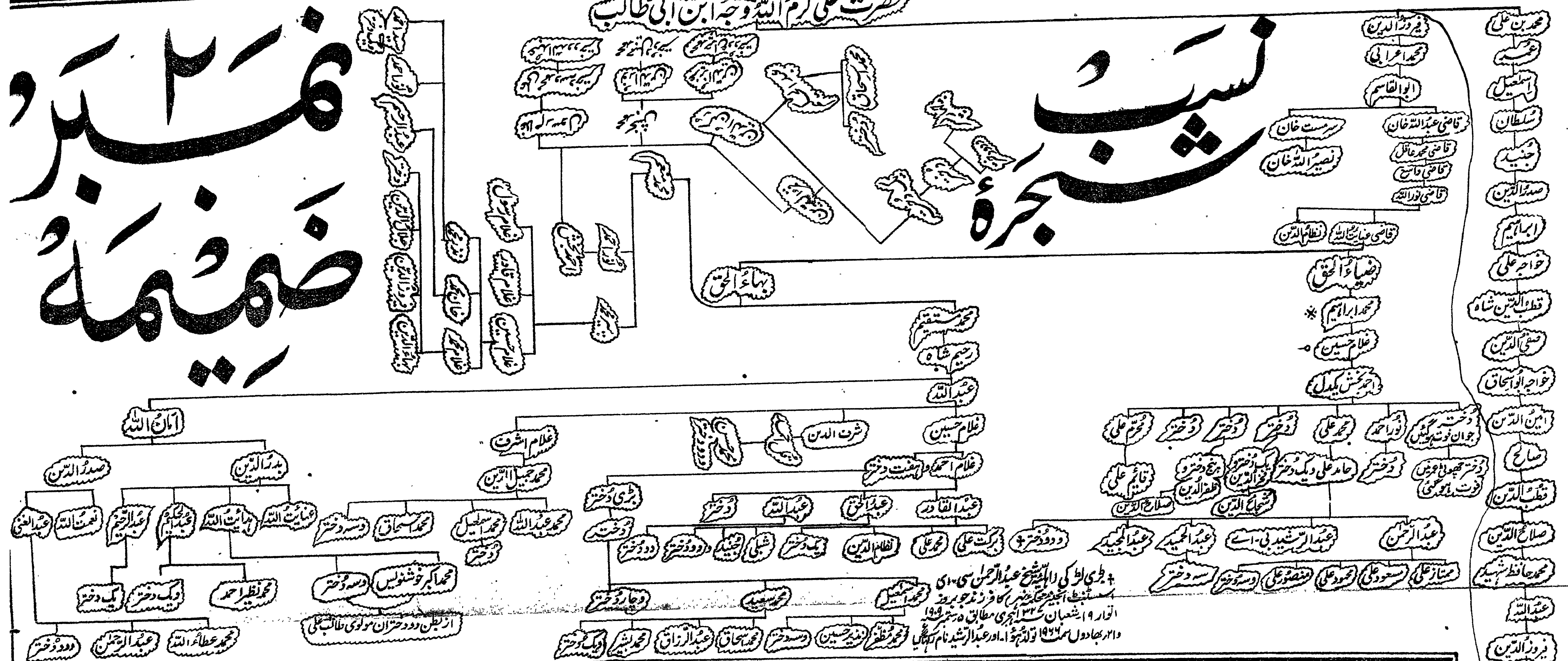
مَیں جب اوّل پنجاب میں ۱۸۶۲ء میں آیا تو نور احمد چشتی سے فارسی اور اردو
پڑھتا رہا اور پھر ۱۸۶۴-۶۵ میں جبکہ میں وہاں اسسٹنٹ کمشنری پر تعینات
ہُوا۔ نور احمد چشتی اُن دنوں لاہور میں۔ اگر صرف وُہی ہی نہیں۔ تو اوّل منشی
یا دیسی زبانوں کے اتالیق تھے۔

اُنہوں نے ایک کتاب موسوم بہ یادگارِ چشتی مسلمانانِ پنجاب کے اطوار و رسومات کی
نسبت تالیف کی تھی۔ یہ کتاب پنجاب کے نوجوان افسروں کے پڑھنے کیلئے مفید ہے۔
مسٹر سی۔ یو ایچیسن نے[1] (جو میرے خیال میں خود بھی نور احمد چشتی کے شاگرد تھے) کلکتہ ریویو[2]
میں اُسپر ریویو لکھا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں جبکہ میں اُنسے پڑھتا تھا اُنہوں نے لاہور اور اُس کے
مضافات کے قدیم عمارات کے حالات پر کتاب لکھنے کے لئے (کچھ میرے خرچ سے بھی) سامان جمع
کیا تھا۔ اور یہ کتاب بعد ازاں تحقیقاتِ چشتی کے نام سے طبع ہوئی۔ یہ نہایت قابل قدر تجسس
سے لکھی گئی تھی۔ اور اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو بڑی تقطیع کے[3] ۵۰۰ یا ۶۰۰ صفحوں پر شائع
ہوئی تھی۔ جب[4] کبھی لاہور کے قدیم عمارات کی تفصیل لکھی جائے تو اس کتاب سے بیش قیمت امداد ملیگی۔
نور احمد چشتی کا ۱۸۶۶ یا ۱۸۶۷ء میں جبکہ ابھی جوان تھے انتقال ہوگیا۔ اُنکے والد جنکا نام مجھے
فراموش ہوگیا ہے فضیلت علمی کیلئے نہایت مشہور تھے۔ اور میرے خیال میں اُنکا خاندان
بلحاظِ تفضّل با امتیاز تھا۔

ڈبلیو کولڈ سٹریم۔ (ڈپٹی کمشنر) ہوشیارپور
۱۵ اپریل ۱۸۷۸ء

---

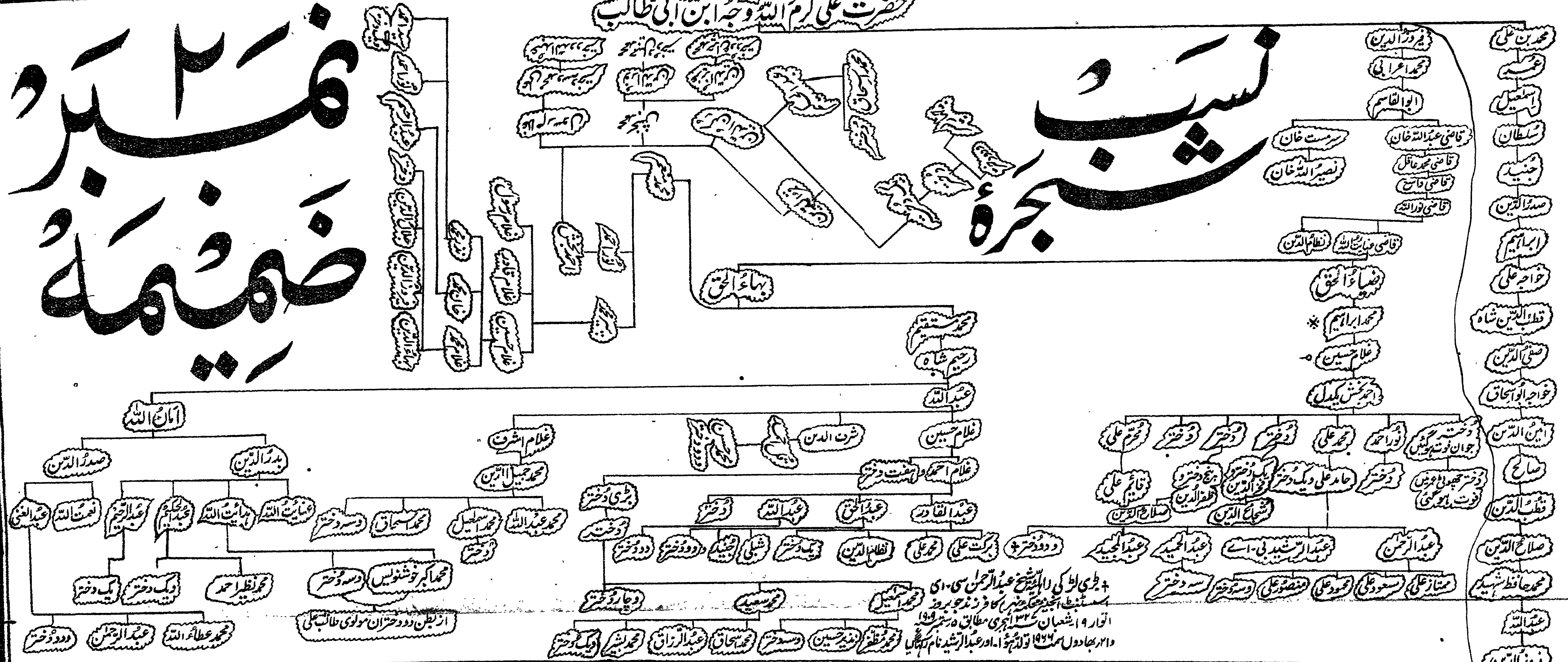
[1] بعد ازاں سر چارلس ایچیسن۔ ولفٹننٹ گورنر پنجاب۔
[2] کلکتہ ریویو جلد ۳۳ بابت ششماہی از جولائی تا دسمبر ۱۸۵۹ء صفحات ۲۸۶ تا ۳۰۵۔
[3] ۸۷۲ صفحوں پر مطبع کوہ نور لاہور میں ۱۸۶۷ء میں چھپی تھی۔
[4] چند سال ہوئے ہیں۔ سید عبداللطیف صاحب مرحوم ڈویژنل جج نے ایک ایسی کتاب انگریزی میں شائع
کی تھی جسکے دیباچہ میں اُنہوں نے اس امداد کا اعتراف کیا ہے جو اُنہیں تحقیقاتِ چشتی سے ملی۔



لوٹ - ✱ - مولوی محمد ابراہیم صاحب کا ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا - اُن کی خانقاہ بیرون مسجد اندرون یکی دروازہ لاہور روبروئے سابق مطبع کوہ نور ہے - تحقیقات چشتی میں جناب مغفور کا سال رحلت ۱۱۹۵ھ ہجری لکھا ہے - مگر وہ غلط ہے ✦

ہ - حضرت موصوف کا ۱۰ صفر ۱۲۶۰ ہجری مطابق ۲۰ پھاگن سمت ۱۹۰۰ و ۲۹ فروری ۱۸۴۴ء کو انتقال ہوا - اور مسجد چینی کلاں متصل تکیہ سادھواں لاہور میں مدفون ہوئے - اُن کے مزار کی چار دیواری وغیرہ پر بہت سے قطعات و تاریخات کندہ تھے - جنہیں حسب ذیل شعر تھے :- روضۂ مولوی غلام حسین - عاشقِ حضرت امام حسین ✦ گل بستانِ شیخ پاکپٹن - مخزن از فخر دین و نام حسین ✦ دیکھو تحقیقات چشتی صفحہ ۵۷ - نیز اے بلبل نسیم تو براین گل مزار - آہستہ نہ قدم کہ بخواب است مولوی ✦ این گل زبوستانِ شکر گنج رستہ است - از آب رحمت است بہ سیرابی ونوی ✦ ان اشعار میں جناب خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے اولاد روحانی ہونیکی طرف اشارہ ہے - دیکھو تحقیقات چشتی صفحہ ۱۷ ✦

ہ - جناب مولوی طالب علی صاحب کا انتقال ہوئے قریباً پچیس سال ہوتے ہیں - وہ لاٹ صاحب بہادر پنجاب کے محافظ دفتر تھے - بعد ازاں پنشن یاب ہو کر ریاست پٹیالہ میں معتمد از طرف پنجاب گورنمنٹ مقرر ہوئے - اور وہیں آپ نے وفات پائی - مہاراجہ صاحب کے حکم سے اُن کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے اُٹھایا گیا - اور نعش مقدس کو ہاتھی پر سوار کر کے سرہند میں لا کر متصل روضۂ حضرت مجدد الف ثانی دفن کیا - آپ بڑے صاحب کمال اور قابل بزرگ تھے ✦



نوٹ۔ *۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب کا ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا۔ اُن کی خانقاہ بیرون مسجد اندرون یکی دروازہ لاہور روبروئے سابق مطبع کوہ نور ہے۔ تحقیقات چشتی میں جناب مغفور کا سال رحلت ۱۱۹۵ ہجری لکھا ہے۔ مگر وہ غلط ہے *

٥۔ حضرت موصوف کا ۱۰ صفر ۱۲۶۰ ہجری مطابق ۲ پھاگن سمت ۱۹۰۰ و ۲۹ فروری ۱۸۴۴ء کو انتقال ہوا۔ اور مسجد چینی کلاں متصل تکیہ سادھواں لاہور میں مدفون ہوئے۔ اُن کے مزار کی چار دیواری وغیرہ پر بہت سے قطعات و تاریخات کندہ تھے۔ جنمیں حسب ذیل شعر تھے:۔ روضۂ مولوی غلام حسین۔ عاشق حضرت امام حسین * گل بستان شیخ پاک پٹن۔ فخرش از فخر دین و نام حسین * دیکھو تحقیقات چشتی صفحہ ۵۷۔ نیز اتنے بلبل نسیم تو بریں گل مزار۔ آہستہ نہ قدم کہ بخواب است مولوی * ابن گل زبوستان شکر گنج رستہ است۔ از آب رحمت است بہ سیرابی وقوی * ان اشعار میں جناب خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے اولاد روحانی ہونیکی طرف اشارہ ہے۔ دیکھو تحقیقات چشتی صفحہ ۱۷ *

•۔ جناب مولوی طالب علی صاحب کا انتقال ہوئے قریباً پچیس سال ہوتے ہیں۔ وہ لاٹ صاحب بہادر پنجاب کے محافظ دفتر تھے۔ بعد ازاں پنشن یاب ہو کر ریاست پٹیالہ میں معتمد از طرف پنجاب گورنمنٹ مقرر ہوئے۔ اور وہیں آپ نے وفات پائی۔ مہاراجہ صاحب کے حکم سے اُن کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے اُٹھایا گیا۔ اور نعش مقدس کو ہاتھی پر سوار کر کے سرہند میں لا کر متصل روضہ حضرت مجدد الف ثانی دفن کیا۔ آپ بڑے صاحب کمال اور قابل بزرگ تھے *

تصحیحات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۱۰	انسان کی	انسان سے
۲۱	۶	جنوری سنہ ۱۹ء	جنوری سنہ ۱۸
۲۴	۱۰	مشکّل	مُشکِل
۲۷	۱۹	جو وہ	
۳۸	۳	نومبر سنہ ۱۹۰۳ء	نومبر سنہ ۱۹۰۲ء
۴۰	۱۰	حوالۂ بخدا	حوالہ بخدا
۴۹	۱۳	والدہ سے اسکا	والدہ سے اُس کا
۵۳	۱۹	اوراق کا غذ اور	اوراقِ کاغذ اور
۶۲	—	انتخاب از خطوطِ اردو نوشتۂ مرحوم	انتخاب از خطوط اُردو۔ مضامین نثر اُردو۔ اردو نثر میں ترجمے اور اُردو نظم کے بعد طبع ہوئے ہیں۔
۶۳	۱۰	۹۔ گالیان (مخزن ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء)	۹۔ گالیاں (مخزن نومبر سنہ ۱۹۰۱ء)
"	۱۱	۱۰۔ سرسیّد کی برسی (چودھویں صدی راولپنڈی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۰۳ء	۱۰۔ سرسیّد کی برسی۔ (چودہویں صدی راولپنڈی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء
۶۴	۱	اصُول حکمت (مخزن مارچ سنہ ۱۹۰۳ء)	اُصُول حکمت (مخزن مارچ سنہ ۱۹۰۲ء)
۶۸	۱۸	پریشان حالے	پریشان حالی
۷۶	۱۷	جہگڑے چُکاتا	جھگڑے چُکاتا ہے
۸۳	۱۳	رعا کی آزادی	رعایا کی آزادی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۴	۱۵	اس مُلک کی پیدا ودرا	اس مُلک کی پیداوار
۸۵	۱۷	لگا تاڑ	لگاتار
۱۲۶	۱۰	تعظیم و پرسش	تعظیم و پرستش
۱۳۸	۶	مُلامت	ملامت
۱۶۶	۹	بالخصوص	بالخصوص
۱۶۸	۵	سرق	سرو
۱۹۹	۸	ہرچا پہنچے	جا پہنچے
۱۸۶	۶	شہیں	وہیں
۱۹۲	۳	مرغ	[illegible]
۲۰۲	۴	ناشپاتی	ناشپاتی
۲۰۰	۱۹	چھپنچے	چھپ بچے
۲۲۱	۱۷	دوائی بھی دی ہوگی	دوائی بھی لادی ہوگی
۲۲۴	۵	جھُبن	چبھن
۲۲۸	۱	فصل ہفتم	فصل ہشتم
۲۴۵	۱۷	مُضامین	مضامین
۲۵۲	۱۴	مضمون پورا ہونا تھا	مضمون پورا ہونا تھا
۲۶۱	۹	لگاتاڑ	لگاتار
۲۶۹	بعد	تیرنگ	نیرنگ
۲۷۰	۳	پلاء	پلا
۲۷۴	۲	دیکھ آسے دلسوز	دیکھاسے دلسوز
۲۸۲	۱	فصل ہشتم	فصل نہم
۲۸۴	۱۰	عمارت انسان کے	عمارت انسان کی
۲۸۵	۱۹	اَوراقِ پریشان	اَوراقِ پریشان
۲۸۷	۱۸	شُہرت	شہرت
۲۹۲	۴	پروان	پرزِوا